

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

دل کے دواؤں کے لیے

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پتی کہانیاں

December

2016

ایک سو سال کی
ڈاٹ کام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

”مسئلہ یہ ہے قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ ”زربو مری“ اور کاشی چوبان کا ناول ”زہر عشق“

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پنج گہائیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانہی سہام مرزا



میجر مارکیٹنگ

021-35893121

میجر سرولیشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام

مدیرہ کاشی چوہان / دانیال ششی

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

MEMBER
APNS
CPNE

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: 880 فرسٹ فلور خیابان جامی کراچی
ڈیفنس فیزم 71-11 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 - شمارہ: 12 - دسمبر 2016ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے پچھوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں مابنامہ ووشیزہ اور پنج گہائیاں میسر ڈسٹ ہوئے ہیں۔ ہر پرچہ کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوز چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ برصورت دیگر ادارہ ذیلی ادارہ سے کسی بھی طرح کا حق رکھتا ہے۔

گاؤں والا مندر

142

ہزفت حبس صیاء

رشتوں کو روندنے والے اُس چاچا کا قصہ جس نے اپنے بھتیجے پر کالام کر دیا تھا

خواب کے زخم

147

مذاق حسس ساجد

اُس ڈاکٹر کی دہشت ناک پتا جو ایک جن جوڑے کے ہتھے چڑھ گیا اور.....

ماہر

152

سید وجاہت علی

اُس نوجوان نے جن کے بچوں کو جوڑو کرانے کھیلتے دیکھا اور پھر.....

زہر بھر انتقام

157

سند خوا

اولاد انسان کی ہو یا جانور کی پیاری سب کو ہوتی ہے مگر اتفاقاً ہونے والے حادثے نے.....

ناگن

163

صائمہ عروج

کیا آپ ناک ناگن کی کہانیوں پر اعتبار کرتے ہیں اگر نہیں تو.....

پیاس ادھوری ہے

166

سعدیہ سیٹھی

اُس ناگن کی داستان جو چاہ کر بھی اپنا انتقام نہ لے سکی مگر.....

بھارت میں بلیک سٹ

170

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے سفر نامہ بھارت

غیبی امداد

184

شاہدہ داکر

اگر اُس رات وہ مہربان تھی میری مدد نہ کرتیں تو.....

یلا میرا محسن

187

کنزہ

بچن کی ایک نئی پراسرار طور پر اُس دوشیزہ کو بہت بڑے نقصان سے بچانے

جنوں والا مکان

190

عطیہ بولسٹانی

اُس گھر میں جو بھی کرایہ دار آتا جلد ہی اُس کا اپنا مکان ہو جاتا تھا

اکتالیسویں رات

192

حواد احمد

اُس شخص کی کہانی جس نے جن کو کاٹ لیا تھا مگر عمل کی آخری رات.....

زہر عشق

194

کاشی جوشاں

خوف اور رگوں میں لہو جمانے والے مناظر سے بھرپور سلسلہ

مسئلہ یہ ہے

210

ادارہ

آپ کا مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

ہائیڈ پارک

220

ذی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

تیر نیم کش

224

قارئین

قارئین کی سخن منہی کو آرماتا ایک دلچسپ سلسلہ

لکڑی کی ملکہ

226

جاوید راہی

فراعہ کی سرزمین سے اُس گم شدہ ملکہ کی داستان جسے حاسدین نے لکڑی کا جادو یا تھا

درگاہ کا مجذوب

249

احمد سجاد بابر

پراسرار کہیں ایک بہت اچھولی یادگار داستان جو یقیناً آپ بھلا نہ پائیں گے

متفرقات

000

چنیدہ، چنیدہ معلوماتی اقتباسات قارئین کے ذوق مطالعہ کے لئے

دُنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ ”سچی کہانیاں“ کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ”سچی کہانیاں“ کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انہیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ ”سچی کہانیاں“ میں آپ بتائیں جگہ بتائیں اعترافات جرم و منرا کی کہانیاں، ناقابل یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دُنیا کے درمیان دلچسپ نرک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ سچی کہانیاں میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرنٹ پبلی کیشنز: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublicatlons@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



فیصلہ بدل دے

نام: ہزیمہ ناصر Huzaima Naseer

عمر: 26 سال 26th Years

رہائشی: ڈاسکا Daska

عمر کا وہ حصہ جب ہر جانب رنگ و نور اور قہقہے بکھرے ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی چمک چوہوں کے چاند سے بھی زیادہ روشن اور لبوں پر کھینچی مسکراہٹ ساری دنیا کے خزانوں سے بھی زیادہ انمول ہوتی ہے۔ عمر کا وہ دور جب باپ جوان، خوب رویے کو فخر سے دیکھتا ہے اور ماں نظریں چرا کر کہہ سکتی ہیں اس کی نظر نہ لگ جائے۔ بہنوں سے لاڈ اٹھوانا اور بھائیوں پر دھونس جمانا زندگی کا حسین ترین دور..... جب کانوں میں "گھوڑی چڑھیا" میرا گھوڑی چڑھیا کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اسباب جو بھی رہے ہوں مگر وہ معصوم اپنی جنت سے دور دور بھٹکتا رہا۔ انسانی اسمگلروں کے ہتھے چڑھایا یہ نوجوان غیر قانونی طور پر بارڈر پار کرنے کے جرم میں ایرانی بارڈر سکیورٹی فورسز کی گولیوں کا نشانہ بنا مگر پھر بھی زندہ نہیں سفر کرتا رہا زخم سرتا رہا..... خون رستا رہا..... تڑپ کر مان کو پکارتا رہا اور یہاں ماں تڑپتی رہی، انجان رہی..... خوابوں کی سرزدشن پر قدم رکھتے ہی انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ زخم نامیدور بن چکا تھا۔ ڈیڑھ سال جرم حکومت اس کا علاج کر داتی رہی اس امید پر کہ حالت سنبھلے تو وطن واپس بھیجا جائے۔ مگر یہ وطن کی مٹی اپنے سپوت سے ناراض تھی۔ وہ ماں سے ملنے باپ کو دیکھنے کو تڑپتا رہا..... مگر واپس آنے کے لیے بگڑ رہا..... اور پھر دعائیں دنگ لے آئیں۔ وہ واپس آ گیا اور منوں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گیا۔

نصیب اگر رونہ جائے اور وقت ختم ہو جائے پھر کچھ نہیں بچتا..... پتہ نہیں کہ ہزیمہ اس انسانی اسمگلنگ کے ناسور کا شکار ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ جب جرم کی سرسبز بن کر معاشرے کی رگوں میں پھیل جائے اور نا انصافی، بے حسی اور قلم قوموں کی پیچان بن جائے، جب فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ میں کسی سے شکوہ کتنا نہیں..... ذمہ داروں کو سزا سے، تراز ہند نہیں..... میں کسی انسان سے کچھ نہیں چاہتی۔ میں ماں ہوں..... اپنے رب سے مانگتی ہوں۔

اے میرے رب اس دور کی ماؤں کے دل سخت کر دے اے میرے رب اس دور کی ماؤں کے آفسوخت کر دے۔ اے رب کائنات، دنیا کے بادشاہ!! ایک

منزلہ سہام

ماں تجھ سے فریاد کرتی ہے کہ تو اپنا فیصلہ بدل دے.....

تو ماں کا دل تخلیق کرنا پھوڑ دے۔

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پنارے ساتھیو! سال 2016ء نے اپنا سب کچھ ہمیں سونپ دیا۔ 365 دنوں کے سارے اسرار کھول کر دنیا کا ایک ورق پرانا کیا اور چمکتا ہوا نیا برس ایک سونے کی سی طشتری سا چمکتا نئے آفتاب کے ساتھ طلوع ہونے کو تیار ہے۔ آکاش نے نیلگوں سویرے کی نوید دینے کے لیے دھرتی کو Refresh کر دیا ہے۔ کیا یہ نیا برس بھی ملکی، سیاسی، بین الاقوامی، ثقافتی، تعلیمی، فنی، تجارتی، اقتصادی کا شکار ہو کر گزرے گا۔ کیا اس برس بھی انسانی اسمگلنگ عروج پر رہے گی۔ کیا اس برس بھی جنگ کے بادل ملکی فضاؤں پر چھائے رہیں گے۔ کیا اس برس بھی دھرتی کی دھما چوکنی برقرار رہے گی۔ کیا اس برس بھی سیاستدان صرف ایک دوسرے کے گریبان پھانڈنے کے لیے نت نئے حربے آزما رہے ہیں گے۔ کیا اس برس بھی انسانیت پوری میں بند لاش کی طرح کسی نامعلوم مقام پر پڑی سڑتی رہے گی۔ کیا اس برس بھی ہم پاکستانی لوڈ شیڈنگ کے عذاب جھیل رہے ہیں گے۔ کیا اس برس بھی اغوا برائے تادان، بھتہ خور خور مافیا اپنے مذموم مقاصد میں 110 فیصد کامیاب رہے گی۔ کیا اس برس بھی ہمارے اپنی قہرل پار کو استعمال میں نہ لانے کے عہد پر قائم رہیں گے۔ کیا اس برس بھی ہماری قوم، Twitter, Messenger, Whatsapp, Imo, FtSkype کی فسون خیزی کا شکار ہو کر غنودگی میں رہے گی؟ میرے پاس سوال بہت ہیں مگر ان سوالات کے جواب کون دے گا اور ایک سوال آپ سب کے لیے بھی ہے۔ یہ سوال نہیں حقیقت ہے۔ ساتھیو! عہد کرو کہ اس بار ہم غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا سیکھ لیں گے۔ اپنی ناکامی پر بجائے یہ کہ محنت کریں ایک دوسرے پر کچھ اچھا کرنے والی پالیسی ترک کر دیں گے۔ ”ہم“ کہتے بڑے نکھاری ہی۔ اس کا فیصلہ ہمارے ہی لکھے گئے تعریفی خطوط نہیں کرتے، جن میں ناچنے اور غیر معیاری تحریروں کی تعریف میں قلابے ملائے جاتے ہیں بلکہ آنے والا وقت کرتا ہے۔ وقتی شہرت سے بے وقوف تو خوش ہو سکتے ہیں مگر عقلمند نہیں۔ اپنا کام کریں۔ ادب کی دنیا میں دوست کوئی نہیں ہوتا سب اپنی غرض کے مہرے ہوتے ہیں۔ اہل لب ہانک کر بے وقوف سمجھتے ہیں کہ نارگٹ کو شہوے کرامات ہو گئی۔ نہیں نہیں..... سب بے وقوف اپنی موت آپ مر جاتے ہیں اور ادب کی دنیا کے مرگھٹ پر پڑے مردار سے بھی برا حال ان کا انجام ہوتا ہے۔ سو ساتھیو! اگر دنیائے ادب میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو صرف اپنے آپ سے اور اپنے کام سے پیار کر لو۔ تم امر ہو جاؤ گے۔ رہے نام اللہ کا۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا کہ آپ سب ہی بہت سمجھدار ہیں۔ دسمبر کے برقیے دنوں میں 2016ء کے آخری احوال کی ابتداء اس دعا کے ساتھ کرتے ہیں کہ خدا! اس نئے برس سب سمجھدار ہو جائیں۔ ابتدائے احوال سید ملازم حسین شیرازی سے جو کہ کہاات سے اپنے بھرپور قہرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ”اسلام علیکم! بہت شکریہ کہ میری ارسال کردہ تحریر کو شرف قبولیت بخشے ہوئے شامل اشاعت کرتے ہیں۔ جیل کی اپنی سلاخوں کے پیچھے محبت کو ترستی نکا ہیں انہوں کی چہنٹوں کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں۔ بے قرار اور منتظر نظریں خلوص والفت کی آہوں کی متلاشی ہوتی ہیں۔ ایسے میں سچی کہانیاں کے لکھاری، قارئین سے یہ وساطت تحریر ہم کام ہونا باعث اطمینان ہوتا ہے جس کے لیے مدیران دادودعا کے مستحق ہیں۔ اگر بے بسی اور مجبوری کی زنجیریں نہ ہوتیں تو آپ کے شانہ بشانہ تقریب رائز ایوارڈ کو کامیاب بنانے میں

پوری توانائی صرف کرتا اور کچی کہانیاں کے مچان و دوستان سے شرف ملاقات ہوتا۔ خیر! یا رسالت صحبت باقی۔ ست رنگوں میں سجا حسین و دلکش سرورق۔ ادارے کسی کی خوشی میں خوش ہوتا، رنج و غم والہ میں دکھ بائنا مدیرہ انہی کی انسان دوستی کا ثبوت ہے۔ سلامت رہیں۔ سب کہانیاں گنبد کی طرح بگمگاری ہیں۔ ان کا چٹاؤ کمپوزنگ لازماً محنت طلب ہوگا۔ "ایک تھی زیو" بہترین تحریر۔ "کم بخت عشق" عشق سچا ہو تو انسان معراج کو پہنچ جاتا ہے اگر جھوٹ، فریب، خود غرضی ہو تو عشق تباہی کے آقاہ سندرم میں ڈبو دیتا ہے۔ ویک زودہ محبت، نجم سحرش حسینہ، شعل کے ساتھ Love-2016، خلاف توقع، بارگاہ عشق میں، عشق کی شاخ کا اُلوجھسی اچھوتی کہانیاں زبردست رہی۔ "زرد لومزی" سپر۔ "بلیک لسٹ" آئی آر اور سیاست سے تعلق رکھنے والوں کے لیے معلومات کا خزانہ۔ "زہر عشق" عشق نمبر میں زہر عشق عشاق کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈر خوف، اسرار کی سختیاں جھیلنے والے سرفروشان کی داستان۔ تیرنم کش، بانید پارک، مسئلہ یہ ہے۔ لا جواب ہیں۔ صبا قمر صاحبہ سے انٹرویو نہایت شان وار۔ اب آتے ہیں احوال ٹائے کی طرف۔ سارے خطوط خوب صورت ہیں۔ رفعت ناز صاحبہ، میرے خط اور کہانی کو 100 نمبر دیے بہت شکر ہے۔ شاہ کنول، صدام حسین غازی، مقصود بلوچ آپ سب کا کہانی کی پسندیدگی پر شکر ہے۔ سب کہانیاں، خطوط نہایت شاندار ہیں۔ ہر خط میں کچی کہانیاں سے اپنائیت، پسندیدگی، محبت کی خوشبو اور اظہار ہوتا ہے۔ یہ سب ادارے کی محنتوں کا ماحصل ہیں۔"

پیارے بھائی! نہایت شاندار تبصرے کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ سلامت رہیے۔ کہانیاں بھی جلد شائع ہوں گی۔

ملا قمر، شہداد کوٹ سے ہمارے بھائی مور شاہد حسین لکھتے ہیں۔ "عشق نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نوجوانوں کو موصول ہوا۔ سرورق خوب صورتی سے سجا ہوا ہے۔ صبا قمر سے بیلو ہائے کے بعد اگلے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے منزلہ سہام کا ادارہ شاہ لاکھ بہت یاد آؤ گی۔ دل کی آنکھ سے پڑھا۔ محفل احوال، اپنوں کی محفل، محبتوں کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ محفل کے آغاز میں آپ کی باتیں دل میں اتر گئیں۔ ایم اے راحت انگل کے لیے ولی وعائیں۔ جی آنکل اور صدام حسین غازی ویکم بیک۔ سدرہ انور اور جو نیجو سنسرز امید ہے خیر و خیریت سے ہوں گی۔ محمد اسماعیل بروہی جھٹک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ خیریت ہے۔ صائمہ مجید بھابی خوش و سلامت رہیں۔ ارم خان رب سائیں آپ کو کامیابی سطا فرمائے۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ ممتاز احمد بھیا السلام ملیم! رفعت ناز باری آنے پر کہانی ضرور شائع ہوگی۔ سلامت رہیں۔ بھیا محفل کے اختتام میں آپ کی نظم "ہیرا بھیا" دل کو بھاگنی۔ عشق نمبر بہت ہی عمدہ تھا۔ عشق نمبر کا انمول تحفہ دینے پر بے حد شکر ہے۔ آپ سمیت تمام لکھاری حضرات کو مبارک باد۔ تمام لکھاریوں نے عمدہ تحریریں پڑھنے کو دی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح پرچے کی ابتداء اپنے من پسند سلسلہ خاص "زہر عشق" سے کی۔ یقیناً مانو ایسا سلسلہ پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ ایم اے راحت کی "زرد لومزی" عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسما اعوان "لائف بوائے" ہمیشہ کی طرح منفرد۔ اقبال بانو، ایک تھی زیو، بے مثال، ممتاز احمد کم بخت عشق، محمد بلال فیاض رائٹ فریک، بہت بہترین۔ کنول عمران خان "عشق یقین ہے" "ضرغام محمود" سنی بھر خوشیاں تمہیں بس اچھی تمہیں۔ ایم حسن نظامی نجم، سحرش اور حسینہ حنیف عاصم بلوچ "عشق زندہ رہے گا" دل کی آنکھ سے پڑھی۔ جنیل مینلو، شعل کے ساتھ، عبدالغفار عابد یوں قرض چکایا ہے محبت کی انوکھی داستان تمہیں۔ ایک تصویر ایک کہانی وانیال شمس کی اچھی کوشش ہے۔ ڈیٹان فراز نے آج کی سارہ صبا قمر سے ملایا اچھا لگا۔ ایڈیٹس اور لیس مسج "بے غیرت کہیں کی" ارم نام لو 2016، عظمیٰ شکور "خلاف توقع" سید ملازم حسین "عشق کے کوہساز" فیصل منظور یہ کیسی محبت بے حد پسند آئیں۔ "بارگاہ عشق"

میں "خدا بشری منفرہ تحریر پڑھنے کو وی۔ ٹی وی شام "بھارت میں ایک سٹ" معلومات میں اضافہ ہوا۔ عشق کی شاعری کا الو خاص تحریر تھی۔ مسئلہ یہ ہے وہ بانیہ پارک اتیریم کش بہت اچھے سلسلے ہیں۔"

پیارے مور بھلی کرے آہا! تبہرہ اتنا شاندار تھا کہ مجھے تمہیں فون کر کے شاہاش دینا پڑی۔ امید ہے آئندہ احتیاط کرو گے۔ خوش رہو۔

ہاں شاندار دلاہور سے پہلے بار آمد ہے۔ ہماری بہن دیا آفرین کی، نکستی ہیں۔ "جی کہانیاں میں میری شرکت پہلی بار ہے۔ وجہ ایک عدد تھی کہانی جو اس خط کے ساتھ ارسال کر رہی ہوں۔ البتہ تبہرہ سے قاصر ہوں کہ پرچہ ملنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ ویسے سلسلے وار تاویز سے "لائف ہوائے" کی ہلکی پھلکی کہانی تک سب کچھ اچھا ہوتا ہے۔ تفصیلی تبہرے سے معذرت۔ اگلے ماہ کوشش کروں گی۔ جی کہانیاں وقت پر مل جائے۔ اس وقت تک کے لیے اجازت۔"

بھائی میری بہن دیا! گریا سب سے پہلے تو خوش آمدید! اگلے ماہ پلیز تم نے پورے پرچے پر تبہرہ کرنا ہے۔ معذرت سے کام نہیں چلے گا۔ کہانی کے بارے میں جلد رائے دیں گے۔

ہاں ہمارے نئی قلمی ساتھی ایم حلیف عاصم بنوچ بیاں چوں، انانیوال سے اپنے تفصیلی تبہرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "محترم کاشی بھائی میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری کہانی "عشق زندہ رہے گا" کو قلم اشاعت سمجھ کر جی کہانیاں کے قیمتی صفحات پر جگہ دی ہے۔ یہ آپ کا ہذا ہیں ہے جہاں مجھے نئے قلم کاروں کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور ہمارے دکھ سکھ میں بھی حوصلہ دیتا ہے۔ بہر حال ویری ویری ٹھیکس! کاشی بھائی ایک بات جو میں اپنے بہن بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں پلیز اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ وہ بات یہ ہے کہ پچھلے دو تین شہروں سے میں تقسیم ایوارڈ کی تقریب کے بارے میں پڑھ رہا ہوں اور میرے تمام بہن بھائی لکھنے پڑھنے والے اس تقریب کو بہت زیادہ اپریٹیمینٹ بھی کر رہے ہیں اور واقعی یہ کہے بھی خوشی کی بات لیکن میں اجتماعی احترام سے اپنے تمام لکھنے والے بہنوں بھائیوں سے ایک سوال ضرور کرنا چاہوں گا کہ ادارہ تو ہم سب کے لیے بہت کچھ سوچتا رہی ہے اور ہمیں عزت و شہرت دینے کے لیے بہت کچھ کر رہی رہا ہے اور یہ تقریب بھی صرف اور صرف ہمیں اس معاشرے میں اعلیٰ مقام اور مزید عزت و شہرت دینے کے لیے منعقد کر رہا ہے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ مجھے سمیت ہم سب نے اپنے اس ادارے کے لیے کیا سوچا ہے یا ابھی تک ہم سب کو عزت و شہرت دینے والے اس ادارے کے ساتھ ہم نے کیا تعاون کیا ہے۔ کیا صرف اعزاز پر چلے کر ہم اس ادارے کے ساتھ تعاون سمجھتے ہیں؟ کیا یہی تعاون ہے کہ نیز حائز حائز سمجھ کر بھیج دیا اور اس کی ٹوک پلک سنوارنے کی ذمہ داری اور شائع کرنے کا فریضہ بھی ادارے پر ڈال دیا اور احسان کر بیٹھے کہ ہم نے کہانی لکھ کر ادارے پر بہت بڑا احسان کر دیا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ وہ ادارہ کن کن مشکل مراحل سے گزر کر ہمارے دکھ سکھ میں ہمارے کام آتا ہے۔ ہماری عزت و شہرت کے لیے اسے کیا کیا مشکلیں درپیش آتی ہیں۔ ہم سب کی یہ کیا یہی خواہش ہوگی کہ ہم سب کو ایوارڈ ملنے چاہئیں۔ خواہ ہماری تحریریں جیسی بھی کیوں نہ ہوں جب کہ ہر اشتہار میں ادارے کے ساتھ تعاون کا کہا گیا تھا۔ ہم نے کیا تعاون کیا ہے اب تک؟ میرا سب بہنوں بھائیوں سے سوال ہے۔ ہم سے تو ابھی تک اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی ہے۔ ہم ادارے کی نہ کسی اپنی ہی عزت اور شہرت بڑھانے کے لیے ایک ماہ میں کم از کم چار پانچ شمارے اضافی خرید کر اپنے دوستوں یا چاہنے والوں کو ہی پڑھنے کے لیے دے دیں۔ ادارے نے کون سا ہم

بہن دعا جاہلیہ

محترمہ منذرہ سہام کی بڑی ہمشیرہ ان دنوں امریکہ میں شدید غلغلہ ہیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز اپنے قاری اور لکھاری ساتھیوں سے محترمہ رعنا قیصر صاحبہ کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل کرتا ہے۔

سے ہزاروں لاکھوں کا تعاون مانگا تھا۔ عام فضول کاموں میں تو ہم ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنے ادارے کی سناٹھ کو بڑھانے اور اپنی عزت و شہرت کے لیے ہم اتنا تردد بہت رہے ہیں۔ میرے انتہائی قابل احترام بھائی بہنوں اگر اب تک آپ لوگوں کو یہ خیال نہیں آیا تو پلیز میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنی عزت و شہرت کے لیے ہی سہی کچھ تو آپ لوگ بھی اپنے ماہنامے کی کہانیاں کے لیے سوچیں۔ یہ آپ کا ادارہ ہے پر احسان نہیں ہوگا بلکہ آپ کی ہی عزت و شہرت بڑھے گی۔ بہر حال کہنے کے لیے یہی بہت کچھ ہے۔ کیونکہ ایسے تو ہم بھی کہانیاں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن مزد تو تب ہے جب ہم پرنٹنگ کی بھی غل کریں۔ معذرت کے ساتھ خط کچھ لکھا ہو گیا ہے لیکن میں نے دل کی بات قلم کے ذریعے کہہ دی ہے اور اگر میرے سچ سے کسی بہن بھائی کا دل دکھا ہے تو معذرت خواہ ہوں۔ میری پھر گزارش ہے کہ بھائی ایک دوسرے پر غلط فہمید کرنے اور باہمی باتیں کہنے کے بغیر ایک دوسرے سے خلوص حوصلہ افزائی اور ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے سوچنا چاہیے۔ کوئی اچھا لکھتا ہے یا برا لکھتا ہے۔ یہ فیصلہ ادارے اور عوام پر چھوڑ دینا چاہیے۔ رائٹر کی اپنی سوچ قلم اور لفظ اس کے اچھے برے کا خود فیصلہ کر دیتے ہیں۔ پلیز سب کے لیے اچھا سوچنا چاہیے۔ آخر میں بالخصوص لکھنے والی بہنوں اور بیٹیوں کو یاد دیتا ہوں جن میں ارم ناز منذرہ سہام، منال، اسما، اعوان قابل ذکر ہیں دیگر بہن بھائی بھی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ میری طرف سے تمام ادارے کے کارکنان کو بہت سی دعائیں۔

پیارے بھائی عامر! آپ کی سوچ، آپ کے خیال نے مجھے جنم دے کر رکھ دیا۔ سچ میں آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ آپ کی محبت ہی ہمارا سب کچھ ہے۔

ملا لاہور سے ہماری بہت پیاری بہن ثمینہ طاہرہ بہت احوال میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں۔ "بچی کہانیاں کا خاص عشق نمبر مجھے و نو ممبر کو ملا۔ بہت شکر یہ کاشی سر۔ آپ نے میری تحریر کو "عشق نمبر کی سوغات" کا درجہ دیا۔ میری محنت اصول ہو گئی۔ جزاک اللہ۔ راحت صاحبہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دل سے دعا ہے۔ ایک ویزہ ماہ پہلے میری خوشداشت من صاحبہ قضاۃ النی سے رحلت فرما گئیں اور اب میری والدہ صاحبہ باسپتال میں ہیں۔ ان کا میجر آپریشن ہوا ہے۔ آپ سے اتنا س ہے کہ میری امی جان کے لیے دعائے صحت ضرور کیجئے گا۔ اب آتی ہوں شام کی طرف ویسے تو اکتوبر کے شمارے پر بھی آدھا ادھورا تبصرہ لکھا چاہے اسوچا اسے الگ سے کیا بھیجوں۔ نومبر، اکتوبر کا ایک ساتھ ہی لکھ ڈالتی ہوں۔ منذرہ جی کے ادارے "بے خبر اور شاو لاکھ" بہت یاد آؤ گی "ہمیشہ کی طرح روح کی مہربانیوں میں اتر گئے۔ صفحہ نمبر 8 سے لے کر صفحہ نمبر 29 تک کاشی سر نے خوب محفل سجا رکھی ہوتی ہے۔ سب نئے اور پرانے احوالوں کو میرا پر خلوص سلام۔ یہ محفل بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ ان میں آنے والے سب ساتھی ایک دوسرے سے بہت عزت احترام اور خلوص سے ملتے ہیں۔ بھائی فیصل، اندیم بھٹی صاحب، عیسیٰ السلام، اور اللہ پاک آپ کو خوش رکھے، آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے آمین۔ بھائی مجید احمد جانی، بھابی صائمہ مجید، آبی ثبوت غفار، احسن ابرار رضوی صاحب، صائمہ بشیر،

مومنہ بتول، شاہدہ ذاکر، حنا بشرہ، ارم خان، ممتاز احمد، ثنا، کنول، اغزال، کرن، بشری کنول، مقصود احمد بلوچ، ایم حسن نظامی، تنزیلہ ثانی، خضر حیات، فرزانہ گل، حسین خواجہ، مہر پرویز، دولہ، مومنہ بتول، سلیمان شبیر، فرح انیس، ملک علی رضا، نازبت افشار، ام حبیبہ آپنی نفیسہ، فضل، سید ملازم حسین شیرازی، منور شاہد حسین، رانا حبیب الرحمن اور باقی سب احوالیوں اور لکھاریوں کے لیے بھی بہت سی دعا کریں۔ آپ سب نے میری تحریروں کو پسند کیا اور میرے تبصرے کو بھی پسند کیا۔ آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ۔ جزاک اللہ۔ اکتوبر کے شمارے میں سیم اختر کی "دی آئی پی" اسٹاٹسٹکس کی "لائف بوائے کہانی" ارم خان کی "فرینڈ شپ" ضرعام محمود کی "ایٹلیس" ام مٹاٹل کی "سیاہی پھیلتی ہے ہر طرف" سید ملازم حسین کی "کٹارو" اعجاز احمد قمرال کی "چوروں کو پڑ گئے مور" شاہ کنول اللہ ویت کی "جست فار انجوائے منٹ" نسیم سحر کی "زندہ فن کر دیا" رئیسہ خالد کی روشنی والا رستہ "ارم ناز کی" نظروں کی گھر والی "پرویز احمد دولو کی" بد معاش "مجید احمد جانی کی" انجور کی جلی "نوزیہ فرید احمد کی" جھوٹا گواہ "ندیم عباس میواتی کی" ورون کی ہیر "جاوید راہی کی" آخری فیصلہ "علیہ ہدایت اللہ کی" مرد اور عورت "غرض کہ سب کی تحریروں اپنی اپنی جگہ بہت اعلیٰ تھیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اور اب آتی ہوں نومبر کے "عشق نہر" کی طرف اور اس میں بات کرنا چاہتی ہوں سب سے پہلے اور ایس ایڈیٹس مسیح کی "بے غیرت کہیں کی" اس قدر خوب صورت کہانی کہ الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ اقبال بانو آپ کی "ایک تھی زینو" حنا بشری کی "بارگاہ عشق" میں "سید ملازم حسین شیرازی کی" عشق کے کوہسار "عبد الغفار عابدی" یوں قرض چکانا ہے "جیل میلو کی" "نہل" کے ساتھ "بلاشبہ بہترین تحریروں میں۔ ممتاز احمد کی "کبخت عشق" محمد بلال فیاض کی "رائٹ ٹریک" اعجاز احمد قمرال کی "دیمک زدہ محبت" ایم حسن نظامی کی "نجم، سحرش، حسینہ" ارم ناز کی "لوہری" 2016 "عظمتی شہور کی شوریدہ سر محبتوں کی کچی تصاویر۔ بہت خوب، ماشاء اللہ سب نے بہت اعلیٰ لکھا۔ "زرد لومڑی" اور "زہر عشق" بھی اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور آل سارا شمارہ ہی بے مثال رہا۔ بھارت میں بلیک لسٹ کی یہ قسط بھی آنکھیں کھول دینے والی رہی۔ "ہائیز پارک" اور "تیرنیم کش" کے سب سلسلے بھی بے مثال رہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔

اچھی بہن! تبصرہ آپ نے شاندار کیا مگر کچھ جگہ آپ کی وضاحتیں..... کیا آپ کو ضرورت ہے؟؟؟ جو اچھا لکھتا ہے ایمانداری کو اپنا شیوہ بناتا ہے ہم اسی کو بڑا کہتے ہیں۔ ساری عمر لکھ کر بھی اگر آپ کو پہلے دن ہی کی طرح Treat کرنا پڑے تو آپ کیا لکھاری ہوئیں.....!

بہن کراچی سے ہماری پیاری آنٹی نفیسہ فضل لکھتی ہیں۔ "عشق نہر" کیا بات ہے یکم نومبر کو مل گیا اور جلدی جلدی پڑا ہوا۔ "ایک تھی زینو" اقبال بانو عشق میں ڈوبی اچھی تحریر ہے۔ آج کل ایسا عشق کہاں۔ "کم بخت عشق" ممتاز احمد، خاور نے اپنے "سست شہباز کے اعتقاد کو دھوکا دیا اور مبرا کین اپنے شوہر اور گھر والوں کو وفاق ویتی رہی جس کا انجام یہ ہی ہونا تھا۔ "رائٹ ٹریک" محمد بلال فیاض۔ آج کل کے فلرٹ لڑکے جیسے کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ "دیمک زدہ محبت" اعجاز احمد قمرال، ایسے نیک لڑکے کا انجام اچھا ہی ہوا جو کبھی کسی ایک کا نہ ہوا۔ "عشق یقین ہے" کنول عمران خان، ماروی اور مراد کی محبت کچی تھی۔ نذیر کی ہٹ دھرمی سے بہت مشکلات ہوئیں۔ مگر جیت بالا آخر ماروی اور مراد کی ہوئی۔ "مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس" ضرعام محمود، اچھی تحریر ہے۔ "دی رسی مرزوار خان کا فیصلہ اچھا تھا۔ نجم، سحرش اور حسینہ" ایم حسن نظامی، نوٹی خاص تاثر نہیں پھوڑا۔ "عشق زندہ رہے گا" ایم حنیف عاصم بلوچ، زبردست کہانی ہے۔ صبا قمر کا اثرہ یو اچھا لگا۔ "نہل کے ساتھ"

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

پاکستان کی کہانیاں سننا

مئی پاکستان سے نکل کر.....

پاکستان کے دل میں.....

زندہ دلاں لاہور کے درمیان

ماہ جنوری میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا لاہور..... کراچی سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب..... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے.....

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر.....

آپ کا اپنا.....

کاشی چوہان

نوٹ: تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان اگلے ماہ کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنہیں منہ ایک اچھی کہانی لانی ہیں۔ "بے غیرت کہیں کی" ایڈیٹس اور پریس مسیح، لاجو نے ساری زندگی اپنی برہادر کی اس محبت کی خاطر بہت خوب۔ "بارگاہ عشق" میں "حنا بشری، بہت اچھی تحریر ہے۔" "لو 2016" "ارم ناز، "عشق کے کوہسار" سید ملازم حسین شیرازی اچھی کہانیاں تھیں۔ "یہ کیسی محبت" فیصل منظور، دعا کے ساتھ مسز بدل نے بہت برا کیا۔ وہ تو نا سمجھ بچی تھی غلطی دعا کی ماں کی تھی۔ "خلاف توقع" عظمیٰ شکور، "عشق کی شاخ کا الو" شمیمہ طاہر بہت امدل کلاس کے عشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ پاک انہیں زندگی اور صحت کا مدد عطا فرمائے، آمین۔ "زر و لومڑی" دلچسپ ہو گیا ہے اور کاشی بیٹا آپ کیا چیز ہو کہاں سے جن جن کر لفظوں کے موتی لاتے ہو۔

بکہ اچھی آئی اتھیر بہت زبردست کیا آپ نے۔ کہانیاں انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوں گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

اللہ کو جو چک نمبر 301 ج ب سے یہ پہلی پہلی آمد ہے ملازم مرتضیٰ عدوی صاحب کی لکھتے ہیں۔ "شروع ہوتی سردی میں نو ہر کا شمار ملا۔ عشق نمبر، اب عشق نمبر کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ شمار سورج جیسا بہترین اور روشن ہے۔ تمام کہانیاں اچھی ہیں سب سے اچھی بات یہ کہ کہانیوں میں کوئی مقصد ہے کوئی اچھی بات ہے۔ میں بھی بہت جلد آپ کو ایک کہانی روانہ کر رہا ہوں گا۔ نومبر 2002ء سے نئی کہانیاں کا پکا قاری ہوں تب جب اس سال سے لیتا تھا۔ 2011ء سے ہزار بیہ ڈاک سالانہ خریدار ہوں۔ محمود شام صاحب کا سفر نامہ شمارے کی جان بنے یہ 1970ء کے حالات جو ہم کو بتا رہے ہیں بہت اچھا ہے۔ آج کی نسل کو پتا تو لگے پاکستان کی زندگی میں کیا کیا مشکلات آتی رہی ہیں مگر خدا کا ایا ہوا یہ ملک ہمیشہ قائم رہے گا۔ اب پراسرار نمبر کا انتظار ہے۔ آپ مہم جوئی نمبر بھی شائع کریں امید ہے یہ خط شائع ہوگا۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے خاص دعا۔

بھائی رے مرتضیٰ! خوش آمدید! تبھر بہت اچھا لگا! اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار ہے۔ کہانی جلد بھی پڑھ کر رائے دیں گے۔

میرا کوٹ نجیب اللہ سے یہ پہلی بار احوال میں آمد ہو رہی ہے۔ ہمارے ننھے ساتھی فہد علی عباسی کی لکھتے ہیں۔ "میرا، فہد علی عباسی ہے۔ مجھے شعر لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میری عمر 17 سال 6 ماہ ہے۔ میں یہ کچھ شاعری آپ کو بھیج رہا ہوں اگر آپ کو اچھی لگے تو اسے ضرور شائع کریں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی اور میں اس سے بھی اچھی طرح لگھ سکوں گا۔ میں کافی عرصے سے تمہارے ہاؤس (ارے...) مگر آج تک کہیں بھی شائع نہیں کر دئی۔ میرے دوست مجھے کہتے ہیں کہ تم بہت اچھا لکھتے ہو۔ (اچھا جی...) اس لیے میں آپ کو بھیج رہا ہوں اور اگر آپ کو اچھی لگے تو مجھے ریپائس ضرور دیں۔"

بھائی رے فہد! خوش آمدید! تبھر کہاں ہے۔ اب اگلے ماہ تمہیں تبھرے کے ساتھ تمہارے مضمون ہیں۔ شاعری معیاری ہوئی تو جلد شائع کریں گے۔

ہمارے پیارے بھائی چکوال سے عبدالعزیز جی آ کی آمد ہے، لکھتے ہیں۔ "ہمارے اردو کے بچہ کہا کرتے تھے الفاظ پرندوں جیسے ہوتے ہیں۔ دل کی احرار پر اتریں تو نکھ لیا کر د۔ اڑ جائیں تو وہیں لوٹ کر نہیں آتے۔ مجھے لفظوں سے دلی محبت ہے اور یہ محبت ہی ایک مدت کے بعد مجھے احوال میں کھینچ لاتی ہے۔ ماشاء اللہ طشتری احوال میں بڑی رات ہے۔ ہر چہرا چاند کا گھرا اور گلاب کا نکھرا لگتا ہے۔ اب تو بڑے رنگ ہیں نئے اور پرانے دوستوں کے سنگ ہیں۔ پہلا دل آویز خط غزالہ کرن کا جس کی کھلی ذلی بات بہت اچھی لگی۔ میں نے بھی سچ بولا تھا بس پھر کیا

نیا سال نئے ہنگامے

برف کے شہر

نئے سال کے نئے ہنگامے

ملکوں ملکوں پھر مسافر اور پھر..... مسافر راہی عدم ہو گیا۔ قمر علی عباسی ہمارے دیرینہ ساتھی اور ہم دم، سچی کہانیاں میں، قمر علی عباسی کے قلم سے آخری سفر پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو ہسپاروں کی دنیا برف کے شہروں کے نظارے ہمارے اپنے وطن، جنت نظیر پاکستان کے وہ قصبے جنہیں پڑھ کر آپ خود اپنا وطن دیکھنے کے لیے بے خود ہو جائیں گے۔

لاری

سفر وسیلہ ظفر..... مگر اس سفر میں بھلا کون منزل تک پہنچا، کون راہزن ہوا اور کون رہبر حضرت انسان کے لئے بنے قصبے نیا سلسلہ لاری اڈا..... پلیٹ فارم کے شاندار سلسلے کے بعد عوام کے نبض شناس نگہاری ممتاز احمد کے قلم سے..... آپ کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرنے کے لیے ماہ جنوری سے سچی کہانیاں میں تہلکہ خیز آغاز۔

لکھنؤ خاندان سے پاکستانی خاندان تک

زندگی جبر مسلسل کی طرح کافی ہے ☆☆ جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

اُن جیتے جاگتے کرداروں کی کہانی جو خود ایک کہانی بن گئے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ زمانے کے اُن دیوانوں کی داستانیں جو آج اپنی سلاخوں کے پیچھے خود اپنی ذات کو کھوج رہے ہیں۔ وہ انہول کردار جو زندگی کے بازار میں آج بے منزل ہو گئے۔ پانگل خانے میں اپنی زندگی کے دن پورے کرتے قابل رحم لوگوں کی عبرت سامانیاں سچی کہانیاں کا نیا لاقانی سلسلہ۔

سیلف میڈ لوگ

زندگی کے اہم شعبوں میں سرگرم عمل مشہور و معروف شخصیات سے انٹرویوز کا نیا سلسلہ۔ سیلف میڈ لوگوں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ بے جزا وہ خاص سلسلہ جو یقیناً قارئین کے دل کی آواز بنے گا۔ نئے سال کا منفرد سلسلہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا موت کے منہ سے نکال ہوا راہِ حوک کا مسافر ہوں۔ تصوف و روحانیت کا طالب علم ہوں۔ راہِ حق سے ہٹا نہیں
 ہوتا ہوا اور انشا، اللہ کج حد تک ذہن ہوں گا۔ میری غزل کا اک شعر ہے

جس کو دیکھو وہی منافق، کس سے دل کی بات کریں ہٹا ہٹا نفسا نفسی کے عالم میں دل کا آئینہ سونا ہے

فیصل ندیم بھٹی، ممتاز احمد، شہداء کنول، مہر پرویز دونو، نظامی صاحب، ارب خان، حنا بشری، رانا حبیب الرحمن،
 مومنہ بٹول، شاہدہ ڈاکر، صائمہ بشیر، مجید جانی، صداقت حسین، ساجد اور خطوط کی بہار میں آپنی نفیسہ فضل اور آپنی نگہب
 غفار بھی شامل ہیں جن کی دعاؤں کے ہم سب طلب گار ہیں۔ سب احوالیوں کے تہرے جاندار و بے مثال ہیں۔
 عشقِ نبر کی کہانیاں پڑھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں عاشقوں کے شہر میں گھوم رہا ہوں اور خوفزدہ ہوں لرز رہا
 ہوں کانپ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ انسان مرد عورت کیا دنیا میں صرف اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے۔ اس دھرتی پر
 عشق نے کیا کیا گل کھلائے۔ ممتاز احمد کی کہانی ”کم بخت عشق“ کے کردار خاور نے بغیر سوچے سمجھے شیطانی اکبتاؤں
 میں آکر اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ہستی مسکراتی زندگیاں برباد کر ڈالیں۔ محمد بلال فیاض کی ”رائٹ ٹریک“ گز
 اسنوری ہے۔ اقبال بانو کی کہانی ”ایک تھی رینو“ متاثر نہ کر سکی۔ شمیمہ طاہر بٹ ”عشق کی شاخ کا لٹا“ بہت پسند آئی۔
 ویلڈن، جیجیل، مچلو کی ”نھل کے ساتھ“ پاکیزگی کے پردے میں لپٹی کہانی نے متاثر کیا۔ مزید مطالعہ جاری ہے۔
 سچی کہانیاں ایوارڈ 2016ء کی پہلی پروکار تقریب لاہور شہر میں منعقد کرانے کا اشتہار نظروں سے گزرا ہے۔ میں
 خصوصی طور پر آپ کو میزمنزہ سہنام اور پوری ٹیم کو ایڈوانس مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اچھے بھائی! انشاء اللہ امید ہے آپ ہر ماہ اپنی آمد اسی طرح باقاعدہ بنائیں گے، سلامت رہیے۔

ہٹا لڈن ضلع و ہاڑی سے ہمارے بہت پیارے ساتھی۔ ”نشی محمد عزیز“ سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔
 ”کچھ یاد نہیں کتنے عرصے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ بہر حال آپ کی محبتوں کا میں شروع سے معترف رہا ہوں
 اور یقین کریں بعض اوقات مجھے شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے کہ کہیں آپ سے کیا ہوا کوئی بھی وعدہ ایفا نہیں کر سکا
 لیکن آپ یقین کریں کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بھی میرے حالات تو آپ جانتے ہی ہیں بس غم
 روزگار سے فرصت نہیں ملتی لیکن پھر میں بھائی ممتاز احمد صاحب بننے کی سعی ناکام کرتا ہوں کہ بھلا ان کا میرا کیا
 مقابلہ! چہ پدی چہ پدی کا شور مچا! اکتوبر کا شمارہ چونکہ کافی لیٹ ملا تھا اور پھر اب تو نومبر بھی قریب ہے لیکن آپ
 میرے یہ چند الفاظ صرف حاضری سمجھ کر شامل احوال کر لیں تاکہ دوستوں سے سلام دعا کر لوں۔ میری غیر
 حاضری کے دوران جن دوستوں نے احوال میں فون پر یا ایس ایم ایس کے ذریعے مجھے بتایا کہ آپ کی کمی
 محسوس ہو رہی ہے ان سب کا خصصاً ابو ہریرہ بلوچ، حافظہ ندیم عباس میواتی، مہر پرویز احمد دونو، عبدالغفار عابد،
 مقصود احمد بلوچ، ارشد دفا، اشفاق شاہین، ممتاز احمد، سدرہ النور علی، محمد یعقوب احمدانی کا مشکور ہوں کہ ان
 صاحبان نے گا ہے بگا ہے یاد رکھا اور عظمیٰ شکور کا بھی شکریہ ادا کر دوں کہ انہوں نے یاد نہیں کیا۔ دیگر دوستوں
 میں رانا حبیب الرحمن لاہور جیل سے فلک شیر تابش، نزاہت افشار، ایم حسن نظامی کے نام سچی کہانیاں میں
 دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔“

اچھے پیارے نشی جی! دیر لگی آنے میں..... شکر ہے پھر بھی آئے تو۔ آپ کے چند الفاظ نے بھی احوال میں
 رونق کر دی ہے۔ آپ سے کیا گلہ کروں کہ ہر ماہ آپ کی حاضری مطلوب ہے۔ مگر ہائے رے یہ غم روزگار کے
 جھیلے۔ خوش رہیں۔

ہٹا کوٹری سے تین ماہ بعد آمد ہو رہی ہے ہمارے قاری ساتھی نعمان احمد آرائیں کی، لکھتے ہیں۔ اگست اور ستمبر

تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

خانقاہ

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں کی حیرت ناک داستان
کاوش صدیقی ایک معروف لکھاری، جن کی تحریریں نگاہوں سے نہیں
دل سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے قلم کا نوکیلا، کٹیلانشتہ، معاشرے کے ان
پہلوؤں کو کھوجتا تراشتا ہے جو عیاں ہونے کے باوجود پوشیدہ رہتے
ہیں۔ خانقاہ ان کی تیکھی اور چھتی نشتر زنی ہے جو کہ ہمارے اطراف
سے گندھی ہے۔ پیروں، وڈیروں، سیاسی کٹھ پتلیوں کے پراسرار
معاملات، سچے، جھوٹے، مصلحت آمیز، دروغ گو کے درمیان ایک
مردوروش کی عجیب داستان جس کے افکار سے دنیا بدل گئی۔

ان کے لئے بطور خاص جو اچھی تحریریں پڑھنا جانتے بھی ہیں اور چاہتے بھی ہیں۔

ماہ جنوری سے ماہنامہ 'سچی کہانیاں'
میں ہنگامہ خیز آغاز

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے شرے پر تھرا کچھ گھرنی پریشانیوں کی وجہ سے نہیں کر سکا مگر اب کر رہا ہوں اور آپ نے میرے گزشتہ تبصرے کا جواب دیا اور اس میں آپ نے T.C.S والے کا پوچھا ہے آپ اس T.C.S والے کو چھوڑیں کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے دوسروں کو نیارا ستہ دکھاتے ہیں۔ آپ کا اور قارئین کا ساتھ نصف صدی سے ہے۔ میرا اور آپ کا ساتھ ایک سال 30 دن کا ہو چکا ہے اور تبصرے بھی کافی آتے ہیں۔ تمام احوالیوں کہانیاں اور ناول لکھنے والوں میں کاشی چوہان، ایم اے راحت، مسئلہ یہ ہے میں باباجی، بابائے پارک میں مراسلے، انتخاب اور تیرنیم کش میں شعر لکھنے والوں کو ہر بار کی طرح تمام عرض ہے اور ہر بار کی طرح اس بار بھی اُست اور تبرکہ ادا رہے اور احوال تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ احوال میں شامل ہونے والوں کو خوش آمدید اور سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں کے لیے سلامتی، خوش حالی، تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز واقارب اس دنیا کے فانی سے پروا کر چکے ہیں ان سب کے لیے دعائے مغفرت اور آخر میں اجازت چاہتا ہوں۔"

پیارے نعمان! خوش رہو اور ہاں آئندہ تبصرہ ذرا جلدی اور وقت پر کر دیا کر ابھائی تم نے کہا کہ فی ایس والے کو چھوڑیں، تو پیارے! تم نے 'پنے خط میں اسے کیوں بکرا تھا؟' مثلاً کراچی سے براے دنوں کے بعد ہمیں ہماری بہن نسیم سحر یا ذکر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ 'اعید کے فوراً بعد پراسرار نمبر دے کر تو آپ نے ذرا ہی دیا۔ کہانیاں پڑھ تو لیں مگر تبصرہ کی ہمت نہیں ہوئی (ہاں بابا) تبصرہ کا شمارہ ذرا دیر سے ملا تھا لہذا اس تبصرہ بھی اوجھار رہا۔ اب اکتوبر کے شمارے کی بات کرتے ہیں منزلہ صاحبہ کا ادارہ یہ بہت بہترین تھا۔ 'سچی کہانیاں' کا پہلا ایوارڈ لاہور میں کرنے کا فیصلہ درست ہے کیوں کہ زیادہ تر نگہاری اور احوالی پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہاں آسانی شرکت کر سکیں گے اور غالباً وزیر بھی وہی لوگ ہوں گے (ایوارڈ لسٹ کو غور سے دیکھا کریں) شمارے میں جن مرحومین کا ذکر ہے ان کے لیے دعائے مغفرت ہے۔ اب کہانیوں پر تبصرہ محمد سلیم اختر کی پہلی سچ بیانی ہمارے ہاں رائج دی آئی ٹیچر کی عکاس ہے۔ امن مٹا ہن کی دوسری سچ بیانی غرور میں ذوقی عورت کی داستان ہے۔ سچ ہے کہ جہالت واقعی بری چیز ہے جب ہی تو ہمارے دین میں غم کو ہی فضیلت حاصل ہے۔ انیس میں طاقت اور غرور کا درست انجام بتایا ہے۔ ضروری نہیں ہر چیز پیسے اور طاقت سے حاصل کی جاسکے۔ حیات اللہ طاقت کے نشے میں اپنے پھیلا تک انجام سے دوچار ہوا۔ ارم خان کی 'فرینڈ شپ' اور شام کول کی 'جسٹ فار انجوائے' عام سی کہانیاں تھیں جس میں موبائل کا غلط استعمال اور محض اپنی دلچسپی کے لیے دوسروں سے جھوٹ بولنا۔ یقیناً یہ ہے تو عام سی حرکت مگر اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں اور کم از کم لڑکیوں کو ایسی حرکت زیب نہیں دیتی۔ ملازم حسین شیرازی کی کفارہ اچھی کہانی تھی بات اور وعدہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اعجاز صاحب کی 'چوروں کو پڑ گئے مور' بہت دلچسپ کہانی تھی۔ ہنسی بھی آئی اور افضل صاحب کی بائیسکل سے محبت پر رشک بھی آیا۔ ہلکے پھلکے موضوع پر یہ دلچسپ کہانی بہترین تھی۔ 'روشنی والا رستہ' گو کہ موضوع پرانا تھا مگر تفصیل سے لکھا جاتا تو زیادہ مزہ آتا۔ شعلہ سامان تینوں تحریریں زبردست تھیں۔ ارم ناز کی 'نظر کی گھر والی' بہت اچھی تھی۔ شاید یہ بھی ہمارے بگڑتے معاشرے کی ایک تصویر ہے۔ ویل ون ارم۔ محمد پرویز کی 'بد معاش' بھی جہالت اور غربت کے ستم بیان کر رہی تھی۔ عطیہ کی 'مرد و عورت' بھی بہت اچھی رہی۔ حنا ولڈیر کا انزو یونا جواب تھا۔ بلاشبہ بلبلے کی مقبولیت حنا کی ہی وجہ سے ہے۔ 'جھونا گواہ' موضوع بہت گہرائی لیے ہوئے حساس تھا مگر اس پر تفصیل سے لکھا جاتا تو زیادہ سبق آموز ہو جاتا کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جھوٹی گواہی دینا اور اس کا عذاب بھی سخت ہے۔ 'انگور کی جینی' کہانی بھی

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا ناول ”دامِ دل“

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

”دامِ دل“..... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

”دامِ دل“..... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی..... اور جب

محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو.....

”دامِ دل“..... کہانی ہے اُس ماں کی..... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی

روٹیوں نے سولی چڑھا دیا

”دامِ دل“..... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے گریہ چہروں

سے نقاب اتارنے والوں کی

”دامِ دل“..... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی..... جن کی

ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول ”دامِ دل“

آپ کے اپنے ماہنامہ ”دوشیزہ“ ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سبق آموز تھی۔ محمود شاہ کا سفر نامہ ہٹ جا رہا ہے۔ باقی ساری چیزیں حسب معمول بہتر تھیں۔ آخر میں میری کہانی لگانے کا شکریہ۔ تمام اسٹاف کو سلام اور دعا میں اور مدیران کرام کو خصوصی سلام اور دعائیں۔
 بکھ اچھی بہن! ایوارڈ ونرز پر نگہ کر آپ نے ہماری دیانت داری پر ضرب لگائی ہے۔ حالانکہ آپ بھی جنوری 2015ء کی کہانی پر جی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ ٹولیکٹ میں نامزد ہو چکی ہیں۔ تبصرے کا بہت بہت ممنون ہوں۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

بہن! ساہیوال سے ہماری سینئر نگہاری بہن نیر شفقت کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ "کیسے ہو۔ کبھی یاد ہی کر لیا کرو ہمیں ایک ایس ایم ایس ہی تو کرنا ہوتا ہے کہ آپ کی فلاں نمبر آ رہا ہے کچھ بھیج دو۔ مگر لگتا ہے کہ ٹائپ کرنے میں بھی ناظم ضائع ہوتا ہے۔ وہی دو لفظ لکھی کہانیاں کی رونق بڑھا دیں تو شان بڑھ جائے گی (ارے آپ! کیا طوطے سے قال لکھوائی ہے)۔ پراسرار نمبر کے بارے میں پڑھا تو رہا نہیں گیا۔ چاچو کو گھیر گھار کر کہانی سنی اور سٹنچ قرطاس پر بکھیر دی۔ تب ناظم پر مٹی ہے یا دبیر میں لگتی ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ (گڈ! بہن ساؤی واری اے)۔ سنا ہے جی کہانیاں کا ایوارڈ میلہ لگ رہا ہے لاہور میں۔ بلاؤ گے۔ یہ وہاں کی جھینے کا تورستہ ہے لاہور سے ساہیوال کا۔ میں انتظار کروں گی (وینکم جی! آپ کو کیا دعوت نامے کی ضرورت ہے؟) جی کہانیاں پر تمہاری محنت نظر آ رہی ہے۔ سب دوستوں کو سلام پھر ملیں گے انشاء اللہ۔
 بکھ اچھی سی آپ کی تحریر بیچنے کا شکریہ! ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ جی کہانیاں باقاعدگی سے پڑھتی ہیں؟ لیکن خیر۔ ہماری خوش فہمی کا انجام ہوا اور ہاں بہنوں کو دعوت ناموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جم جم آؤ جی۔

بہن! لاہور سے ہماری پیاری بہن حنا بشری عرض گزار ہیں۔ "نومبر کا شمارہ" "عشق نمبر" لا جواب تھا۔ سرورق بہت رنگین اور خوشنما تھا۔ منزہ سہام صاحبہ کا ادارہ یہ دل کو دکھی کر گیا۔ ایم اے راحت صاحب کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ ارم خان اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک مقصد میں کامیاب و کامران کرے اور آپ حافظہ بن جائیں (آمین)۔ احوال کی محفل کاشی بھائی کے سنگ سبھی تھے۔ آپ کے محبت بھرے جوابات سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو شاد رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کاشی بھائی کہانیاں اور آپ نے مجھ سمیت بہت سوں کو لکھنا سکھایا۔ رانا حبیب الرحمن اور ملازم حسین شیرازی بھیا آپ دونوں کا کوئی ذکر کرے نہ کرے مگر آپ ہماری دعاؤں میں رہتے ہیں۔ کاشی بھیا عشق نمبر آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ تمام رائٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ سب نے بہت محنت کی۔ اقبال بانو صاحبہ ایک بڑا نام ہیں تحریر بھی لا جواب تھی۔ ممتاز احمد صاحب نے جس عشق کی بات کی وہ واقعی کم بخت تھا۔ عشق مجازی جب تک عشق حقیقی میں نہ ڈھلے وہ اپنی معراج کو نہیں پہنچتا۔ عبرت انگیز تحریر تھی۔ خوش رہیں۔ بے غیرت کہیں کی عشق کی لازوال داستانیں تھیں۔ سب نے عشق نمبر کی رونق میں اضافہ کیا۔ اب بات ہو جائے عشق نمبر کی سوغات کی تو ثمنینہ طاہرہ نے عشق کی شاخ کا ادھر جس بے ساختگی سے لکھی وہ قابلِ قسمن ہے۔ بلاشبہ ثمنینہ طاہرہ نے عشق نمبر کی نمبروں کی تحریر تھی، وینڈن۔ عشق نمبر کی پانچ کہانیاں مجھے بے حد پسند آئیں وہ بہت خوب صورت تحریریں تھیں۔ لکھنے والوں نے بہت دل سے لکھا اور عشق نمبر کو چار چاند لگا دیے۔ پہلا نمبر "رائٹ ٹریک" محمد بلال فیاض اور "دوسرا نمبر" "عشق کے کوہسار" ملازم حسین شیرازی، تیسرا نمبر "منہی بھر خوشیاں تھیں بس" ضرعام محمود، چوتھا نمبر "خلاف توقع" عظمیٰ شکور، پانچواں نمبر "وینکم زدہ محبت" اعجاز احمد قمرال یہ پانچوں کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ آپ سب نے بہت محنت کی ان پانچوں کہانیوں کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آخر میں سب

کے لیے بہت سی دعائیں صرف خوش نہیں رہنا بلکہ دوسروں کو بھی خوش رکھنا ہے۔ میں نے احوال میں کاشی بھیا کو ہمیشہ یہ کہتے ہوئے دیکھا محبت، محبت اور صرف محبت۔ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اپنی کہانی اور خط کے شامل کرنے پر شکر گزار ہوں۔ صبا قر سے ملاقات اچھی رہی۔ خط بہت طویل ہو گیا معافی چاہتی ہوں۔

بھیا کی سی بہنا! تبصرہ تحریر کی طرح شاندار کیا تم نے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ بھیا شادی وال، مہجرات سے ہنری شاعرہ، بین عائدہ نور عاشا لکھتی ہیں۔ "اکتوبر کا شہرہ دیکھنا ناٹکل بہت خوب صورت دل خوش ہو گیا مگر یہ کیا؟ میں نے ڈاؤن لوڈ کیا تو اوپن ہی نہیں ہوا۔ دل پھر سے اپنی جگہ پر آ گیا خیر میں نے کچھ آن لائن ہی پڑھ لیا۔ احوال سب کا ایک سے بڑھ کر ایک رہا۔ سلسلہ دار ناول ہیں ہی زبردست "زیر عشق" اور "زرد لومڑی" اس کے علاوہ جو میں نے تھوڑی سی کہانیاں پڑھیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ "کفارہ" سید ملازم حسین شیرازی کی کہانی تھی۔ اس کے بعد "جھوٹا گواہ" فوزیہ فریدہ احمد کی پھر "آخری فیصلہ" بھی اچھی تھی۔ بادبان، اودن کی ہیرا نظر کی گھر والی سب کی سب مزے کی تھیں۔ ان ٹیکٹ بھی کہانیاں کا ایک ایک درقی مزے کا ہوتا جا رہا ہے۔ ہاں جی میں کاغذ بھی کھاتی ہوں اور ڈائجسٹ کے تو کچھ زیادہ مزے کے ہوتے ہیں اور مزے سے یاد آیا "تیرنیم شش" بھی بہت اچھا اور مزے دار سلسلہ ہے مگر میں خن آباد کو بھی مس کرتی ہوں۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ جی کہانیاں ہمیشہ ترقی کرتا رہے، (آمین)۔

بھیا کی عائدہ! تبصاری دعائیں اور ہماری محنت ہی جی کہانیاں کو دلچسپ بناتی ہے خوش رہو اور ہر روز احوال کا حصہ بنتی رہو۔

بھیا مقصود احمد بلوچ کی میاں چنوں سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ "جی کہانیاں نومبر 2016ء مورخہ 31 اکتوبر کو ملا۔ اس دفعہ ناٹکل دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بہت ہی شاندار تھا۔ پرچے کو وقت پر مارکیٹ میں لانا، اس کی کمپوزنگ، عمدہ اسٹوریوں کا انتخاب۔ ویلڈن کاشی جی۔ میری نگارشات پسند فرمانے پر فیصل ندیم بھٹی، ملک علی رضا، نوابت افشار مہرہ، میں ان سب کا تہ دل سے مشکور ممنون ہوں۔ اس دفعہ کہانیوں میں محمد حنیف عاصم بلوچ کی اسٹوری "عشق زندہ رہے گا" بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ ویری ویلڈن حنیف صاحب۔ ممتاز احمد کی اسٹوری "کم بخت عشق" بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ اس کے علاوہ خلاف توقع، یہ کیسی محبت، بے غیرت کہیں کی، یوں قرض چکایا ہے یہ سب تحریریں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ اس دفعہ مینٹر کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا کاشی بھائی کی "ہیرا، انجھا" دل کو چھو جانے والی لکھ تھی ویری تائیں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اب اگلے ماہ حاضری ہوگی۔"

بھیا اچھے بھائی! تبصرہ شاندار کیا آپ نے..... مزید یہ کہ سلیم اختر صاحب کو آپ کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہماری ان سے یہ باتیں ہو چکی تھیں۔

بھیا ہمارے ہر دلعزیز لکھاری ممتاز احمد سرگودھا سے عرض گزار ہیں۔ "دعا ہے ہمارے پیارے وطن میں رہنے والا ہر فرد صحت، تندرستی، سکھ چین اور سلامتی کے ساتھ خوش رہے، آمین۔ کاشی بھائی میں یہ خط بستر پر پڑا اور لینا لکھ رہا ہوں اللہ کریم نے اپنے خاص فضل و کرم سے نوازا اور ایک خوفناک ریڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں میری جان بھائی اس پاک ذات کا کروڑ ہا شکر ہے بہت بڑے نقصان سے بچ گیا۔ صرف ہیر کی ہڈی ٹوٹی اور چونٹیں آئیں۔ میں خصوصی طور پر 1122 کا دلی ممنون اور شکر گزار ہوں اور خراج تحسین پیش کرتا ہوں جو حادثے کے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد پہنچ گئے۔ مجھے بڑی بس کے نیچے سے نکالا۔ ابتدائی طبی امداد ضروری انجکشن لگا کر اسپتال شفٹ کیا۔ دل سے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

دسمبر 2016ء

کوین
برائے
احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال
کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: _____

مکمل پتا: _____



دسمبر 2016ء

کوین
برائے
اشاعت
کہانی

میں نئی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے
بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: _____ تعداد صفحات: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

قون ریل نمبر: _____



دسمبر 2016ء

کوین
برائے
پسندیدہ
کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار
کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اول، عنوان: _____ مصنف: _____

دوم، عنوان: _____ مصنف: _____

سوم، عنوان: _____ مصنف: _____

نام: _____ شہر: _____

WWW.PAKSOCIETY.COM

دفعہ چوتھی کہانیاں

22

ذہیر ساری دعائیں نکلیں۔ اس سروس سے منسلک تمام اپکاراں کے لیے جو چوبیس گھنٹے خدمت کے جذبے سے سرشار ہمہ وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔ اللہ کریم اس سروس کو قائم کرنے والے اس کو چلانے والوں کو اجر عظیم سے نوازے اور آخرت میں سرخرو فرمائے (آمین)۔ اسپتال سے گھر آگیا ہوں اور میری یہ نئی کہانیاں سے محبت ہے کہ باوجود تکلیف کے خط لکھ رہا ہوں۔ نومبر کا شمار عشق نمبر یکم تاریخ کو موصول ہوا۔ دل خوش ہو گیا۔ ویسے تو خوب سے خوب تر کے مصداق ہر مہینے معیار براہ رہا ہے۔ مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سال 2016ء میں شائع ہونے والے تمام شماروں میں نومبر کا شمار دسب سے بہترین، شاندار اور نمبر ان ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سرورق سے لے کر کہانیوں اور ہائیڈ پارک کا انتخاب نہایت عمدگی سے کیا گیا۔ بالخصوص یہ سب کاشی کی دن رات انتھک محنت اور لگن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میری طرف سے ذہیر ساری مبارکباد قبول فرمائیں۔ شاد لاکھ کی یاد میں منزا بہن نے بہت عمدہ ادارہ یہ لکھا۔ کاشی جی نے احوال میں انسانیت کے احترام اور پیار کے حوالے سے محبت کا لازوال پیغام دیا۔ جزاک اللہ۔ میں آپ کے اسی پیغام کے نتیجے میں ان سب لوگوں کو معاف کرتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ زیادتیوں کیں، فانی اذیت پہنچائی۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں ہے اگر کسی کا میری وجہ سے دل دکھا ہو دل آزاری ہوئی ہو اگر کوئی مجھ سے ناراض ہے تو میں ان سب احباب سے معافی مانگتا ہوں۔ یہ زندگی چاروں کی ہے ہم نے محبتوں کے پھول کھلانے ہیں۔ اس بار فیصلہ زندہ بھئی اپنے بہترین خط اور تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت سنبھالے ہوئے تھے۔ میں انتخابی ممنون اور شکر گزار ہوں اپنے انتخابی قابل صد احترام اور محترم القام بھائی جناب عبدالعزیز جی آ صاحب کا جنہوں نے اپنی بے لوث پر خلوص محبتیں بچھ لاری ہیں۔ آپ نے سب بہن بھائیوں نے احوال میں بہت خوب صورت بہت عمدہ تبصرے لکھے۔ اقبال بانو "ایک تھی زینہ" کے عنوان سے بہت شاندار کہانی تحریر کی۔ "راحت نرک" میں محمد بلال فیاض نے محبت کی راحت نرک کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا۔ کنول عمران خان بہت عرصے کے بعد "عشق یقین ہے" کے عنوان سے بہت اعلیٰ اور بہترین کہانی لے کر آئیں۔ کنول بہنا ویلڈن۔ منہی بھر خوشیاں تمہیں بس، نجم، محرش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا، منسل کے ساتھ بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ عبدالغفار عابد "ایں قربیں چکایا ہے" کے عنوان سے مختصر مگر پراثر اچھی کہانی نے کر آئے۔ صابر کا انٹرویو بہت زبردست لگا۔ بے غیرت کہیں کی۔ بارگاہ عشق میں Love2016، عشق کے کوہسار، یہ کیسی محبت، اختلاف تو قلع اچھی کہانیاں تھیں۔ "عشق کی شاخ کا آلو" بہت مزے دار کہانی تھی۔ "ہائیڈ پارک" میں نمرہ ملک، معاویہ عنبرونو، شہب رخص، اصنامہ بشیر اور نسیم احمد آکاش کے انتخاب بہت اچھے تھے۔ پسند آئے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔

لکھنے بھائی! سلامت رہے! خدا تعالیٰ آپ کو جد مکمل صحت یابی عطا کرے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ آپ ہمارے قارئین کے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ تبصرہ شاندار کیا آپ نے۔

مٹا سرگودھاتے ہمارے بہت پیاری شاعر! بہن صائمہ بشر کی احوال میں آمد۔ لکھتی ہیں۔ "امید ہے سب شیریت سے ہوں گے۔ سب کے لیے دعا گو ہوں اقبال بانو بہت منجھی ہوئی لکھاری ہیں اگر یہ وہی اقبال بانو ہیں جن کو میں بہت سالوں سے پڑھ رہی ہوں "ایک تھی زینہ" بہت اچھی کہانی تھی (جی! اقبال بانو ایک ہی ہیں) زینہ نے بہت اچھا کیا جو اپنے شوہر کو معاف کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ عورت کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد جو شوہر کی صورت میں ہو عورت اس کو بھول نہیں سکتی۔ ممتاز احمد نے بھی بہت اچھا موضوع چنا۔ عورت اور مرد کی عزت برابر ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف کہ دار عورت کا ہی مضبوط ہو مرد پر بھی لازم ہے کہ اپنے کردار کی حفاظت کرے۔ برائی کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ عبرت نگاہ ہونا چاہیے۔ ضرغام محمد کی "منجھی بھر خوشیاں تھیں"

بھی بہت اچھی لگی۔ زوار کا فیصلہ بہت اچھا تھا۔ عبدالغفار عابد کا ”یوں قرض چکا یا ہے“ بھی متاثر کن تھی۔ حنا بشری نے بھی اپنی کہانی کے ساتھ انصاف کیا۔ محبت اور عشق میں یہی فرق ہے کہ محبت مجبور یوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور عشق جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ باقی احوال بھی بہت دلچسپ ہیں۔ سیکس غزالہ، صائمہ مجید۔ محبت غفار، عبدالعزیز نے ممتاز احمد پر بہت ہی بھاری بھر کم تبصرہ کیا، اچھا لگا۔ ممتاز احمد ہے ہی بہت اچھا لکھاری اس کی ہر تحریر بہت ہی سبق آموز ہوتی ہے۔ باقی سب بہن بھائیوں کو بھی بہت پیار اور سٹم اور کاشی بیٹا آپ کی تو کیا بات ہے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔“

اچھے ارے ارے آپ! یہ کیا کہہ دیا! سورج کو چراغ دکھانا بہت بڑی بات ہے۔ بس کوشش یہی ہے کہ میرا ہر لکھاری اردو ادب کا نامور لکھاری، محترم ہو جائے (آمین)۔

ملا جناح کا لونی فیصل آباد سے بشری کنوں کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ”ماہ نومبر کا عشق نمبر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ارے کاشی اتنا شاندار پرچہ دیا واہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔ کیا زبردست پرچہ تھا۔ احوال میں آپ کی باتوں نے دل مڑھ لیا۔ بہت خوب صورت جذبات اور احساسات آپ نے احوالیوں سے شیر کیے۔ ان باتوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے میری پسندیدہ فنکارہ صبا قمر کا انٹرویو لگا کر میرا دل جیت لیا۔ واہ کیا کہنے آپ کے۔ بس آپ اسی طرح ہر ماہ کسی نہ کسی شوبز کے ستارے کا انٹرویو شائع کرتے رہیں۔ شمارے میں شامل تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ جن میں ایک تھی زینو، کم بخت عشق، رامت ٹریک، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں، عشق زندہ رہے گا، 2016، بارگاہ عشق میں اور عشق کے کوہسار بہت اعلیٰ پائے کی کہانیاں تھیں۔ بہت اچھی لگیں۔ صائمہ بشری کی غزالہ بہت پسند آئی۔ میں صائمہ جی کو ایک پیغام دینا چاہوں گی کہ وہ اپنی شاعری کا مجموعہ کلام ضرور شائع کروائیں۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ سب احوالی ہمیشہ پیار اور محبتیں بانٹتے رہیں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔“

اچھے پیاری بہن! آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ ادھر صبا قمر کے انٹرویو نے آپ کا دل جیتا ادھر آپ کے تبصرے نے ہمارا دل جیت لیا۔

ملا کوٹ مومن سے فرزاد گل رض گزاریں۔ ”میں آپ کی بہت مشکور ہوں آپ مجھے بے پناہ عزت دیتے ہیں اور احوال میں جگہ دیتے ہیں اللہ آپ کو خوش رکھے۔ عشق نمبر بہت شاندار رہا۔ مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا اور شکر ہے کہ ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ اس ماہ بہت زیادہ مصروفیت ہے۔ ابھی شمارہ پڑھنا شروع کیا ہے مگر اپنا وعدہ نبھانا رہی ہوں اور احوال میں حاضری کے لیے چند سطریں لکھ رہی ہوں۔ صرف چند ایک کہانیاں پڑھ سکں۔ ارم ناز کی ”Love 2016“ کیا خوب لکھا۔ اقبال بانو کی ”ایک تھی زینو“ بہت شاندار کہانی تھی۔ ممتاز احمد نے ”کم بخت عشق“ ایک شاہکار کہانی تخلیق کی۔ بہت پسند آئی۔ سید ملازم حسین شیرازی کی کہانی ”عشق کے کوہسار“ زبردست کہانی تھی۔ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو اس وجہ سے مزید تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

اچھے فرزاد! خوش رہو۔ بہت اچھا لگتا اگر پورا پرچہ پڑھ کر تبصرہ کرتیں۔ امید ہے اگلے ماہ مکمل تبصرہ موصول ہوگا۔

ملا تنزیہ عرف ثانی مندی بہاؤ الدین سے لکھتی ہیں۔ ”سچی کہانیاں کا عشق نمبر موصول ہوا۔ پرچہ بہت شاندار اور منفرد تھا۔ انشاء اللہ معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ مقبولیت کی بلند یوں کو چھو رہا ہے لیکن اس بار موضوع کے اعتبار سے جدا پرچہ تھا۔ سب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ خاص طور پر ایک تھی زینو، کم بخت عشق، رامت ٹریک، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، عشق زندہ رہے گا اور Love 2016 شمارے کی بہترین کہانیاں تھیں۔ رائٹرز نے

سانچہ ارتحال

ہمارے لکھاری ساتھی شعبان کھوسہ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ دکھ کی ان کھڑیوں میں شعبان کھوسہ کے ساتھ ہے اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

خوب لکھا اور عشق کے حوالے سے عشق کے جذبے کو کہانیوں میں سمودیا۔ "بارگاہ عشق میں" اور "عشق کے کوہسار" بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ آخر میں سچی کہانیاں کی دن دو گئی اور رات چو گئی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

پیارے عزیز! پرچہ اتنا اچھا لگا اور تبصرہ اتنا مختصر خوش رہو۔
ہند گلشن کالونی، جھنگ روڈ فیصل آباد سے ہماری دور رس قاری غزالہ کرن احوال میں شامل ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "چار تاریخ کو سچی کہانیاں ملا تو دل سے آواز نکلی آگیا وہ شاہکار جس کا تھا انتظار۔ واہ عشق نمبر کیا زبردست شمارہ ہے دل خوش ہو گیا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اقبال بانو کی کہانی "ایک تھی زینو" بہت کمال کی کہانی تھی۔ دل میں اتر گئی۔ ممتاز احمد نے "کم بخت عشق" شاندار کہانی لکھی۔ خاور میاں نے شادی شدہ عورت سے عشق لڑا کر ٹامک کنواہی اور مورا کہیں بے چاری، حق قتل ہو گئی۔ محمد بلال فیاض کی "راحت تریک" خوب رہی۔ "دیمک زدہ محبت" اچھا تاثر قائم نہ کر سکی۔ "عشق یقین ہے" کنول عمران خان کی بہترین اسٹوری تھی۔ منشی بھر خوشیاں تھیں بس، نجم، بحر ش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا، بے غیرت کہیں کی بارگاہ عشق میں اچھی کہانیاں تھیں۔ Love2016 ارم ناز نے آج کل کے گھٹالو پر بہت بہترین کہانی جگہ تجزیہ لکھا۔ "عشق کے کوہسار" سید ملازم حسین شیرازی کی ایک سنگینی تحریر تھی۔ بہت اچھی لگی۔ "ہائیڈ پارک" میں صائمہ بشر کی غزالہ بہت اچھی لگی۔ اچھا کاشی جی اب اجازت چاہوں گی۔"

پیارے عزیز! تبصرہ اچھا لگا، بس لڑکی اب تم اپنی آمد اسی طرح مستقل بنائے رکھنا۔
ہذا اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور احوال میں دیگ انٹری دے رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "بس مجھے تو کسی سے بات ہی نہیں کرنی۔ تو اور کیا کس قدر خوشی تھی کہ رسالہ ملا احوال میں دیکھا تو کہیں میرا ذکر ہی نہیں۔ مطلب میں سب کو بھول گئی ہوں، ایک ایک خط میں نے غور غور سے پڑھا مگر..... اف..... مجھے نہیں پتا اور ایڈیٹر صاحب آپ زیادہ اترایا مت کریں یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ سالوں بعد ایک اسٹوری لگاتے ہیں آپ وہ بھی دو جج کی کہ عظمیٰ خوش ہو جائے گی (دیکھو لڑکی! ہم تو تمہیں یاد رکھتے ہیں نا.....) کہنا یاد رہوں گی میں کسی کو..... رانا حبیب الرحمن بھائی آپ بہت اچھے ہو باقی مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی بس.....! ایڈیٹر جی "ہیرا بھٹا" مزے کا لگا "دیمک زدہ محبت" ویسے اعجاز احمد فکرال آپ نے کیا کیا۔ قسم سے وہ اتنی اچھی تھی کیوں کیا اس کے ساتھ ایسا۔ بہت ہی دل دکھ گیا میرا۔ مرد کتنے ظالم ہوتے ہیں، ہر احساس سے عاری..... تو پہ! "منشی بھر خوشیاں تھیں بس" ضرغام محمود عمدہ اسٹوری ایڈ کو مزید حسین بنا گئی۔ سچ ہے محبت قربانی کا ہی تو نام ہے، اچھا لگا پڑا کر۔ شروع سے آخر تک اسٹوری پر گرفت زبردست رہی۔ واہ کمال سر جی۔ عبدالغفار عابد آپ تو چھانچے "یوں قرض چکا یا ہے" لکھ کر۔ میرے پاس وہ لفظ نہیں جو اس جذبے کو سراہے ہوئے لکھ سکوں۔ جی یہی تو ہے محبت۔ دوسروں کے لیے جینا قسم سے بہت اچھی لگی اسٹوری۔ آپ کی مزید تحریروں کا شدت سے انتظار رہے گی سر جی۔ ارم ناز کی "Love2016" حق ادا کر دیا محترمہ ایسا ہی ہو رہا قسم سے زبردست کمال کی لیلی..... زمانے کی کیا عکاسی کی واہ۔ محترمہ اقبال بانو صاحبہ کی تحریر "ایک تھی زینو" سچی کہانیوں میں بہت منفرد اور الگ۔ حق رنگ میں نظر آئی۔ محبت کے سب رنگ بھر دیئے آپ نے۔ لفظوں کی خوشیوں نے پورے رسالے کو پیٹ میں لے رکھا تھا واہ زبردست اسٹوری۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم وہ

جذبات احساسات نہیں لکھ پاتے اسلوری پڑھ کر جو کہ اس کے شایان شان ہوتے ہیں۔ آپ سب کی: تنگ منہوں کے لیے واقعی الفاظ کم پڑنے لگتے ہیں۔ یہ سب آپ کی محنتیں ہیں کہ ہم سب دور ہوتے ہوئے بھی ساتھ ہیں۔ چاہے ایک ماہ بعد ہی ملتے ہیں۔ "ہائیز پارک" میں نوشی نیڈانی متاثر کر گئیں۔ کیا ملا محبت میں؟ شاید کچھ نہیں متا محبت سے سچ ہے۔ صائمہ عراج کا "میں مصروف رہوں" بھی بہت مزے کا لگا۔ شعبان کھوسہ کا شعر تیر نیم کش میں اچھا لگا۔ تو پھر چلتی ہوں رب را کھا۔ خوش رہے آباد رہے شاد رہے ذمہ ساری دعا میں آپ سب پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے۔ ایڈیٹر صاحب سوچیں گے سچی کہانیاں لائے آپ ہمارے لیے۔"

بہ پیاری عظمیٰ! اپنا بہت خیال رکھو۔ ہمیشہ کی طرح یہی دعا تمہارے لیے کہ ہمیشہ مسکراتی رہو۔ تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔ ملا اسلام آباد سے ہماری بہت پیاری آنٹی ریکسہ خالد کا مختصر نامہ ہمارے پاس ہے۔ لکھتی ہیں۔ "بیٹے کاشی کراچی آکر تم سے ملاقات نہیں ہو سکی جس کا افسوس ہے۔ ہمیں رسالہ دیر سے ملتا ہے اس لیے خواہش کے باوجود احوال میں شریک نہیں ہو سکی۔ اکتوبر کا رسالہ تم نے بھیجا بہت بہت شکریہ۔ میری کہانی "سپائی والا رستہ" کو جن جن لوگوں نے پسند کیا۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ رسالہ دیر سے منے کے باوجود میں نے تقریباً سب کہانیاں پڑھ لیں۔ سچی نے بہت اچھا لکھا لیکن چند کہانیاں مجھے بہت پسند آئیں جن میں یوں قرض چکا یا ہے۔ اے غیرت کہیں کی، خلاف توقع، بارگاہ عشق میں بہت پسند آئیں۔"

بہ پیاری آنٹی! آپ سے نہ ملنے کا مجھے بھی بہت افسوس ہے مگر کیا کریں یہی چیزیں خدا کی مرضی کو ثابت کرتی ہیں۔ بس آپ کی محبت ہمارے لیے ساتیان ہے۔

ملا سکھر سے زنانوں بعد محمد راشد فرہاد کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ "امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں آپ کے رسالے سچی کہانیاں میں اپنا کلام بھیجا کرتا تھا اور آپ میرا کلام شائع بھی کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے سے میں مصروف بہت رہا، اپنی پہلی کتاب شاعری کے حوالے سے، جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں اور امید کرتا ہوں آپ کو میری کتاب پسند آئے گی۔ یہ میرا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ آپ کی رائے کا بھی انتظار رہے گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

بہ اچھے فرہاد! بس ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آپ تو بھول ہی گئے کہ ہم بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے آؤ گراف والی کتاب تو ہم بھی پڑھنا چاہتے تھے مگر ہم بھلا تمہیں کہاں یاد رہے بھائی۔

ملا فیصل ندیم بھٹی کا محبت نامہ ہمیں موصول ہوا ہے چک۔ نمبر 58 شمالی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ "ماہ نومبر کا سچی کہانیاں عشق نمبر کا انتظار کرتے کرتے پانچ نومبر کو مل ہی گیا۔ واہ اس بار تو نا کھل میں خوب صورت مائل اور صبا قمر عشق نمبر کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ مزہ سہام کے ادارے میں شاد لاکھ کی موت کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ احوال کے آغاز میں کاشی چوہان کا عشق نمبر میں عشق اور محبت کے بارے میں مختصر تبصرے نے گویا کوزے میں سمندر کو سدا دیا ہے۔ کاشی بسیا بالکل محبت تو محبت ہے ناں۔ احوال میں نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید۔ جن میں عمران علی سنی، یوسف راجپوت، ام حبیبہ صادق آباد سے سید ملازم شیرازی، حسن نظامی، بشری کنول، ممتاز احمد، حنا بشری، مجید احمد جانی، صائمہ مجید کے تبصرے بہترین تھے، مسز نوید ہاشمی کو سلام۔ عبدالعزیز جی آ صاحب احوال میں واپسی پر جی آیاں لوں۔ رانا حبیب الرحمن انشاء اللہ آپ عنقریب ہم سب دوستوں میں ہوں گے۔ ارم خان صاحبہ! اللہ تعالیٰ آپ کو حافظہ قرآن بنائے، آمین۔ مزید تالی تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پچھنے ماہ آپ کے شہر منڈی بہاؤ الدین سے گزر کر گیا تھا۔ فرزانہ گل، نذابت انشال، حسن نظامی، منصورہ بلوچ، شاکنول، مسز نوید ہاشمی کو سلام اور دعا، سدرہ



میں کس جگہ
سچی کہانیاں

کے چہرے نہیں
آپ سچی کہانیاں کے خریداریں کو ملک کو
نہیں بدلہ دیجیے

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

155 امریکی ڈالرز	ایران	155 امریکی ڈالرز	کویت
155 امریکی ڈالرز	سری لنکا	155 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
155 امریکی ڈالرز	جاپان	155 امریکی ڈالرز	یو اے ای
155 امریکی ڈالرز	لیبیا	155 امریکی ڈالرز	مصر
155 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	155 امریکی ڈالرز	یونان
155 امریکی ڈالرز	جرمنی	155 امریکی ڈالرز	فرانس
155 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	155 امریکی ڈالرز	برطانیہ
155 امریکی ڈالرز	پولینڈ	155 امریکی ڈالرز	ناروے
165 امریکی ڈالرز	کینیڈا	165 امریکی ڈالرز	امریکہ
165 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	165 امریکی ڈالرز	افریقہ

ذرائع

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

انور علی کہاں غائب ہو گئی ہیں؟ سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کی تقریب کی تاریخ کا اب دسمبر میں اعلان کر دی ہیں۔ احوال کے آخر میں کاشی بھائی نے "ہیرا انجھا" کی کہانی موجودہ حالات کی عکاسی کر رہی ہے۔ زبردست ویسے یہ ہے سچی بات جناب۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تمبرے کی طرف۔ "لائف بوائے" زبردست رہی۔ وینڈن لائف بوائے شیمو۔ "ایک تھی زینو" اقبال بانو۔ زینو کی مصطفیٰ سے محبت بے مثال تھی، محبت ہو تو زینو جیسی۔ "کم بخت عشق" ممتاز احمد، عشق کی کم بختی اور بربادی کی بہترین داستان ہے۔ دیمک زدہ محبت، عشق یقین ہے، مٹھی بھر خوشیاں تھیں بس، انجم سحرش اور حسینہ، عشق زندہ رہے گا۔ یادگار کہانیاں تھیں۔ "زرد لومڑی" زبردست چن رہا ہے۔ مٹھل کے ساتھ، بے غیرت کہیں کی بارگاہ عشق میں Love 2016، عشق کے کوہسار، یہ کیسی محبت، اختلاف، توقع، عشق کی شاخ کا الو اچھی کہانیاں تھیں۔ کاشی چوہان کا "زہر عشق" پڑھ کر ہوش و حواس کھو جاتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے زبردست ناول آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شوہر کے منہ پر مباحثہ، دور حاضر کی باصلاحیت اور مشہور اداکارہ کی حالات زندگی، ان کی عادات سے آگاہی ہوئی۔ "مسئلہ یہ ہے" میں باباجی کے فیض سے ہزاروں لوگوں کی حالات زندگی بدلتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ باباجی کی صحت اور عمر دراز عطا فرمائے، آمین۔

کچھ اچھے فیصل! سچ مانو تمہاری پرچے سے محبت دیکھ کر تمہارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، خوش رہو۔
 ہمارے ہمارے بہت پیاری آپنی رضوانہ کوثر شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ "اچھے کاشی! یقین کرو ہیرا کاشی کہانیاں جب آیا تو سرورق دیکھ کر ہی "نا شاء اللہ" منہ سے نکلا تھا اور پھر جب پرچے کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔ منظرہ! سچی کہانیاں اپنے جوہن پر ہے۔ تم مبارک باد کی مستحق ہو۔ یقیناً تمہارے اعتماد اور محبت نے آج سچی کہانیاں کو اس مقام پر لا کر کیا ہے کہ پہلا سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ جیسا سنگ میل عبور ہونے جا رہا ہے۔ خوش رہو۔ خدا کرے کہ ترقیوں کا یہ سفر تا ابد جاری رہے، (آمین)۔ کہانیوں میں ٹاپ کلاس کہانیاں اقبال بانو کی "ایک تھی زینو" ممتاز احمد کی "کم بخت عشق" ایم حسن نظامی کی "انجم، سحرش اور حسینہ" حنیف عاصم بلوچ کی "عشق زندہ رہے گا" ایڈیسن کی "بے غیرت کہیں کی" حنا بشری کی "بارگاہ عشق میں" اور شمیم ظاہر بیٹ کی "عشق کی شاخ کا الو" ٹھہریں جب کہ ارم ناز کی "Love 2016" فیصل منظور کی "یہ کیسی محبت" عظمیٰ شکور کی "خلاف توقع" جمیل مجمل کی "مٹھل کے ساتھ" محمد بلال فیاض کی "رائٹ ٹریک" بھی بہتر تھیں۔ جب کہ انجیز احمد فکرا ل کی "دیمک زدہ محبت" اور سید ملازم حسین شیرازی کی "عشق کے کوہسار" بس سو سو تھیں۔ منظرہ سہام کا اداریہ "نا شاء لاکھ بہت یاد آؤ گی" خوب تھا جب کہ احوال اپنی مثال آپ ہے۔ نظم "ہیرا انجھا" ایک شاہکار نظم تھی۔ جیتے رہو۔ "زرد لومڑی" زبردست اٹھانچ کر رہی ہے تو "زہر عشق" میں بھی عشق نے لچل مچا رکھی ہے۔ محمود شام کا سفر نامہ بھارت ہمیں 70ء کی دہائی میں لے جاتا ہے جب ہم بھی ان تمام حالات سے باخبر تھے۔ "لائف بوائے" میں احمد اعوان کا اعتماد واقعی دیکھنے لائق ہے۔ اس بار بھی زبردست کہانی لائی ہیں آپ۔ "ہائیڈ پارک" اور "تیرنیم کش" زبردست رہے۔ اب میرا خیال ہے تمبرہ مکمل ہوا اور مجھے دیں اجازت، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔
 کچھ اچھی رضوانہ آپنی! آپ کے اس تمبرے نے یقیناً مانیں بہت شاد کیا۔ بس اسی طرح ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آجایا کریں۔ اپنی طبیعت کا بہت خیال رکھیے گا۔

ہمارے پیارے بھائی مجید! جانی امتنان شریف سے لکھتے ہیں۔ "پیارے ممتاز احمد کا ایکسڈنٹ ہوا، دل رونے لگا، کتنے لمحوں خاموش گم مسم سار رہا۔ یہ سطر یہ لکھتے ہوئے پیارے محترم عبدالعزیز جی صاحب کی کال آئی۔ مدتوں بعد لوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی، اللہ کرے ممتاز احمد صاحب اور جہاں کہیں بھی اہل مسلم مشکلات تکلیف میں ہیں، ان سے نجات

دے۔ (آمین)۔ ماہ نومبر 2016 کا نچی کہانیاں کزن کے ہاتھوں منکوا یا۔۔۔ سردرق خوبصورت تھا اور عشق کی خوشبودے رہا تھا۔ ادارہ خوب تر تھا اور احوال کی محفل میں کاشی بھائی سب احوالیوں کو اپنے ارد گرد یوں بٹھائے ہوئے ہیں جیسے استاد کے گرد طالب علم ہوتے ہیں۔ ایک طویل غیر حاضری کے بعد عبدالعزیز جی آ کی آمد ہوئی۔ دل پور پور خوش ہو گیا۔ جن ساتھیوں نے مجھے یاد رکھا، میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں، مشکور و ممنون ہوں۔ ”ہیرا پنجا“ نظم خوب رہی۔ عشق نمبر کی کہانیوں کی بات کی جائے تو سپر سٹ، کم بخت عشق، مزدوے مئی، ایک تھی زینو، رائٹ ٹریک، ادیمک زدہ محبت، عشق یقین ہے، ہنسی بھر خوشیاں تھیں بس، عشق زندہ رہے گا، ٹیم، بحر ش اور حسینہ، محفل کے ساتھ، عشق کے کوہسار، خلاف توقع، عشق کی شاخ کا انوار ہے غیرت کہیں کی کمال کی تحریریں تھیں۔“

کچھ پیارے مجید! خدا تمہیں مصروف رکھے! ”اسطنت عشق“ کے لیے معذرت۔ انشاء اللہ ایوارڈ تقریب میں ہی تم سے ملاقات ہوگی۔

ہذا ملتان سے ہماری پیاری بھابی صائمہ مجید لکھتی ہیں۔ ”آداب! ماہ نومبر کا نچی کہانیاں جلد ہی مل گیا۔ نائل اچھا اور دل کو لہما نے دالا تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ ادارہ مزد سہام نے اچھا لکھا۔ احوال میں کاشی بھیا کی باتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ کاشی بھیا! سرتاج کا زیادہ اثر کیا ہوتا ہے۔ چارون کی زندگی گانی ہے، خوش رہیں اور خوش رہنے دیں۔ احوال کی محفل رنگ برنگے پھولوں سے مچی تھی اور کہانیوں کی مگری پھولوں کی مہکار میں مہک رہی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ پھول قطار در قطار ٹھوم رہے تھے، لہرا رہے تھے۔ کس کہانی کو اڈل کہوں، کس کو ددم؟ ایک سے ایک بڑھ کر تحریریں تھیں۔ عشق نمبر میں زہر عشق نے بھی خوب ذرا یاد رکھا۔ سفر نامہ خوب جا رہا ہے، زرد لومڑی بھی ٹھیک جاسوسی میں لگی ہوئی ہے۔ عشق نمبر تو ریکارڈ بنا گیا اب کون سا نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔“

کچھ پیاری بہن! خوش رہو تمہارے تھوڑے سے محبت بھرے لفظوں نے بھی ہمیں خوش کر دیا۔ مجید سے کہو اتنا مصروف نہ رہے۔ اپنی صحت کا بھی خیال رکھے۔

اور پیارو! اس آخری خط کے ساتھ ہی ہمارے اس ماہ تک کے احوال کا اختتام ہوا۔ پندرہ نمبر 3 کیسا لگا آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ اجازت سے قبل تازہ ترین نظم آپ کی نذر.....

راستے کھو گئے ہیں

زخم زخم بدن ہو گیا ہے	اجزی پڑی ہے
لہورس رہا ہے	اس لال سہاگ سی زندگی کو
قاتل گولیوں میں چھپے ہیں	کوئی ہاتھ پکڑ کر
دریا پہاڑ جبر نے	موت پار نہ کر رہا ہے
سب رس رہے ہیں	کیا سفید پر جوں کے سب راستے
زخموں کے سارے راستے	مقدس لبوں سے دعا ہو کر
ورد کے نشانوں میں	کھو گئے ہیں؟؟
نیلے نیلے بادل بن کر اڑ رہے ہیں	آپ کا اپنا
زندگی.....	کاشی چوہان
ہک یو سڑک کی طرح	

لائف بوائے ہر مہم میں ساتھ نبھائے

(اسماء اعوان)

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں



مجھے بچپن ہی سے ایڈو پنچر پسند رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کو وہ پتا تھے جبکہ می نے بھی ملکی سطح پر کئی کھیلوں میں سنور اور گولڈ میڈلز لے رکھے تھے۔ میرے لیے یہ سب باتیں خواب ناک تھیں۔ میں ہمیشہ خود کو ہواؤں میں اڑتا پہاڑیوں پر چڑھتا یا جنگل بیابانوں میں سفر کرتا محسوس کرتی تھی۔ ڈیڈی سے جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ہمیشہ ہی مجھے نال دیا۔

”ننھی پری! تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں معلوم ہے پہاڑوں اور جنگلوں میں موجود تتلیاں اور جگنو چھوٹی چھوٹی پریوں کے بال لے جاتے ہیں اپنی ملک کے پاس۔“ ڈیڈی مجھے ڈراتے۔

”مگر میری ننھی پری کے بال کوئی بھی نہیں لے کر جاسکتا۔“ می مجھے گود میں بٹھا کر میرے بال سہلاتے ہوئے کہتیں۔

”کیوں بھی! تم کیسے یہ دعویٰ کر سکتی ہو۔“ ڈیڈی بھند ہو جاتے اور عینک کی اوٹ سے انہیں

گھورتے۔
”کر سکتی ہوں۔“ می ڈیڈی کو گویا چیلنج دیتیں۔
”راز بتاؤ۔“ ڈیڈی اب بھی اپنی بات پر قائم ہوتے۔

”مائی چیلنج از مائی نیو لائف بوائے شیمپو!“ می ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتیں۔

”ہم م م! اتنا بھروسہ ہے آپ کو اپنے لائف بوائے شیمپو پر۔“

”بالکل! بلکہ خود سے بھی زیادہ۔“ می مسکراتے ہوئے یقین سے کہتیں۔

”چلو پھر ہم اپنی ننھی پری کے 10th اسٹینڈرڈ تک جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر آپ کے لائف بوائے شیمپو کو بھی آزمالیں گے۔“

”شیور! آئی ایکسیپٹ یور چیلنج، مسز ڈیڈی!“ می ڈیڈی کو چڑاتے ہوئے کہتیں۔ میں حیرت سے ان دونوں کی تکرار پر انہیں ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہی ہوتی۔

خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت
جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب
شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے
ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آ رہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم
سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہوگی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

03225494228

abbasnadeem283@gmail.com

مزید معلومات کے لیے رابطہ

ابرو نیلہ اقبال، سحرش ملی نقوی، آمنت رشید، ملائکہ خان، نندیم عباس ڈھکو،
نہت جنیں شیہ، نور بخاری، رحیمانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

سلسلہ انچارج

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوئی، سعودی
عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے
ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں
کنیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے پہلے ہے کہ
آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک
03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ
مفتاب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

"ممی! پاپا مجھے کوہ پیا کیوں نہیں بنانا چاہتے۔"
میں اُس وقت 3rd اسٹینڈرڈ میں تھی جب یہ سوال میرے منہ سے نکلا تھا۔

"تم سے بہت پیار جو کرتے ہیں۔"
"مطلب!" میں ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھتی تھی۔ سو حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ان کی کوہ پیا نے ان کے بالوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے مگر کوہ پیا کے شوق نے ان سے ان کے بال لے لیے۔" ممی میرے بالوں کو سہلاتی ہوئی بولی تھیں۔

"مگر ممی....." میں نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ممی جیسے ٹرانس کی کیفیت میں تھیں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"میری ننھی پری کوہ پیا بنے گی، ریس میں بھی حصہ لے گی، سیاحت بھی کرے گی، کیونکہ اس کے بالوں کی حفاظت کے لیے میرے پاس لائف بوائے شیمپو جو ہے۔ اس کے استعمال سے بال دیکھیں 30 فیصد زیادہ گھنے، مضبوط اور صحت مند۔"

"ممی..... لائف بوائے میں ایسا کیا ہے جو یہ اتنے سارے کام اکیلا کر لیتا ہے۔"

"میری ننھی پری لائف بوائے شیمپو کا نیا اسٹراٹج اینڈ تھک شیمپور وغن بادام (Almond Oil) ملک پروٹین (Milk Protein) کی طاقت لیے بالوں پر اپنا کام کرتا ہے۔ اور بال بوجاتے ہیں اس کے استعمال سے اور لمبی گھنے اور بھی مضبوط اور بھی سلکی۔"

وقت کا کام گزرتا ہے آج جب میں 10th اسٹینڈرڈ کے پیپرز کے بعد گھر آئی تو سیاحت کے شوق نے مجھے بچپن کی وہی ننھی پری بنا دیا تھا۔

میری وشن پوری ہونے جا رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر ڈیڈی اور ممی نے مجھے اور رازی بھیا کو تاپا ابا کے ہاں بھیج دیا۔ جہاں ہم دونوں بہن بھائی تین دن کے ہمالیہ فورسٹ کی سیر والی مہم پر روانہ ہو رہے تھے۔ ممی نے میرا بیگ تیار کر دیا تھا۔ اور خاص تاکید کی تھی کہ بالوں کو کھلانہ چھوڑیں اور جیسے ہی وقت ملے فوری طور پر نیو لائف بوائے شیمپو سے بال دھو کر انہیں فریش رکھیں۔ ممی نے رازی بھیا کی کو بھی لائف بوائے شیمپو کے استعمال کی تاکید کی تھی۔ شام کو ہم تاپا ابا کے ہاں روانہ ہو گئے۔ جہاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

☆.....☆.....☆

جو گرز کے تھے باندھ کر میں ننھی اور دے پاؤں کمرے سے نکلی سب گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے میں تائی جان سیج لیے کھڑی تھیں مجھے دیکھ کر حوصلہ افزا انداز میں مسکرائیں اور کچھ پڑھتے ہوئے پھونکا، رازی بھی آن پہنچا اور مسکراتے ہوئے میرے ساتھ کھڑا ہو گیا تائی جان نے آیت الکرسی کا حصار باندھا اور دونوں کی پیشانی چوی۔

"میری جان! بہت دیکھ بھال کر احتیاط سے جانا بہت ہی گھنا جنگل ہے، ادھر سانپوں کی بہتات ہے اور پہاڑ بڑے ڈھلوان ہیں۔" کہتے ہوئے بڑی سی نارنج اور تھرموس پکڑا دیا۔

"لو بھئی اس میں کافی ہے تم لوگ تو پریوں کے دیس جا رہے ہو راستہ جتنا خطرناک ہے یادیں اتنی ہی حسین۔"

رازی نے ہنس کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"چنچلیں۔"

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔

"تائی جانی میں نہیں جاتی۔"

”اوہو..... اب ایسے بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں! چلو جلدی کرو۔“ وہ پلٹ کر چلی گئیں۔
گیٹ سے نکلے تو تایا جان کھڑے تھے۔ انہوں نے رازی کو ایک خوب مضبوط واکنگ اسٹک پکڑا دی۔
”پستول تو رکھ لیا ہے نا؟“ انہوں نے رازی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
”جی.....“ رازی نے جینز کی پاکٹ تھپتھپائی۔
”فکر نہ کریں ہماری پری تو ویسے بھی بہادر ہے اور شیردل رازی بھی ساتھ ہے۔“ رازی بھائی اکڑ کر بولے۔

تایا جان نے جھک کر میرے فق چہرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔

☆.....☆.....☆

”بہادر لوگ ہی سراٹھا کر جی نکلتے ہیں، اچھا میں تو مسجد جا رہا ہوں اذان ہونے والی ہے۔“
”میں نے بھی وضو کر لیا ہے تاکہ اس پر خطرہم میں اگر کوئی بات ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے پاس با وضو پہنچوں۔“ رازی کی آواز میں شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن میرے روٹے کھڑے ہو گئے۔
”تایا جان ادھر جنگل میں بڑے خوفناک سانپ ہوتے ہیں۔“ میں نے بمشکل کہا۔
”رازی ساتھ ہے، فکر نہ کرو اللہ حافظ۔“ اور وہ مسجد کی سڑک پر چل دیے۔

”اور کیا! شیردل رازی ساتھ ہو تو فکر کیسی؟“ کہتے ہوئے رازی نے مجھے کھینچا اور ہم سڑک چھوڑ کر کچے راستوں پر اتر گئے۔ اُس نے بائیں ہاتھ میں میری کلائی اور روشن نارنجی تھالی ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ میں واکنگ اسٹک جس سے راستے کے جھاڑ جھنکار ہناتے ہوئے تیزی سے ایسے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ مجھے بھاگنا پڑ رہا تھا، چند منٹوں میں ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ رازی نے نارنج کی

روشنی اور تیز کردی۔ سامنے سے کچھ خرگوش بھاگ نکلے کچھ پرندے درختوں میں سے پھڑپھڑاتے ہوئے نکل کر اڑتے چلے گئے دفعتاً رازی نے ٹھٹھک کر مجھے کھینچ لیا اور ہاتھ بڑھا کر اوپر کی طرف زبردست وار کیا۔ ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے دو لمبے سانپ شراپ سے اچھل کر دور جا گرے اور درختوں میں غائب ہو گئے مارے خوف کے میری سانس رک گئی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔“ رازی نے مجھے منہمک پا کر حوصلہ دیا اب ہم تیزی سے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اونچی نیچی گھنٹیاں گھنے درخت اور گنجان جھاڑیاں کئی جگہ سانیوں کی پھنکار سنائی دی لیکن ہم بنا رُکے نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرتے چلے گئے۔ پھر جڑھائیاں شروع ہوئیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے جڑھتے چلے گئے۔ دور سے اذان کی آواز آنے لگی پھر اسے لگا کہ درخت اور جھاڑیاں چھٹ گئیں اور نسبتاً کھلی جگہ آ گئی، ہم سانس لینے کو رُک گئے۔ رازی نے نارنج اطراف میں گھمائی، ہم ایک چھوٹے سے سطح مرتفع پر کھڑے تھے جو اونچے پہاڑوں اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا تھا کچھ دیر بعد سانس اور حواس بحال ہوئے تو محسوس ہوا کہ فضا میں پرندوں کی چہکار گونج رہی ہے، سرد ہوا کے جھونکے سینے میں شرابور وجود کو حیات بخش رہے تھے ایک سمت آسمان پر صبح صادق کی دو وہیا سفیدی ابھر رہی تھی۔ کچھ عجیب سحر انگیز ماحول تھا۔

”چلو نماز پڑھ لیں۔“ رازی نے آرام سے کہا اور دو وہیا آسمان کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گیا اور نیت باندھنے لگا۔ میں نے وضو کیا ہوا تھا۔ جلدی سے دوپٹہ لپیٹا اور پیچھے کھڑی ہو گئی، پاکیزہ لطیف ہوا کے جھونکوں سے روح سرشار ہو رہی تھی۔ اور دوران نماز اللہ تعالیٰ کی قربت کا احساس اس قدر بھرپور

قرب آتے گئے ہمارے ارد گرد آگے پیچھے دائیں بائیں ہم اُن میں گھر گئے۔

”اُف میرے خدا.....“ مارے حیرت کے میری سانس رک گئی۔

”یہ تو تتلیاں ہیں سینکڑوں ہزاروں۔“ بمشکل میرے لبوں سے نکلا وہ ہمارے آس پاس اڑتی ہوئی پوری فضا میں چھا گئیں۔ سورج کی کرنوں میں ان کے چمکدار پر رگمین ستاروں کی طرح چھپا رہے تھے۔ حیرانی اور خوشی نے مجھے بے خود کر دیا میں ہنس رہی تھی۔ کھلکھلا رہی تھی۔

”رازی‘ رازی کتنا حسین ہے یہ سب کچھ اتنا پیارا اتنا نوکھا بالکل خوابوں جیسا۔“

”ہاں خوابوں جیسا‘ لیکن ہے تو حقیقت اس طرح خواب حقیقتوں میں ڈھلتے ہیں۔“

وہ میرے ہنستے چہرے کو دیکھ کر طمانیت سے مسکراتے رہے تتلیاں اڑتی رہیں بکھرتی رہیں بالآخر ہماری نظروں کی حدود سے نکل گئیں۔

”یہ دراصل ایسی عمارت گھائی ہے جس سے نیم تاریک گہرائیوں میں پھولوں کی گود میں ہزاروں لاروے پیدا ہوتے ہیں اور نشوونما پا کر تتلیوں کا روپ دھار لیتے ہیں یہاں بیشی خوشبو والے پھولوں کی افزائش ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ جگہ تتلیوں کا مسکن بنی رہتی ہے رات بھر یہ چنانوں سے چمپی رہتی ہیں اگر سورج نکلتے وقت دھماکے جیسی آواز پیدا کی جائے تو اس کی گونج سے گہرا کر تڑپ کر اڑتی ہوئی نکلتی ہیں اور یہ انوکھا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے یہاں آس پاس بکثرت سانپ پائے جاتے ہیں اس لیے یہ عام لوگوں کی گزر گاہ نہیں اس گھائی کوتا یا جان نے دریافت کیا۔ اور تتلیوں کی بہار دیکھنے کا طریقہ بھی اُن ہی کی ایجاد ہے میں جب بھی ادھر آتا ہوں یہ نظارہ دیکھے بغیر نہیں جاتا۔ کیوں کیسا لگا؟“ رازی

محسوس ہو رہا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سلام پھیر کر میں نے سر جھکا لیا‘ دست فطرت نے جیسے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

”پری! آنکھیں کھولو دیکھو تو چیزیاں اور رنگین پرندے کس طرح اڑ رہے ہیں ذرا دیکھنا سورج کس شان سے طلوع ہو رہا ہے۔ تم ساری دنیا کو بھول جاؤ“ بس یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہوا سے کسی کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔“

اب میں نے دیکھا ہم پہاڑوں سے گھرے ہوئے کنوئیں نما گہری گھاٹی کے اندر ایک چوڑی چٹان پر بیٹھے تھے جس کے نیچے اتھاہ اندھیرا اور گہرائی تھی۔

”اُف کتنی خوفناک جگہ ہے۔“ مجھے جھرجھری آ گئی۔

”خوفناک؟ یہ چٹان بہت محفوظ ہے۔ بھی ذرا سر اٹھا کر قدرت کے حسن کو تو دیکھو۔“

”اوہ‘ میرے خدا.....“ میں مبہوت ہو گئی پہاڑوں کے کنارے سے نورانی کرنیں اُجالا بکھیرتی اُتر رہی تھیں۔ ہمارے اطراف سبز پوش پہاڑوں کا تنگ گھیراؤ جس کے وسط میں اُن گنت چھوٹی چھوٹی آبشاریں گر رہی تھیں ہر طرف لمبی گھاس میں سے پیارے اچھوتے پھول سر ابھارے جھوم رہے تھے۔ گہنیں کہیں کاسنی اور نیلی مارنگ گھوری کی بلیں لہرا رہی تھیں۔ پھولوں کی مست خوشبو اور پرندوں کے نغمات نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ میں مسحور ہو گئی۔

”اب دیکھو۔“ رازی نے چپکے سے کہا اور گہرائیوں میں نیچے کی جانب پستول سے ایک فار کیا۔

”تڑ..... تڑ..... تڑ..... اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر دھماکوں کی طرح اس کی گونج سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اچانک جیسے جگنوؤں کے مرغولے

گم رازی کا ایک ایک لفظ قطرہ شہنم کی طرح میرے
دل پر گر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تین دن کی اس خطرناک ایڈ ونچر سے بھرپور مہم
جوئی کے بعد ہم دونوں بہن بھائی گھر آ پہنچے تھے۔
"میری ننھی پری!" ڈیڈی نے مجھے اور بھیا کو
گٹھے سے لگالیا۔

"یقین جانو تم دونوں کی غیر موجودگی میں گھر
کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ آج تم نے ثابت کر دیا
ہے کہ تم لوگوں میں ایک سیلانی روح پوری شدت
کے ساتھ موجود ہے۔" می ہماری نظر اتارتے
ہوئے بولیں۔

"می! یہ دیکھیے آپ کے لائف بوائے کا کمال۔"
میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور اس کے ساتھ ہی میری
لائف بوائے بال جیکتے ہوئے لہرانے لگے۔
"اس مائی چیٹنج، مسٹر ڈیڈی۔" می نے مجھے
ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے..... میرا بھروسہ میرا چیٹنج، میرا اعتماد
میرا لائف بوائے شیمپو کا کمال، ہر سفر میں، بالوں کا
محافظ ہر مہم میں اپنے ملک پر دشمن اور Almond
Oil والے اجزاء کے ساتھ بالوں کی خوبصورتی اور
نشوونما میں اضافہ کرتا ہے۔"

"سچ ہے لائف بوائے شیمپو ہم سب کے
بالوں کا محافظ ہے۔" رازی بھیا نے ہیٹ اتارا تو
ان کے بال بھی شائن کر رہے تھے۔

"کاش میں نے بھی لائف بوائے شیمپو
استعمال کیا ہوتا....." ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے کہا تو می نے اُن کی بات کاٹ دی۔
"تو پریاں کبھی آپ کے بال نہ لے کر
جاتیں۔" می کے اس جملے پر سب ہنسنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

نے کہا۔
"اچھا اسی لیے تم اپنا گھر چھوڑ کر تایا جان کے
گھریار بار جانے کی ضد کرتے ہو۔" میں نے چپک
کر کہا۔

"بالکل بالکل سسٹ! یہی وجہ ہے۔ ڈیڈی کی کوہ
پینی میرے خون میں شامل ہے۔"
"خدا میرے بھائی کو سلامت رکھے۔" میں
نے کہا اور کیپ کو مضبوطی سے سر پر جمالیا۔

"یہ رنگ برنگے پھول! یہ سبزہ رازیہ آ بشاریں اور
تغلیوں کی بہار! کیسا انوکھا منظر تھا رازی! یہ جگہ واقعی
پریوں کا دہلیز ہے، ہائے دنیا کتنی خوبصورت ہے۔"
میں نے کھولی کھولی نظروں سے ماحول کو دیکھا۔

"پری! یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا بے
حد حسین بنائی ہے ہر قدم پر فطرت کے جلوے
بکھرے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں اور
خوشیاں ہر گام پر نیم پوشیدہ ہیں۔ بات صرف سمجھنے
اور قدر کرنے کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہزار آزمائشوں
کے باوجود انسان دنیا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

میں اس کی شکل دیکھنے لگی۔ اُن کے لہجے کی
نرماہٹ اور آنکھوں کی شفقت میرے دل کی
گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

"پری! کسی کی زندگی محض پھولوں کی سچ نہیں
ہوتی۔ ہر ایک کو اپنے نصیب سے پھول بھی ملتے
ہیں اور کانٹے بھی۔ بس ہمیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے
کانٹے ہٹا کر راہ حیات کو گلزار بنانے کی سعی میں
لگے رہنا چاہیے یہ بھی تو دیکھو فطرت کے حسن سے
ہمیں کس قدر راحت ملتی ہے۔ محنت کر کے تھک
جائیں۔ جدوجہد میں ناکام ہو جائیں یا آزمائشوں
سے گھبرا جائیں تو فطرت کے حسن میں مامتا جیسی
راحت ملتی ہے۔"

میری آنکھیں رازی پر تھیں اور ذہن سوچ میں

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں !!

آئیے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جائیے۔



یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے.....

خود کو منوائیے، اپنے قلم سے.....

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہوں نے اور لرزنا دینے

والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان

واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان

واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھائیے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز

سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمائیے۔

ماہنامہ رچی کرکھلا لڑیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتہ:

88-C- خیابان جامی وٹھنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نمایاں شخصیات، بچے واقعات

خواب گلاب اور خوشبو

احمد سجاد بابر



مٹی کے بدن میں سوئے کادل لیے دنیا کے اسٹیج پر لا بانی کردار ادا کرنے والی شہزادی کی امیر بھڑی داستان حیات

کے ساتھ ساتھ اس کی جھولی میں محرومیاں بھی تھیں،
گمشدہ بچپن

تھا، کھوکھلے

رشتے تھے

اور مصنوعی

چمکا

تھی، کے

معلوم تھا کہ کیم

جولائی 1961

میں سیندر

میں نواب گھرانے

میں جان پسر کے گھر

جنم لینے والی بچی شہرت

دوام پائے گی، اس کا

خاندان بچے کی خواہش

میں تھا، اس وجہ سے ایک

ہشتے تک بچی کا نام ہی تجویز

نا کیا جا سکا، آخر کار بچی کے

لئے ”ڈیانا فرانسس“ کا نام

منتخب کیا گیا۔ ابھی ڈیانا نے

اس کے پاس سب

کچھ تھا جو فتح کر لینے کے

لئے کافی تھا، بحر انگیز

شخصیت، طلسماتی

شہرت، غزال آنکھیں

، سرو قامت، شہابی

رنگت۔۔۔ شاہی

خاندان سے جڑا

فسوں۔۔۔ دنیا اس

کی دیوانی تھی، اس

کی ایک ایک

مصروفیت پر نظر

رکھی جاتی تھی،

میڈیا اس کی

ایک جھلک

پانے کے

لئے بے

تاب نظر

آتا تھا، وہ

چھا جانے کے لئے ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس

ویژن پر براہ راست دکھائی گئی، چھ لاکھ لوگ سڑکوں پر شاہی جوڑے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ اس کے بعد سے شہزادہ چارلس اور ٹیڈی ڈیانا مسلسل اخبار نویسوں اور ٹی وی رپورٹروں کی زد میں رہے۔ شہزادہ چارلس سے ڈیانا کے دو بیٹے ہوئے، شہزادہ ولیم اور شہزادہ ہنری۔

بہت کچھ لینے اور بہت کچھ دینے کے باوجود، دنیا بھر کی دولت، عزت اور ناموری قدموں میں ڈھیر ہونے کے باوجود، ہر طرح کی آسائش زندگی میسر ہونے کے باوجود، حسن و جمال کے بے پناہ خزانے کی مالک ہونے کے باوجود، ڈیانا ایک بد نصیب عورت تھی۔ ایک ایسی بد نصیب عورت جو ساری عمر حقیقی پیار کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ شادی کے وقت ڈیانا کی عمر 20 سال اور شہزادہ چارلس کی عمر 40 سال کے لگ بھگ تھی۔ عمروں کا یہ فرق ان کی سوچ میں بھی ظاہر ہوا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد تک تو انہوں نے اپنے اختلافات کو کامیابی سے چھپائے رکھا لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ اختلافات نمایاں ہونے لگے اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب 1992 میں ان کے درمیان علیحدگی ہوئی اور بعد ازاں اگست 1996 میں طلاق ہو گئی۔ سن علیحدگی اور طلاق کی مختلف وجوہات بیان کی گئی لیکن ان میں سب سے نمایاں وجہ یہ تھی کہ شہزادہ چارلس اپنی ہم عمر ایک خاتون "کیلا پارکر" کے عشق میں بری طرح جلا تھا۔ ساری دنیا کو اس بات کی خبر ہو گئی اور شہزادہ چارلس نے بھی ڈیانا کی طرف اپنی بے اعتنائی کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ شہزادی ڈیانا نے مختلف فلاحی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر ان معاملات سے اپنی توجہ ہٹانا چاہی لیکن بالآخر دونوں کے درمیان طلاق ہو کر رہی۔ شہزادہ چارلس کی خود غرضانہ داستان کا آغاز 1971ء میں ہوتا ہے جب کامیلا نامی ایک خوبصورت لڑکی سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کا معاشرہ تقریباً ڈیڑھ سال چلا۔ دلچسپ بات یہ کہ کامیلا اسی دوران ایک اور جوان "اینڈریو پارکر" سے بھی عشق لڑا رہی تھی۔ جب ملکہ ایلزبتھ نے

پیارے لئے تربیتے ہوئے عمر گزاری۔ اس کی عمر سات سال تھی جب اس کے والدین میں طلاق ہو گئی، وہ اس دوران میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی رہی، اس کے والد نے عدالت کے ذریعے اس کو ساتھ رکھنے کے حقوق حاصل کر لئے، اس طرح وہ اپنے والد کے پاس آ گئی، اس کی والدہ نے 1969 میں دوسری شادی کر لی، اس کے والد نے بھی اپنے لئے نیا جیون سا بھی منتخب کر لیا، اس طرح ڈیانا بچپن سے ہی ایک خلا لئے ہوئے پٹی بڑھی، نو سال کی عمر میں ہی ڈیانا کو ہاسٹل میں رہنا پڑا، وہ پڑھائی میں کمزور تھی، وہ دو بار اولیول میں ٹل ہوئی، وہ بنیادی طور پر ایک شرمیلی لڑکی تھی، اسے موسیقی سے دلچسپی تھی اور چٹانو بھانے میں مہارت رکھتی تھی، اس کے علاوہ وہ تیراکی پر بھی عبور حاصل تھا، اس نے کھانا پکانے کا کورس بھی کیا، کم آمدنی والی نوکریاں بھی کیں، ڈانس انسٹرکٹر کے طور پر بھی کام کیا، مختلف تقریبات کے لئے میزبان کی نوکری بھی کی، سکول ٹیچر کے طور پر بھی کام کیا، اپنی اٹھارویں سالگرہ پر اس کی والدہ نے اسے ایک فلیٹ تحفے میں دیا۔ اس طرح وہ زندگی کے نئے موڑ پر پہنچ گئی جہاں ایک دنیا باز وکھولے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سینئر فیملی کے شاہی خاندان سے بہت قریبی روابط تھے۔ ڈیانا کی پرنس آف ویلز "چارلس" کے ساتھ پہلی ملاقات نومبر 1977 میں ہوئی، شہزادہ چارلس ڈیانا پر مرعوب، وہ اسے اپنی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ نومبر 1980 میں شاہی خاندان سے اس کی ملاقات کرائی گئی جہاں اسے بہت پسند کیا گیا، شہزادہ چارلس نے اسے 6 فروری 1981 کو شادی کی پیشکش کی جو ڈیانا نے قبول کر لی، اسے بارہ کیرٹ نیلم اور چودہ ہیروں والی انگوٹھی تحفے میں دی گئی جو پوری دنیا میں کاپی کی گئی، منگنی کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی اور شاہی محل میں منتقل ہو گئی۔ 29 جولائی 1981 کو بیس سال کی عمر میں برطانوی عہد شہزادہ چارلس سے شادی کے بعد وہ دنیا بھر کی خبروں کا مرکز بن گئی۔ یہ شادی جو اس وقت تک صدی کی سب سے بڑی تقریب تھی ٹیلی

کامیلا کو بطور بہو قبول کرنے سے انکار کیا
تو اس نے اینڈریو سے شادی
کر لی تاہم شہزادہ چارلس اور
کامیلا ملتے جلتے

رہے۔ 1981ء میں
شہزادے نے حسین
و جمیل شہزادی ڈیانا
سے شادی کر لی
تاہم شادی کے
بعد بھی شہزادے
نے کامیلا سے
ملنا جلنا جاری
رکھا۔ شہزادی ڈیانا
اپنی دلچسپیوں
میں مگن رہنے
والی لڑکی تھی اور
وہ سنجیدہ مزاج
شہزادے
سے
مطابقت نہ
کر سکی۔
چنانچہ
شہزادہ

Downloaded From paksocietyty.com

چارلس اپنی محبوبہ کی سمت
جھٹکتا چلا گیا۔
1992ء میں
آخر کار
انکشاف ہوا
کہ شہزادہ
چارلس اور کامیلا
نے شادی شدہ اور
بال بچے ہونے کے
باوجود ناجائز
تعلقات استوار
کر رکھے ہیں۔
اس انکشاف نے
برطانیہ بھر میں
شہزادے اور کامیلا
کو بدنام کر دیا۔
شہزادے کو ”دھوکے
باز شوہر“ اور برے باپ
کے القابات سے یاد کیا
جانے لگا اور دسمبر 1992ء
میں شہزادی ڈیانا کے شاہی محل کو
خیر باد کہنے کی وجہ بھی یہی مجاشقہ
بنا۔ بیگم کے ساتھ بے وفائی نے
نہ صرف شہزادہ چارلس کی
نیک نامی کو نقصان پہنچایا
بلکہ برطانوی شاہی
خاندان بھی
متاثر ہوا۔

برطانیہ میں عام
لوگ سوال
کرنے
لگے کہ
ان کا
پیسہ
آوارہ

مزاج اور بگڑے شہزادوں کے لئے تللوں پر کیوں خرچ ہوتا ہے!!

☆.....☆.....☆

ویلز کی شہزادی ہونے کا اعزاز پا کر وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔ اس بات کا اظہار اس نے 1983 میں سب کے سامنے کر دیا کہ میں خود کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتی ہوں۔ ہسپتالوں، یتیم خانوں، بوزھوں کے مراکز اور غریب خواتین کے لیے قائم مراکز میں جا کر ان کے ساتھ وقت گزارنا لینڈی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس کی ذاتی زندگی میں کیا اور کتنا برا تھا اس سے قطع نظر ہو کر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس ایک خاتون کی وجہ سے کتنے پریشان حال لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں آئیں۔ 1989 میں بچوں کے لیے "گریٹ آرموڈ ہسپتال فار چلڈرن" کے نام سے ادارہ قائم کیا اور اس ہسپتال میں خیرات کی رقم سے مستحق بچوں کا علاج شروع کیا۔ اس ہسپتال کے قیام کے بعد ڈیانا نے دنیا بھر کے دورے کیے۔ غریب اور لاوارث بچوں پر اس نے خصوصی توجہ مرکوز کی اور اپنی ذاتی خیرات سے اس فلاحی کام میں حصہ ڈالا۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، صومالیہ، مشرق وسطیٰ، سوڈان اور دیگر کئی ممالک میں رنگ و نسل، مذہب و ملت کا فرق کیے بغیر اس نے مدد کی۔ ڈیانا نے اپنے ساتھ دنیا کے کئی خیراتی اداروں اور محضر حضرات کو شائع کیا۔ پاکستان میں عمران خان کے شوکت خانم ہسپتال کی چندہ مہم میں بھی ڈیانا نے بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے متعدد مسلمان ممالک نے ڈیانا سے فائدہ اٹھایا، ڈیانا نے اپنی فلاحی سرگرمیوں کا بیشتر حصہ مسلمانوں کو دیا۔ وہ جہاں جاتی مسلم خواتین اور بچوں کو گلے لگاتی، مسلمانوں کے غریب، کالے اور بظاہر گندے لباس والے بچوں کو اٹھاتی، انہیں اپنی گود میں جگہ دیتی اور مسلمانوں کے بچوں کو ایسے چومتی جیسے وہ اپنے ولیم اور ہیری کو چومتی تھی۔ تاریخ کے البم میں ایک ایسی تصویر بھی موجود ہے جب ایک پاکستانی بچے کو کالے ماتھے کو چومتے ہوئے ڈیانا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈیانا نے دنیا سے بارودی سرنگوں کے خاتمے

کے لئے بھی مہم چلائی۔ بلاشبہ مٹی کے بدن میں سونے کا دل لئے، دنیا کے سٹیج پر ڈیانا ایک لافانی کردار تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر شہزادی کی زندگی میں دوبارہ سے بہار اترنے لگی، اس کے دل میں پیار کی چنگاری پھوٹی جو جلد ہی الاؤ بن گئی جو اندر ہی اندر ڈیانا کو جلائے جا رہا تھا، ڈیانا لاہور سے تعلق رکھنے والے پاکستانی ہرٹ سرجن حسنا خان سے دیوانہ وار محبت کرتی تھیں، ڈاکٹر حسنا معروف دانشور اشفاق احمد کے بھانجے تھے، وہ اس کے پیار میں پاگل تھیں، اس کی خاطر وہ برطانیہ چھوڑنے اور پاکستان میں قیام پر غور کر رہی تھیں۔ ڈیانا کا اصرار تھا کہ حسنا اس سے خفیہ شادی کرے اور وہ حسنا سے بیٹی کی خواہش مند تھیں لیکن حسنا نے خفیہ شادی سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان کے دو بار دورے میں ڈیانا نے حسنا کے خاندان سے خفیہ ملاقاتیں کیں، وہ شادی کیلئے ان کی والدہ کو راضی کرنا چاہتی تھیں، مگر حسنا کی والدہ اس پر رضا مند نہیں تھیں۔ عمران خان کی سابق اہلیہ جمائما کہتی ہے کہ حسنا کی والدہ اس بات پر رضا مند نہیں تھی کہ ان کا بیٹا ایک انگریز خاتون سے شادی کرے، کسی انگریز لڑکی سے شادی ہر قدامت پسند پشتون ماں کے لئے ایک برے خواب جیسی ہوتی ہے۔ آپ تعلیم کے لئے بیٹے کو برطانیہ بھیجیں اور اس کی واپسی انگریز دلہن کے ساتھ ہو یہ ایک خوفناک بات ہے، جمائما خان نے بتایا کہ "ڈیانا حسنا خان سے دیوانہ وار پیار کرتی تھیں اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں، اس کیلئے وہ پاکستان میں بھی رہنے کو تیار تھی، شہزادی ڈیانا نے عمران خان کے اسپتال کے فنڈ ریزنگ کیلئے دو بار پاکستان کا دورہ کیا اور دونوں مرتبہ ہی وہ حسنا سے شادی پر بات چیت کیلئے ان کی ٹیلی سے خفیہ طور پر ملنے گئیں، ایک بار دورہ پاکستان میں ڈیانا نے عمران خان کی بہنوں علیہ اور رانی کے ساتھ وقت گزارا اور میڈیا کی نظروں سے بچنے کیلئے انہوں نے ماڈل ناؤں تک ان کے گھر جانے کے لئے خود گاڑی چلانے کا فیصلہ کیا، ڈیانا ان کے گھر کا پتہ زبانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کر کہیں نہیں نکل سکیں گے۔ ان کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ وہ پاکستان میں جا کر رہیں کیونکہ پاکستان میں

جانتی تھی، ٹریک جام کی وجہ سے ان کی گاڑی پھنس گئی جیسے ہی لوگوں نے ڈیانا کو پہچانا، انہوں نے کار کی طرف اشارے کیے اور ہاتھ لہرائے، جس پر ڈیانا پریشان ہو گئی، تاہم حواس برقرار رکھتے ہوئے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے مسکراتی رہی اور ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ تعلقات کی قربت میں شدت کے ساتھ ہی ڈیانا اور حسنا نے شادی اور بچوں کے متعلق بھی تبادلہ خیال کیا۔

ڈیانا کی ایک اور قریبی دوست ایلین کا کہنا ہے کہ ڈیانا نے اپنی دونوں دوستوں کو بتایا تھا کہ وہ حسنا



پریس لوگوں کو زیادہ تنگ نہیں کرتا۔ شہزادی ڈیانا پاکستان گئیں اور عمران خان کی برطانوی بیوی جمائمہ خان سے مشورہ کیا جس کے بعد انہوں نے یہ تاثر لیا کہ شہزادی کے لیے پاکستان میں رہنا

ممکن نہیں ہے۔ شہزادی ڈیانا درحقیقت پاکستانی ڈاکٹر کے عشق میں مبتلا تھیں۔ ڈیانا نے

اپنی دوست کو بتایا تھا کہ ہر کوئی مجھے فروخت کرتا ہے لیکن حسنا ایسا شخص ہے جو مجھے فروخت

سے ایک بیٹی چاہتی ہے۔ وہ حسنا سے خفیہ شادی چاہتی تھی لیکن حسنا اس منصوبے سے خوف زدہ تھیں۔ ڈاکٹر حسنا سمجھتے تھے کہ شہزادی ڈیانا کیساتھ شادی کے

بعد پریس ان کو برطانیہ میں چین سے نہیں رہنے دے گا اور اگر وہ ان کی اولاد ہوئی تو وہ بچوں کو لے



نہیں کرے گا۔
 ”ڈیانا سے میری پہلی ملاقات 1995 میں ہوئی تھی۔“

ڈاکٹر حسنا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔
 ”میں اس وقت رائیل برٹن اسپتال میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور میرا مضمون دل کے امراض تھے۔ یعنی میں دل کا ڈاکٹر تھا۔ اس وقت میری عمر 36 سال تھی۔ یہاں ڈیانا اکثر آتی تھی اور یہاں سے ہماری ملاقاتیں شروع ہوئیں جو بعد میں تعلق داری میں بدل گئیں۔“
 حسنا کھوئی کھوئی آواز میں یادوں کے الہم کے صفحات پلٹ رہا تھا۔

”ڈیانا نے مجھے کوڈنام آرمانی وے رکھا تھا اور خفیہ رابطوں کے لئے یہی نام استعمال ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ شاہی خاندان کی بہو تھی اور یہ سب کچھ خفیہ ہی رکھنا تھا۔ میں یہ بتانا چلوں کہ 2006 میں، میں نے پاکستان میں ہی ایک اور شادی کی تھی مگر وہ بھی ناکام رہی اور ختم ہو چکی ہے۔ یہ مکمل طور پر رائج شادی تھی اور رشتہ داروں میں ہی ہوئی تھی۔“

ڈاکٹر حسنا خلا میں سکتے ہوئے بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

”ممبر اور لیڈی ڈیانا کا تعلق دو سال تک رہا آپ اسے رومانس کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چلا کہ ڈیانا کی شدید خواہش تھی کہ اس کی ایک بیٹی ہوئی، اس کے دو بیٹے تھے مگر وہ بار بار کہتی تھی کہ اس کو بیٹی کی ضرورت یا خواہش ہے۔ شاید وہ مجھے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ شادی کے بعد ہم اللہ سے دعا کریں گے کہ ہمیں ایک بیٹی عطا کر دے۔“

ڈاکٹر حسنا نے ذرا تھمتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی

”بہر حال میں یہ بتا رہا تھا کہ میری اور ڈیانا کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی۔ اس ملاقات میں، میں نے ڈیانا کو اپنے گھر مدعو کیا، یہ ایک رسمی سی دعوت تھی مگر ڈیانا نے اسے فوری طور پر قبول کر لیا۔ میرا گھر ایسٹ لندن میں سٹریٹ فورڈ میں تھا۔ بس اس ملاقات کے بعد ہماری دوستی گہری ہو گئی اور پھر ہم کھانا کھانے باہر ایک

ساتھ جانیلیگے اور اس سے ہماری دوستی محبت میں بدل گئی۔ یہ ایک نارل برطانوی محبت تھی جیسا کہ عام برطانوی سمجھی کرتے ہیں۔ اس دوران ہمارے درمیان شادی کے لئے کئی بار مباحثے ہوئے۔ ڈیانا نے کئی بار شادی کی بات کی مگر میں اسے یہ سمجھا تا رہا کہ اس سے میری زندگی پر بہت گہرا اثر پڑے گا کیونکہ بہر حال وہ ایک شہزادی ہے اور دنیا میں سب سے مقبول خاتون بھی۔ ہم ایک نارل زندگی صرف پاکستان میں ہی گزار سکتے تھے اور میں نے اسے یہ بات بتائی تھی مگر ہمارے درمیان کی ایک بات پر اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ یعنی اس بات پر تو اتفاق تھا کہ ہماری شادی ہونی چاہئے مگر کہاں، کب اور کیسے پر اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ اس دوران ڈیانا کے ذاتی خادم بنکر نے ایک پیر صاحب سے ملاقات بھی کی تاکہ وہ دعا کریں اور کسی طرح ہماری شادی ہو جائے۔ یہ آئیڈیا ڈیانا کا تھا میرا نہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ علم نہ تھا پھر اچانک ڈیانا نے بتایا کہ وہ جادو گروں اور پیروں کی خدمات حاصل کر رہی ہے تاکہ کسی طرح ہماری شادی ہو جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈیانا بس آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ شادی کرنے پر زور دے رہی تھی اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں وہ سوچنے پر تیار نہ تھی۔ بس اسی بات پر ہماری بحث ہوتی تھی کہ ہم آنکھیں بند کر کے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں ایک بات اور، ہمارے درمیان بھی یہ نہیں طے ہوا تھا کہ ڈیانا مجھ سے شادی کے لئے اسلام قبول کر لے گی۔“

ڈاکٹر حسنا بیٹھے بیٹھے انہی ایام میں پہنچ چکا تھا۔
 ”ڈیانا سے دوستی اور تعلق کے دوران مجھے بہت دھمکیاں ملتی رہتی تھیں، اس دوران ڈیانا کی والدہ نے بھی اس سے بات چیت بند کر دی تھی کیونکہ وہ اس کی میرے ساتھ دوستی اور تعلق پر بہت ناراض تھی۔ اس وقت تک سب کچھ نارل ہی چل رہا تھا مگر مجھے اچانک لگا کہ ڈیانا نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ یا شاید وہ مجھے حسد میں مبتلا کر کے اکساتا جا رہی تھی تاکہ میں اس کے لئے شینڈلوں۔ وہ ایک ون چھٹی گزارنے الفائد کے پاس گئی اور جہاں اس کے بیٹے ڈوڈی سے ملی اور

یقیناً یہ مجھے برا لگا۔ میں نے ڈیانا کو کہا کہ وہ الفائد کے بیٹے ڈوڈی سے کہیں مل رہی ہے؟ اس بات پر ہمارے درمیان سختی پیدا ہوئی مگر ڈیانا کا کہنا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور وہ ایک نارمل سی ملاقات تھی۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ کوئی ہے جو ہمارے درمیان تعلق ختم کرانے کے لئے اس قسم کی سازشیں کر رہا ہے اور اسی نے یہ ملاقات طے کرائی تھی مگر ڈیانا اسے ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ میں نے بہر حال ڈیانا کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنی تباہی کے راستے پر چل رہی ہے۔ اس سختی کے بعد ہمارے درمیان دراڑ پیدا ہو گئی اور ڈیانا ڈوڈی کے پاس چلی گئی۔ کاش میں اسے روک لیتا، میں روک سکتا تھا۔

ڈاکٹر حسنا کی آواز میں لاکھوں ان کہے پچھتاوے تھے۔

میں جب بھی غریب بچوں کا اپریشن کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈیانا میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ تم ان بچوں کی مدد کر کے بالکل ٹھیک کر رہے ہو۔

ڈیانا کی دوست روزا کا کہنا ہے کہ ڈیانا

سے تعلق توڑنے میں حسنا نے پہل کی۔ کہ جہانم کا کہنا ہے کہ ڈیانا نے تعلق ختم کر دیا کیونکہ حسنا نے شادی سے انکار کر دیا

ڈاکٹر حسنا سے دور ہونے کے باوجود ڈیانا اسلام اور مسلمانوں سے دور نہ رہ سکیں۔ اب ان کی دوستی ایک ارب پتی

Downloaded From
paksocietyty.com

عرب بزنس مین کے امیر کبیر بیٹے دودی القاند سے ہو گئی۔ ان دونوں کا ساتھ موت تک رہا۔

اگست 1997ء کی رات لیڈی ڈیانا دودی فائد کے ساتھ رٹرن ہوٹل، پیرس سے لندن جانے کو نکلی۔ گاڑی رٹرن ہوٹل میں سکیورٹی کا ڈپٹی چیف ہنری پال چلا رہا تھا۔ ہوائی اڈے جاتے ہوئے بیس ڈی لائیکورڈناں زیر زمین گزر گاہ سے گزرے۔ اس گزر گاہ میں ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا کہ اس کی وجہ سے کار ہنری پال کے قابو سے باہر ہوئی اور وہاں موجود ستون سے ٹکرا گئی۔ دودی فائد اور ہنری پال تو فوراً ہلاک ہو گئے۔ یہ خوفناک واقعہ رات 12 بج کر 23 منٹ پر رونما ہوا۔ حادثے سے قبل سفید فیت اور شہزادی کی مرسیڈیز کے مابین ٹکڑ بھی ہوئی۔ نتیجاً فیت کی پچھلی جی ٹوٹ گئی اور کچھ روغن بھی مرسیڈیز سے جا چٹا۔ تاہم دونوں کاریں اور موٹر سائیکلوں والے جانے وقوعہ سے باآسانی فرار ہو گئے۔ البتہ خاصے لوگوں نے کاروں کو تیزی سے فرار ہوتے ضرور دیکھ لیا۔ ٹکراؤ کے بعد وہاں سے گزرتے کچھ لوگوں نے گاڑیاں روک لیں اور کار سے زخمیوں کو نکالنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر ہیلز بھی شامل تھا۔ اس نے بعد ازاں بتایا کہ شہزادی ڈیانا ٹھیک ٹھاک مگر صدمے کی حالت میں تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر آدھے گھنٹے بعد جائے حادثہ پر پہنچا، حالانکہ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایسولینس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں کہیں بھی پہنچ جاتی ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہسپتال لے جانے کے بجائے ڈیانا کا علاج وہیں کرتے رہے اور ایک بج کر 41 منٹ پر ایسولینس جائے حادثہ سے روانہ ہوئی۔ یوں علاج میں غیر معمولی تاخیر کے باعث لیڈی ڈیانا کو پہنچنے والی اندرونی ضربات بگڑ گئیں اور جان لیوا ثابت ہوئیں۔ چار بجے صبح شہزادی چل بسی اور اپنے کرداروں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ گئی۔ نئی زندگی سے قطع نظر شہزادی ایک محبت کرنے والی خوب صورت خاتون بھی جس نے پہلے اپنی خوب صورتی اور پھر انسان دوست سرگرمیوں کی وجہ سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ وہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر حسنا کو بھی چاہتی تھی۔ افسوس کہ

جاں طلب اور متعصب برطانوی شاہی خاندان کی سازش کا شکار ہو گئی۔

اس واقعے کی خبر پھیلنے ہی برطانوی فرانسیسی میڈیا راگ الاٹنے لگا کہ یہ ”حادثہ“ تھا۔ فرانسیسی و برطانوی پولیس نے بھی بالآخر اسے ”حادثہ“ ہی قرار دیا۔ پولیس تفتیش

کاروں کا دعویٰ ہے کہ ہنری پال نشے میں تھا۔ لہذا وہ تیز رفتاری میں کار سنبھال نہ سکا اور حادثہ انجام پایا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ان کی اور متحاققین کی کاروں کے درمیان ایک ریس شروع ہو گئی جس کا انجام ایک سرنگ میں دودی اور ڈیانا کی گاڑی کے خوفناک ایکسیڈنٹ پر ہوا۔ اس حادثے میں لیڈی ڈیانا اور دودی دونوں ہلاک ہو گئے۔ ڈیانا عالم رنگ و بو کی ساری رنگینیاں اور خوشبوئیں چھوڑ چھاڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئی۔ تاہم دودی کے والد اور مصری نژاد برطانوی ارب پتی، محمد القاند نے اسے حادثہ نہیں قتل قرار دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ شہزادی کو اس لیے مارا گیا تاکہ وہ ایک مسلمان (دودی) سے شادی نہ کر سکے۔ نیز ڈیانا کے سینے میں کئی شاہی راز دفن تھے۔ ان کا نام و نشان منانے کی خاطر شہزادی کا قصہ تمام کر دیا گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کو مختلف معانی اور مفاد پر پہنائے گئے جس میں ایک یہ بھی شامل تھا کہ لیڈی ڈیانا اصل میں اسلام قبول کرنے والی تھی جو کہ برطانیہ کے ارباب اختیار کو پسند نہ تھا اور انہوں نے لیڈی ڈیانا کو ایک حادثے میں ہلاک کر دیا۔ شاہی ملازم نے یہ بھی کہا کہ اس نے شہزادی ڈیانا کی ماں کو یہ کہتے سنا۔

”تم مسلمان مردوں کے ساتھ ڈیننگ کرتی ہو۔۔۔ طوائف کہیں کی!“

”تم طوائف ہو“

اس گفتگو کے بعد ماں بیٹی میں بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور دو ماہ بعد، اگست 1997 میں شہزادی ڈیانا کا دودی القاند کے ہمراہ ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا۔ لیڈی ڈیانا کی وفات پر پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ان کو چاہنے والے گھروں سے نکل آئے اور ان کا

جی بھر کر سوگ منایا گیا۔ وہ 31 اگست 1997 کو اس دار فانی سے رخصت ہوئیں۔

☆.....☆.....☆

کیا لیزڈ ڈیانا ویسی ہی تھیں جیسا کہ اس کا تاثر پھیلا یا گیا۔۔۔ شاید ایسا نہیں تھا۔۔۔ شہزادی ڈیانا

کی موت کے بعد جب شہزادہ چارلس میڈیا میں شدید تنقید کا نشانہ بنے، تو انہوں نے اپنے دفاع میں ایسا قدم اٹھایا جس کی توقع ایک مہذب، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سے ہرگز نہیں ہوتی۔ شہزادہ چارلس ملازمین کے ذریعے اخبارات میں اپنے ہی بچوں کو بدنام کرنے والی خبریں چھپوانے لگے مگر برطانوی عوام پر وہ خبریں یہ تاثر چھوڑتیں کہ ”ہمدرد اور شفیق“ باپ بن ماں کے بچوں کی عمدہ خبر گیری کر رہا ہے۔ ان خبروں کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ میں شہزادہ



چارلس کا ”مثبت ایج“ ابھارا جائے۔ 1996ء میں شہزادہ چارلس نے برطانوی عوام میں اپنا ایج بہتر بنانے کی

خاطر ایک پبلک ریلیفنگ آفیسر مارک بولینڈ کی

خدمات حاصل کر لیں۔ شہزادے نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنایا اور یہ مشن سمجھا کہ وہ عام برطانویوں میں اس کے لیے محبت و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھائے۔ مارک بولینڈ ایک چالاک و مکار شخص تھا۔ وہ اپنے تعلقات کے بل پر برطانوی و یورپی میڈیا میں شہزادی ڈیانا کے خلاف افواہیں پھیلانے لگا۔ اس نے سعی کی کہ شہزادی کو ایک کھلنڈری اور آوارہ مزاج لڑکی کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یہ بھی سچ ہے کہ لیزڈ ڈیانا ”دودی القاند“ سے شادی کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھی اور دودی سے تعلق ڈاکٹر حسنا کی یاو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش تھی۔ دودی اور ڈیانا کا تعلق عارضی تھا۔

برطانوی عوام نے ڈیانا سے محبت کی تھی جو آج بھی برقرار ہے، لوگ اس کے ہر ہر روپ سے محبت کرتے ہیں اور اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتے۔ ڈیانا آج بھی ڈاکٹر حسنا کے دل میں دھڑکتی ہے، وہ شاہی خاندان کی سازش کا شکار ہو کر محض 36 سال کی عمر میں اس دنیا سے چلی گئی مگر وہ زندہ رہے گی، خواب، گلاب اور خوشبو بن کر!!!

☆ ☆





رازدار کی شرط ہے

مستراح



ایک کلرک کی پراسرار چٹائی امامدادی کی بنا پر جس کا سفر کر دیا گیا تھا اور پھر...

قاتل کرنے کی کوشش کی۔ ڈرایا دھمکایا کئی اور جیسے ہتھکنڈے آزمائے مختلف طریقوں سے تنگ کیا مگر میں ہنستے عزم کے ساتھ ڈٹا رہا۔ بالآخر Administrative Grounds (انتظامی بنیادیں) کی بنا پر میرا تبادلہ یہاں کر دیا گیا۔ مجھ جیسے کسی اہلکار یا افسر کو ہزا دینی ہوتی تو اس کا تبادلہ یہاں کر دیا جاتا تھا۔

افسران نے اپنی دانست میں مجھے سزا دینے اور ٹھیک کرنے کے لیے یہاں میرا تبادلہ کیا تھا کہ میرے ہوش ٹھیک نے آجا میں۔ تبادلہ رکوانے کے لیے میرے پاس کوئی سفارش یا اثر و رسوخ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کسی افسر کی منت کی تو آؤ رز وصول کرنے کے بعد اگلے ہی دن یہاں ڈیوٹی جوائن کر لی۔

میں غیر شادی شدہ تھا۔ ویسے تو مجھے کوئی خاص پرابلم نہیں تھی مگر بوڑھے والدین کا ساتھ تھا۔ امی اور ابو دونوں ہی بیمار رہتے تھے۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا میں تھا تو والدین کا علاج معالجہ اور ان کی دیکھ بھال کرنا میرا اولین فرض تھا جو کہ میں اللہ کے

اچانک بن میرا تبادلہ ایک بہت بڑا فائدہ اور انتہائی پسمنندہ علاقے میں کر دیا گیا۔ جب مجھے ٹرانسفر آؤ رز ملے تو میں بھونچکا رہ گیا اور سر پہل کر بیٹھ گیا۔ جس علاقے میں میرا تبادلہ کیا گیا وہ شہر ایک چھوٹی سی تحصیل تھا اور میرے آبائی شہر سے پورے دو سو کلو میٹر کی دوری پر تھا۔ مجھے سرکاری محکمے میں ملازمت کرتے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ میرے تبادلے کی جڑیں بچہ افسران کا مجھ سے ٹاللا ہونا تھا۔ افسران اس وجہ سے مجھ سے خفا تھے کہ میں رشوت نہیں لیتا تھا۔ میرا نام لیاقت ہے گو کہ میں تھا تو سینئر کلرک مگر محکمے میں یہ سینئر بہت اہم گردانی جاتی ہے۔ یہ پبلک ذیلنگ کا محکمہ ہے تو روزانہ بے شمار لوگوں کا اپنے کاموں کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کوئی بھی افسر براہ راست پبلک کے کسی بندے سے رشوت وصول نہیں کرتا۔ یہ سارا کام سینئر کلرک کے ذمہ ہوتا ہے جو اپنا حصہ رکھ کر باقی رقم افسران کی جیبوں تک پہنچاتا ہے۔ میں نے پہلے دن سے ان اپنے اللہ سے اور اپنے آپ سے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ نہ اپنے لیے رشوت لیں گا اور نہ کسی افسر کے لیے۔ ہمیشہ حق حلال کی ریزی کماؤں گا۔ میں اپنے اس عہد پر سختی سے کاربند تھا۔ افسران نے مجھے بہت

کمرے کی تلاش شروع کر دی چونکہ یہ انتخابی
پسماندہ غیر ترقی یافتہ علاقہ تھا تو یہاں کوئی بھی چیلرز
ہوشل و غیرہ کی سہولت نہ تھی۔ دیہاتی ماحول تھا۔
پہلا ہفتہ دفتر کے ایک کمرے میں گزارا۔ دفتر نام
کے بعد جو کیدار آ جاتا تھا تو اس کے ساتھ گپ شپ
میں وقت گزر جاتا۔ چونکہ میں سزا کے طور پر یہاں
آیا تھا اس لیے بہت احتیاط سے یہاں رہنا تھا۔ دفتر
میں رات گزارنا بھی غیر قانونی تھا تو ڈیوٹی کے بعد
ایک کونٹیک کے ساتھ رہائش کی تلاش میں نکل

فضل و کرم سے کما حقہ پورا کر رہا تھا مگر تباہی کی وجہ
سے ان کی خدمت سے محروم ہو گیا تھا۔ اب میں ان
کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا تھا کیونکہ سب بہن
بھائی اسکول کالج میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے زیادہ فکر
اپنے ماں باپ کی تھی اس کے علاوہ اور کوئی خاص
مسئلہ نہیں تھا۔

افسران کا جب دوسرے شہر میں تبادلہ ہوتا ہے تو
انہیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ ہر شہر میں
سرکاری کوٹھی اور سرکاری گاڑی مل جاتی ہے۔ مسئلہ تو

Downloaded From
Paksociety.com

جاتا۔ آخر خدا خدا کر کے اسی کونٹیک کی وساطت سے
دس دن کے بعد ایک چھوٹا سا کوارٹر رہائش کے لیے
مل گیا۔ یہ کوارٹر چھوٹے چھوٹے دہکروں، چھوٹے
سے برآمدے اور غسل خانے پر مشتمل تھا۔ کافی
عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے
میں جالے، مٹی اور گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اگلے
دن اتوار کی چھٹی تھی تو میں نے خود ہی کوارٹر کی صفائی
ستھرائی شروع کر دی۔ دیواروں سے مٹی گرد و غبار
جالے اتارے، فرش دھویا شام تک شیشے کی طرح

صرف چھوٹے ملازمین اور کلریکل اسٹاف کے لیے
ہوتا ہے جن کے لیے کوئی سہولت نہیں ہوتی۔
دوسرے شہر میں چھوٹے ملازمین کے لیے سب سے
بڑا مسئلہ رہائش کا ہوتا ہے۔

خیر میں نے یہاں آ کر ڈیوٹی جوائن کر لی مگر
سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ ہمارا دفتر آبادی
کے قریب ہی ایک بڑی نہر کے کنارے پر واقع تھا۔
دفتر کی بلڈنگ محکمے کی اپنی تھی مگر کوئی بھی پچھوٹا موٹا
کوارٹر نہیں بنا تھا۔ میں نے رہائش کے لیے مکان یا

چکا دیا۔ ضرورت کا سارا سامان بھی بازار سے لے آیا اور اللہ کا نام لے کر رہائش اختیار کر لی۔

سارا دن گھر کی صفائی کرتا رہا تو بری طرح سے تھک گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر عشاء کی نماز ادا کی اور جیسے ہی چارپائی پر لیٹا فوراً نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

غالباً رات کے ایک بجے کا نام تھا میں گھبرا کر نیند سو رہا تھا۔ اچانک ایک دم بڑا کراٹھ بیٹھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی بہت وزنی سانپ یا اثر ہمارے جسم پر ریگ رہا ہے۔ وہ دڑتی ہوئے کے ساتھ ساتھ بہت گرم تھا۔ میرے جسم کے جس جس حصے پر وہ ریگ تھا وہاں ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تین انچ موٹا گرم پائپ پھیرا گیا ہے اور میرا جسم جل رہا تھا۔ میں فوراً چھلانگ لگا کر چارپائی سے نیچے اتر آیا اور لائٹ آن کی عمر چارپائی خالی تھی۔ کچھ نہ تھا۔ میں نے بہار البستر سجایا کہ شاید کوئی چیز انکوڑا نہ ہو۔ مجھے تپش اور گرمی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ اوائل مارچ کے دن تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ مجھے سخت بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے لائٹ جلتی رہنے دی اور بورتے بورتے چارپائی پر لیٹ گیا۔ آدھا گھنٹہ گزرا مگر نیند دوبارہ نہیں آ رہی تھی۔ گرمی، گھبراہٹ اور نہ ہی بے چینی کم ہو رہی تھی۔ طبیعت میں بہت خنکی اور سخت پیاس لگ رہی تھی یہ میں نے اس لیے کہ تین گلاس پانی پیاجس سے پیاس اور خنکی کچھ کم ہوئی مگر گرمی اور بے چینی بدستور رہی۔ گرمی کا احساس ختم کرنے کے لیے غسل خانے پورخ کیا اور پہلے دھوب کیا پھر پورا آدھا گھنٹہ نیند نہ پانی سے نہ بات رہا۔ نہ کہ کمرے میں آیا۔ گھڑی میں ٹائم دیکھا اور سمائی بنا رہے تھے۔ میں نے جانے نماز پھینک دیا اور تہجد ادا کی۔ مجھے بے حد سکون اور فرحت کا احساس ہوا۔ گرمی، بے چینی اور گھبراہٹ دور ہو گئی تھی۔ طبیعت بشاش بننا شروع ہو چکی تھی۔ میں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ فجر کی نماز تک تلاوت کی اور نماز کے بعد چارپائی پر لیٹا تو اگلے لمحے گہری نیند سو گیا۔ صبح ساڑھے سات بجے خود ہی

جاگت گیا اور تیار ہو کر آٹھ بجے اپنی ڈیوٹی پر آفس پہنچ گیا۔

☆...☆

اگلی رات شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ شور کی آوازیں دوسرے کمرے سے آرہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہا ہے۔ میں نے اُسے آن کی اور جا کر دوسرے کمرے میں دیکھا تو وہ خالی پڑا تھا اور آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ اب ردزائنہ رات کو اسی طرح ہونے لگا تبھی ایسے لگتا جیسے کوئی ہمارے چیز فرس پر تھیسٹ رہا ہے۔ کبھی پرندوں کے پر پھر پھڑانے کی آوازیں آتیں، کبھی چیخوں کی آوازیں آتیں، کبھی کبھی کی چیز بھجھکناٹ کی آوازیں آتیں، کبھی کبھی بچے کے رونے کی آوازیں آتیں، کبھی ایسے لگتا جیسے زلزلہ آ رہا ہے الغرض ایسی آوازیں کا ردزائنہ کا معمول بن گیا۔ یہ سب پشیمانی کے دو بچے ہوتا۔ میں اسی وقت تہجد پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دیتا۔

☆...☆

شروع شروع میں مجھے بہت ڈر لگتا اور میں خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ مکان بدل لوں اور اپنے طور پر تلاش بھی کرتا رہا مگر کوئی مکان نہ ملا۔ اس بار نے معاملے کو اپنے تک محدود رکھا اور کسی سے ذکر نہ کیا۔ مجھے یہاں آنے پورا مہینہ ہوا چکا تھا۔ کیم اپریل کو قحط اور بھول گئی۔ اقرار کے ساتھ سو سو وار مشکل کی دو چمنیاں لیں اور اپنے شہر آ گیا۔ امی ابو کی طبیعت پیٹنے سے زیادہ خراب تھی۔ انہیں لے کر اسپتال کیا۔ جیک اپ کر دیا اور میڈیسن لے آیا۔ کیم کے دیگر حالات بد دیکھا۔ اپنا خود چہ پانی رکھ کر باقی تنہا امی کے ہاتھ پر رہی۔ تین دن لھر رہنے کے بعد بدھ کی سح اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ شام کو جب کوارٹر کا وردازہ کھولا تو دیکھا۔ میری چارپائی پر بہت سارے بوتر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ کمرے میں اڑنے لگے اور ایک ایک کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ بوتر کہاں

ہوا کچھ یوں کہ مغرب کے بعد اس کی ٹانگ میں اتنا شدید درد اٹھا کہ وہ چار قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ساری رات اسے درد رہا اور صبح ہوتے ہی اس کا درد عائب ہو گیا۔ جتنے دن اس کے بیوی بچے واپس نہیں آئے اسے روزانہ رات کو درد شروع ہو جاتا اور صبح خود بخود ختم ہو جاتا۔

.....

ایک دن شام کا وقت تھا۔ میں نے اپنی گھڑی اور پرس اپنے بستر کے سرہانے رکھا اور باہر برآمدے میں نمٹی کے تیل والے چولہے پر چائے بنانے لگا۔ چائے کا کپ لے کر کمرے میں آیا تو دیکھا پرس اور گھڑی عائب تھے۔ میں نے پورا کمرہ چھان مارا مگر دونوں چیزیں نہ ملیں۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے کدڑی لگی ہوئی تھی تو سوال بنی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ باہر سے کوئی آیا ہو اور میرا پرس گھڑی اٹھا کر لے گیا ہو۔ مجھے یہ یقینی ہوئے تھے۔ کیونکہ پرست میں میری پرانی تنخواہ تھی اور اگلے دن میں نے اپنے گھر جانا تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی جا کر دیکھا اپنی جیب میں نوٹس گھرے ہوئے...! تب غریب دیر کے بعد مغرب کی آواز سنائی ہوئی تو وضو کر کے غسل خانے میں گیا تو دیکھا وہاں میرا پرس اور گھڑی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً پرس گھول کر رقم نکالی تو وہ پوری تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

مجھے اس کو ارد میں رہنے دینے میں مہینے ہو چکے تھے، اب ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہونے لگا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے ذرا بھی ڈر اور خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں اکیلا یہاں رہتا تھا مگر ابھی تک میرا کسی قسم کا کوئی نقصان نہ ہوا تھا۔ رات رات میں ان باتوں کا غامضیہ درجہ تھا۔ نماز میں پہننے ہی پر ہستا تھا مگر ہاتھ خدگی سے نہیں لاتی پڑھ لی اور کوئی نہ پڑھی۔ ان تین مہینوں میں ایک فائدہ ضرور ہوا تھا وہ یہ کہ نماز پڑھنا نہ کی ادا ہوئی کے ساتھ تہجد پڑھنا اور تلاوت قرآن پاک میرا معمول بن گیا تھا۔ رزق حرام سے اللہ نے مجھے بچے ہی بچایا ہوا تھا۔

میری تعلیم بی اے تھی۔ میرے گھر سے بی اے تک

سے آگئے تھے جب کہ میں تو پورا پورا کووارٹز لاک کر کے گیا تھا۔ نماز عشاء کے بعد سو گیا تو رات کے دو بجے غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ جا کر دیکھا تو پانی سے بالٹی بھری ہوئی تھی حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے بالٹی خالی ایک کونے میں، میں نے بھی تھی اور اب یہ ٹوٹی کے نیچے پڑی ہوئی تھی اور پانی سے بھری تھی۔ میں نے ٹوٹی گھول کر پانی نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ ٹنگی خالی تھی۔ میں نے بالٹی والے پانی سے وضو کیا اور تہجد پڑھی۔

اگلے دن مغرب کے بعد میرا ایک کولیگ میرے پاس کو ارد میں آیا اس کی بیوی بچوں کے ساتھ گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا اور پورا ہو رہا تھا تو ناظم گزارنے کے لیے میرے پاس آ گیا۔ ہم نے اگلے رات کا کھانا کھایا۔ پھر گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکلیں گئے۔ رات نو بجے کو ارد میں آئے میں نے اس سے کہا کہ آج رات یہاں میرے پاس ہی رک جاؤ تم اپنے گھر میں بھی آئیے۔ پھر ٹوٹو کپ شپ لگائیں گے تو وہ مان گیا۔ قرعہ ایک گھر سے چار پائی اور بستر مانا کیونکہ میرے پاس صرف ایک چار پائی اور بستر تھا۔ کولیگ سے کہا۔ جتنے دن تمہاری بیوی بیٹے یہاں نہیں ہیں تم باہر میرے پاس ہی رات کو رک جاؤ۔ رات گیارہ بجے تک ہم باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ میرے پاس سونیوں والی گھڑی تھی جو میں اپنے سرہانے رکھ کر سو یا کرتا تھا۔

رات کے دو بجے مجھے ایسا لگا کہ کوئی سیف سے گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہے مگر بار بار سیف مارنے پر گاڑی اسٹارٹ نہ ہو رہی ہے۔ اس آواز سے میری آنکھ کھلی گئی تو دیکھا یہ آواز میری گھڑی سے آرہی تھی۔ مجھے حیرانگی نہیں ہوئی اور کسی بھی آواز سے سی اور سا رہی گھڑی سے یہ کیسی آواز آرہی ہے۔ میرے جاگتے ہی یہ آواز بند ہو گئی۔ میں نے حسب معمول تہجد پڑھی اور تلاوت کی جب کہ میرا کولیگ گہری نیند دوتا رہا۔ اگلے دن کولیگ کی میرے پاس آنے کی نو بہت ہی نہ آئی۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کے تینوں امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے تھے مگر کے حالات اچانک کچھ ایسے ہو گئے جن کی وجہ سے مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور مجھے سینٹر کلرک کی نوکری کرنی پڑی۔ تین بجے دفتر بند ہو جاتا تھا اس کے بعد میں فارغ ہوتا تو مجھے خیال آیا کہ وقت ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ ایم اے کی پرائیویٹ تیاری شروع کر دوں۔ چنانچہ اگلے ہی دن سے ایم اے کی تیاری شروع کر دی۔ یونیورسٹی سے امتحان کے شیڈول کا پتا کروایا اور دفتر نام کے بعد کوارٹر میں رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ پراسرار واقعات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

میری روزمرہ استعمال کی اشیاء خود ہی غائب ہو جاتیں پھر خود ہی مل جاتیں۔ کبھی خود بخود پگھلا چل جاتا اسی طرح خود ہی لائٹ آن ہو جاتی مگر میں ان سب باتوں سے بے پروا میں وہاں رہ رہا تھا۔ انہی حالات میں شب و روز گزرتے گئے اور چھ مہینے کا عرصہ بیت گیا۔ ایک رات میں سو رہا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میری چار پائی زمین سے اٹھی ہوئی تھی اور کمرے میں گھوم رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا جیسے چار پائی کو کسی نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس رات بہت ڈر لگا اور خوف سے پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی چار پائی زمین پر واپس آ گئی۔ میں نے گھڑی اٹھا کر نام دیکھا تو ابھی ساڑھے بارہ بجے تھے۔ باقی رات جاگ کر گزاری کیونکہ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح دس بجے دفتر کے پی سی ایل فون پر چھوٹے بھائی کی کال آئی۔ وہ پی سی او سے فون کر رہا تھا اس نے بتایا کہ ای کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ آپ فوراً گھر پہنچو۔ میں نے اسی وقت ایک ہفتے کی چھٹی لکھی، اپنے افسر کو والدہ کی بیماری کا بتایا تو انہوں نے فوراً میری چھٹی منظور کر دی۔ میں کوارٹر سے کچھ چیزیں اٹھانے کے لیے آیا کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا میرے بستر پر بہت بڑا کورا سانپ پھن پھلائے بیٹھا ہے جسے دیکھ کر خوف سے

میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں فوراً کمرے سے باہر آیا اور ادھر ادھر سے ایک چھڑی تلاش کر کے پکڑ لی تاکہ اگر سانپ مجھے ذبح کرنے کی کوشش کرے تو اپنا بچاؤ کر سکوں۔ جونہی کمرے میں واپس آیا تو سانپ غائب تھا۔ پورے کمرے میں تلاش کیا مگر سانپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ضرورت کی چیزیں اٹھا کر کوارٹر کو تالا لگایا۔ واپس دفتر آ کر اپنا کام کولیگ کے حوالے کیا اور شام تک گھر پہنچ گیا۔

ای کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی انہیں سانس لینے میں بہت تکلیف تھی۔ وہ صحیح طرح سانس نہیں لے پا رہی تھیں۔ ان کے سینے اور پیٹ میں بہت درد تھا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپ رہی تھیں۔ فوری طور پر انہیں ہول اسپتال کی ایمرجنسی میں لے گئے۔ جہاں ان کی ای سی جی کی گئی جو کہ بالکل ٹھیک تھی۔ چند دیگر نمیسٹ بھی کیے وہ بھی سب ٹھیک اور نارمل تھے۔ انہیں آکسیجن لگا دی گئی۔ درد ختم کرنے کے لیے ڈرپ میں انجکشن ڈال کر لگا دیا گیا۔ درد کچھ کم ہوا مگر ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ تین دن سے اسپتال میں تھے۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر نے چیک کیا۔ دوائیاں تبدیل کیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کہ مصداق انہیں آرام نہیں آرہا تھا۔

ایک دن دوپہر کو اچانک ای کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ بہت اذیت میں تھیں۔ ڈاکٹر نے فوراً آ کر چیک کیا اور ایک ٹیکہ لکھ کر دیا کہ جلدی سے لے کر آؤ۔ میں نسخہ لے کر اسپتال سے باہر میڈیکل اسٹور پر آیا تو وہاں ایک عورت کھڑی تھی جس نے اپنی گود میں ایک سال کا بچہ اٹھایا ہوا تھا جو تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ اس عورت نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہا۔

”باپو میرا بچہ بہت بیمار ہے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بچے کے لیے یہ دوائی لے دو۔“ ساتھ ہی اس نے ایک نسخہ میرے آگے کر دیا۔ مجھے وہ عورت بہت بے بس لگا چار اور مجبور لگی۔ میں نے ایک نظر اس کے روتے بچے کی طرف دیکھا تو مجھے بہت ترس آیا میں نے میڈیکل اسٹور والے سے کہا

کہ اس کو میڈیسن دے دو، میں بل ادا کروں گا۔ ساتھ ہی اپنی والدہ کا نسخہ اسے دیا کہ جلدی ہے یہ انجکشن بھی دو۔ نسخہ دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ یہ انجکشن یہاں سے نہیں ملے گا، ہے تو سستا مگر بہت نایاب ہے۔ کئی دنوں سے شارٹ ہے۔ آپ ریس میں بڑے میڈیکل اسٹور سے پتا کرتا ہوں۔ اس نے پی ٹی وی ایل پر کہیں فون کیا۔ ان کے پاس انجکشن تھا اسی اثناء میں اس کے ملازم نے اس عورت کے بچے کی میڈیسن بلفانے میں ڈال دی تھی۔ اس کا آنکھ سو روپے بل بنا جو کہ میں نے ادا کر دیا۔

وہ عورت میڈیسن لے کر مجھے دعائیں دیتی ہوئی اسپتال کی طرف چلی گئی جہاں اس نے بچے کو انجکشن اور ڈرپ لگوائی تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد دوسرے میڈیکل اسٹور سے ایک لڑکا موٹر سائیکل پر میرا مطلقہ انجکشن لے کر آگیا جس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ میں انجکشن اور سرنج لے کر جو نئی اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوا تو ایک بزرگ جو کہ مجھے مجذوب لگتا تھا ننگے پاؤں کھڑا تھا مجھے روک لیا اور کہنے لگا۔ ”بیٹا تم نے اس مجبور بے بس عورت کے بچے کو دوائی لے کر دی ہے، بہت بڑی نیکی اور احسان کیا ہے۔ تم نے اللہ کو قرض دیا ہے سو بنابر تجھ سے راضی ہو گا جو نیکہ اپنی ماں کے لیے لے کر آیا ہے لاؤ مجھے دے۔“

میں نے وہ انجکشن اس بزرگ بابا کو پکڑا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور بولا۔ ”جالے جا یہ نیکہ رب نے چاہا تو تیری ماں بھلی چنٹی ہو جائے گی۔“

میں جانے لگا تو وہ بولا۔ ”اور ہاں سن! تیرے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے جو ہو رہا ہے مجھے سب پتا ہے ایسا کر کل صبح بس بجے شہر سے باہر والے بڑے قبرستان آ جانا، میں تمہیں پھیل کے گھنے درخت کے نیچے ملوں گا تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ بس اب تو جا اور جلدی سے اپنی ماں کو یہ نیکہ لگوا۔“

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وارڈ میں پہنچا اور انجکشن نرس کے حوالے کر دیا جس نے اسی وقت

وہ انجکشن ای کو لگا دیا۔ انجکشن لگتے ہی ای جان کی حالت سنبھلنی شروع ہو گئی۔ میرے کانوں میں بزرگ کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ میں نے دوبارہ وہاں آ کر دیکھا جہاں وہ بزرگ کھڑے مگر اب وہ وہاں نہیں تھے جاکے تھے۔ انجکشن لگنے کے بعد لمحہ یہ لمحہ ای جان کی تکلیف کم ہوتی جا رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر اگلے دو گھنٹے کے اندر ای جان ٹھیک ہو گئیں۔ آنکھیں کا ماسک ہٹا دیا گیا۔ وہ اب نارمل سانس لے رہی تھیں۔ ان کے سینے اور پیٹ کا درد بھی ختم ہو گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا انہیں صحت یاب اور فٹ قرار دے کر اسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔ ہم جن کو تین دن پہلے اسٹریچر پر ڈال کر لائے تھے اب وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر گھر آئیں۔ رات دیر گہری اور پرسکون نیند سوتیں۔

صبح وہ بھلی چنٹی ہو گئیں اور لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ اتنا بیمار اور تکلیف میں رہی ہیں وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھیں۔ اب مجھے رہ رہ کر ان بزرگ کا خیال آرہا تھا جنہوں نے مجھے دس بجے قبرستان کے پھیل کے درخت کے نیچے بلایا تھا۔ ابھی صبح کے آٹھ بجے تھے میں دس بجنے کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ سادھے نو بجے بھائی کا بائیسکل نکالا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ قبرستان شہر سے باہر کافی دور تھا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ جیسے ہی پھیل کے درخت کے نیچے پہنچا وہ بزرگ وہاں درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے فوراً سلام کا جواب دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گویا ہوئے اور کہنے لگے۔

”لیاقت بیٹا! جس کوارٹر میں تم رہ رہے ہو وہ ایک عرصے سے خالی پڑا تھا تو وہاں مادرائی مخلوق نے ذریعہ ڈال دیا تھا۔ جب تم وہاں شفٹ ہوئے تو انہیں تمہارا وہاں رہنا بہت ناگوار گزرا مگر تم ان کے عتاب سے ابھی تک اس لیے بچے ہوئے ہو، محفوظ ہو اس کی دو جو بات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ مخلوق

بن جائے گی اور تمہارے بہت کام آئے گی مگر ان تمام ہدایات پر سختی سے عمل کرنا تم پر لازم ہے، ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے۔“

میں نے ان بزرگ سے درخواست کی کہ میرے دوبارہ یہاں تباہی کے لیے کچھ کریں تو انہوں نے کہا کہ ابھی نہیں تمہارے وہاں رہنے میں بہت بڑی مصحت ہے جو فی الحال تم ابھی سمجھنے سے قاصر ہو۔ ماں کوئی دقت آئے گا.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد پھر کہنے لگے۔ ”ابنی تعلیم کو آگے بڑھاؤ۔ خوب محنت کرو، اللہ پاک کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔“

پھر انہوں نے میرے اور میرے ماں باپ بہن بھائیوں کے لیے دعا کی اور کہا۔ ”اب گھر جاؤ، یاد رہے ہر حال میں رازداری اور خاموشی شرط ہے۔“ میں انہیں سلام کر کے واپس گھر آ گیا۔

ابھی میری تین چھٹیاں باقی تھیں جو میں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزاریں۔ امی جان اللہ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو چکی تھیں۔ ابو کی صحت بھی پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اب میں اپنے گھر کے حالات سے مطمئن تھا۔

☆.....☆

جیسے ہی چھٹیاں ختم ہوئیں میں واپس اپنی ڈیوٹی والے شہر پہنچ گیا۔ ان بزرگ کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر عمل شروع کر دیا۔ ان کا بتایا ہوا وظیفہ اچھی طرح یاد کر لیا۔ پھر میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے اللہ کا نام لے کر نہادھو کر با وضو زمین پر چٹائی بچھا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے وظیفہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاس کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے سلام کیا تو اسی وقت جواب ملا پھر حال احوال پوچھا۔ اسی طرح چند ایک باتیں گیس مل کر درد پاک پڑھا۔ اب کبھی کبھار میں ان سے چند ایک باتیں کر لیا کرتا۔ میرے ساتھ اب کسی قسم کی کوئی شرارت نہیں ہوتی تھی امن اور سکون تھا۔ وہ مخلوق میرے ساتھ بہت دوستانہ انداز میں روی تھی۔ مجھے پورا اطمینان تھا کہ وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

تو ہے ہی ناری مگر ان کا تعلق اجناء فی اس قوم سے ہے جو اہل ایمان اور مکمل گویں وہ بلا وجہ کسی کو نقصان تکلیف نہیں پہنچاتے گویا نہیں تمہاری دخل اندازی اچھی نہیں لگی مگر وہ امن پسند ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم رزق حلال کھاتے ہو تم نے تہجد کی ادائیگی اور قرآن پاک کی تلاوت کو اپنا شعار اور معمول بنالیا ہے۔ کوارٹر میں اللہ کی عبادت کرتے ہو تو وہ بھی تمہارے ساتھ عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں مگر ان کی فطرت میں سرکشی شامل ہے تو وہ تمہیں مختلف طریقوں سے تنگ کرتے ہیں یوں سمجھ لو شرارتیں کرتے ہیں تمہارے ساتھ باقی تم نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ ابھی تک کسی کے آگے اس سارے معاملے کا ذکر نہیں کیا ورنہ دو تمہیں نقصان بھی پہنچاتے۔ اچھا اب غور سے میری چند باتیں سنو اور ان پر سختی سے عمل کرنا۔ تمہیں بہت فائدہ حاصل ہو گا۔ پہلی بات جس طرح یہ سارا معاملہ چھپایا ہے آئندہ بھی ہمیشہ چھپا کر رکھنا اور بھول کر بھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ دوسری بات اسی کوارٹر میں ہی رہائش رکھنا اور کسی بات سے بھی خوفزدہ نہ ہونا۔

تیسری بات ہمیشہ پاک صاف اور با وضو رہنا، چوتھی بات جو دوسرا کمرہ خالی پڑا ہے اس کی روزانہ صفائی کرتے رہنا اور انہیں میں روزانہ شام کو مغرب کے وقت اگر بتی سلگانا یا کوئی خوشبو بکھیر دیا کرنا، پانچویں بات ہر سوموار اور جمعرات کو آدھا کلو بڑا گوشت کوارٹر کی چھت پر پھینک دیا کرنا اور آخری بات تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتا ہوں۔ اسے اچھی طرح یاد کر لینا اور خیال رہے کہ پڑھنے میں کوئی زیر زبر کی بھی غلطی نہ ہو۔

اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھنا تم نہادھو کر با وضو ہو کر زمین پر کوئی کپڑا یا چٹائی بچھا کر بیٹھ کر جب یہ وظیفہ پڑھو گے تو وہ مخلوق تمہارے پاس آ کر بیٹھ جائے گی تو تم اس سے تھوڑی دیر کے لیے ہمکلام ہو کر باتیں کر سکو گے مگر ہمیشہ آنکھیں بند رکھنا جب گفتگو ختم ہو جائے گی تو درود شریف پڑھ کر آنکھیں کھول لیا کرنا۔ وہ مخلوق تمہاری دوست

حسب معمول ہر ماہ کی یکم کے بعد میرا گھر چکر لگتا۔ اسی ابوصحت یاب ہو گئے تھے۔ میں نے پڑھائی جاری رکھی۔ ایم اے کا داخلہ بھیج دیا تھا۔ زندگی کاٹی پر سکون گزر رہی تھی۔ اب تو یہ ہونے لگا مجھے اکثر کوارٹر میں پیسے ملنے لگے۔ پہلے پہلے پانچ سو کا نوٹ ملتا پھر ہزار ہزار والے اور کبھی کبھی پانچ ہزار والے نوٹ بھی مل جاتے۔ میں یہ پیسے خرچتا نہیں تھا۔ مجھے شک تھا کہ یہ کہیں نقلی نوٹ نہ ہوں۔ ایک دن میں نے وظیفہ پڑھا تو وہ مخلوق میرے پاس آگئی۔ سلام دعا کے بعد ان سے نام پوچھا تو انہوں نے اپنا نام شراق بتایا۔ ان کی عمر تین سو سال تھی۔ وہ چند سالوں کے لیے اپنی قوم قبیلے سے الگ ہو کر ایک خاص مقصد اور عبادت کے لیے انسانوں کی دنیا میں آئے تھے۔ یہ کوارٹر عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا تو انہوں نے یہاں ڈیرہ لگا لیا تھا انہیں میری آمد اس کوارٹر میں ناگوار گزری تھی مگر میرے معمولات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ آج وہ مجھے یہ باتیں بتا رہے تھے۔

جب سے بزرگ بابا کی ہدایات پر میں نے عمل شروع کیا تھا تو تب سے وہ بہت خوش تھے۔ جب بیسوں کی بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ یہ پیسے وہ رکھتے ہیں میرے لیے۔ انہوں نے کہا یہ نوٹ بالکل اصلی ہیں اور تمہارے ہیں تو تم بلا جھجک انہیں خرچ کر سکتے ہو مگر کسی سے ان کا ذکر نہ کرنا ورنہ پیسے ملنے بند ہو جائیں گے۔

اس کوارٹر میں، میں نے پورے دو سال گزارے۔ میرے پاس لاکھوں روپے جمع ہو چکے تھے۔ میں نے ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ جب ہمارے ہی محکمے میں آفسرز کی کچھ آسامیاں خالی ہوئیں تو ان کے لیے اخبار میں اشتہار شائع ہوا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے بھی اپلائی کرویا۔ پھر آفسر کی پوسٹ کے لیے تحریری امتحان ہوا جو میں نے شاندار نمبروں سے پاس کر لیا۔ اسی طرح انٹرویو بھی کوالیفائی کر لیا۔ پھر وہ دن آیا جب مجھے اپنے اسی محکمے میں آفسر کا اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا اور میری تعیناتی میرے آبائی شہر میں ہی کی

گئی۔ آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ پس ماندہ شہر جہاں مجھے سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا میرے لیے بہت کئی ثابت ہوا تھا۔ یہیں سے میں نے ایم اے کیا۔ شراق سے دوستی ہوئی لاکھوں روپے ملے۔ میں یہاں بطور سینئر کلرک آیا تھا اور اب گزشتہ آفیسر بن کر اپنے شہر واپس جا رہا تھا۔ آج مجھے بزرگ بابا کی کہی ہوئی بات یاد آرہی تھی کہ ابھی تمہارے وہاں رہنے میں بہت بڑی مصلحت ہے اور آج مجھے اس مصلحت کی سمجھ آگئی تھی۔ اگلے دن میں نے یہاں سے رخصت ہونا تھا تو آج میں نے شام سے پہلے بازار سے موٹے حروف والا قرآن پاک لیا اور شام کو چٹائی بچھا کر ایک چھوٹی سی میز رکھی۔ میز پر قرآن پاک رکھا اور وظیفہ پڑھا تو شراق میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ سلام دعا کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ کل یہاں سے جا رہا ہوں اور یہ قرآن پاک آپ کو تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہوں، جسے انہوں نے بڑی خوشی اور شکرے کے ساتھ قبول کیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ جب آنکھیں کھولو گے تو ان کی طرف سے بھی تحفہ ملے گا۔ شراق نے بتایا کہ ان کا وظیفہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔

اب وہ بھی اپنے قبیلے اور قوم میں واپس جا رہے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ اور بھی باتیں ہوئیں۔ پھر میں نے درود شریف پڑھا اور آنکھیں کھول دیں۔ قرآن پاک وہ لے گئے تھے۔ اب وہاں ایک چاندی کی انگوٹھی پڑی تھی جو انہوں نے اپنی نشانی اور تحفہ مجھے دیا تھا میں نے وہ انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔ یہ ہماری آخری ملاقات اور گفتگو تھی۔ اگلے دن میں نے کوارٹر خالی کر دیا اور چابی اس کے مالک کے حوالے کر دی۔ آج میں افسر بن کر اپنے شہر آ گیا جہاں میں کلرک تھا اور سزا کے طور پر یہاں سے میرا تبادلہ کیا گیا تھا۔ جب چارج لینے کے لیے اپنے آفس پہنچا تو سب لوگ میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور مبارک بادیں پیش کر رہے تھے۔

☆☆☆

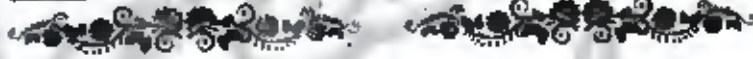


بڑی آپا



ایڈیٹس اور ایس مسج

سب یہی سمجھتے تھے کہ بڑی آپا آسب ہے لیکن حقیقت آسب سے بھی زیادہ اسرار رکھتی



انہی میں پینتی رہیں۔

اماں پڑوس سے آئیں تو اس گمان میں تھیں کہ آپا اب تک فارغ ہو چکی ہوں گی اور وہ ان سے بیٹھ کر ڈائجسٹ کی کہانی سنیں گی لیکن ان کو اس طرح تخت پر بال سنوارتے دیکھا تو شپٹا کر رہ گئیں۔
”آئے ہائے غضب خدا کا تنی بار کہا ہے کہ شام کو بال کھلے چھوڑ کر اس طرح نہیں بیٹھتے جن عاشق ہو جاتے ہیں۔“

بڑی آپا نے پہلی بار اماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا ورنہ وہ انس کر کہا کرتی تھیں ”کچھ نہیں ہو تا اماں تم تو خواہ مخواہ کے وہم پالتی ہو۔“

اماں ماتھے پر ہل ڈالے اس کے جواب کی منتظر رہیں اور وہ چپ چاپ انھ کے بیروں میں بالوں کے کچھے نکال کر ہاتھ میں دبائے۔ کنگھا لئے کچھرا دان کے پاس جا کھڑی ہو میں اور بجائے بال پھینکنے کے کنگھا کچھرا دان میں ڈال دیا اور وہیں کھڑی ہو کر بالوں کے کچھے اپنے اپنے دوپنے کے پلو میں باندھنے لگیں۔ اماں حیرت میں بھری سر پر آن کھڑی ہوئیں اور غصے سے کہا۔

بڑی آپا رجن عاشق ہو گئے تھے۔

پہروں پہنچی خلاؤں میں کچھ تلاشتی آنکھوں میں اسرار سے رہنمائی تھے کوئی پکار لیتا تو گردن گھما کر اس طرح دیکھتیں جیسے سمجھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا کہا گیا ہے۔ یا پھر جیسے کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ سمجھ تو خیر کسی کے کیا آتا بس آنکھوں کی وحشت ریڑھ کی ہڈی میں سنسناسٹ دھڑا دیا کرتی اور پکارنے والا نظریں چرا لیتا تھا۔

اور نظریں بھی تو نہیں چرائی جاتی تھیں کون جانتا تھا کہ اچانک بیٹھے بٹھائے یہ سب ہو جائے گا ابھی دو چار دن پہلے کی تو بات تھی۔ روز کی طرح بچوں کو میویشن بڑھا کر پانڈی بنائی تھی آغا گوندہ کر رکھا تھا اور نہانے چھمس گئی تھیں اس روز ان کو نہانے میں بڑی دیر ہو گئی تھی کوئی پون گھنٹے بعد نہا کر باہر نکلی تو اپنے آپ میں ہی مسکراتی جاتی تھیں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر تو لیے سے بال جھٹک جھٹک کر سکھاتی نہایت ہی ہلکی سی آواز میں جانے کیا گنگنتی رہیں پھر جو سیلے بال سنبھالنے بیٹھیں تو پتا نہیں کتنی ہی دیر تک کنگھے میں اپنے بالوں کے کچھے بنا بنا کر پیر کے اٹوٹے اور برابر وانی

Downloaded From Paksociety.com

نکسنے کا نام نہیں لیا۔ اماں کی بڑی سستی ہوئی تین چار بار آوازیں دے کر خود ہی تلملا کر اٹھیں اور باورچی خانے میں آکر سر پیٹ لیا۔ بڑی آپا تو باورچی خانے میں زمین پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں چولہا جل رہا تھا چائے کی پتیلی سلیب پر یوں ہی دھری تھی۔ چینی پتی کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔

”تمہیں چائے بنانے کا کہا تھا۔ یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو تم۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

بڑی آپا نے سر اٹھایا کچھ بولیں نہیں بڑی بڑی آنکھوں سے بس اماں کو دیکھتی ہی گئیں۔ چولہے میں جلتی آگ سے زیادہ لودے رہی تھیں ان کی آنکھیں۔ اماں نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ یوں بھی بڑی آپا کے دلکش چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں ہی تھیں۔

”کیا بات ہے بیٹا۔ پریشان لگ رہی ہو۔ کچھ برا لگا تم کو۔“

بڑی آپا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور عجیب سے انداز میں بولیں۔

”اس نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھو میرے پاس۔“

”کیا بادی ہو گئی ہو۔ بالوں کا کیا اچار ڈالو گی۔ اور کنگھا کیوں پھینک دیا پھرے میں۔“

بڑی آپا نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور ایک گہری پر اسرار سی نظر اماں پر ڈال کر چند لمحوں گھورتی رہی اور پھر تیزی سے اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس چند لمحوں کی نظر میں کیا تھا جو اماں کو پتھر کر گیا تھا ان کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔ اگلے چند لمحوں تو وہ ہونفتوں کی طرح صحن میں ہی کھڑی سوچتی رہیں پھر زیتون خالہ کی آواز ان کو چونکا گئی۔

”مجھے تو کچھ بھائی نہیں دیتا عذرا۔ تم ہی بتاؤ۔ سدرہ کے سسرال سے کوئی خبر نہیں آرہی نکاح کو پانچواں سال ہے جانے شادی کا کیا ہو گا۔ مشورہ دو مجھے کیا بات کروں۔“

اماں تو اپنی ہی ادھیڑ بن میں تھیں خاموشی سے ان کو دیکھی گئیں۔ ان کے دوبارہ بلانے پر ہڑبڑا کر بولیں۔

”آں ہاں۔ چلو اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

بڑی آپا نے دوسری عجیب حرکت یہ کی کہ زیتون خالہ کے لیے جو چائے بنانے باورچی خانے گئیں تو

”مجھے تو ڈر لگتا ہے اس کی آنکھوں سے۔ کچھ کر پس جیل صاحب دکھائیں کسی کو۔ کہیں اوپر کی کوئی چیز تو نہیں۔“

جیل صاحب بھی اماں کی طرح کم اعتقاد والے تھے دونوں نے آدھی رات تک بات کی اور صبح جلدی جلدی ناشتہ کر کے موز سائیکل اسٹارٹ کی اور کسی عامل سے جا ملے ساری بات ان کے گوش گزار دی عامل نے کچھ بڑھ بڑھ کر پانی دیا ابا لے آئے گھر آئے تو اماں کے پیروں میں بلیاں بندھی تھیں سارے گھر میں چکراتی پھرتی تھیں۔

”صبح سے کمرے میں بند ہے۔ جتنی بار بھی گئی ہوں بیٹھی باتیں کر رہی ہے وہی وہی زبان میں۔ مجھے سے تو کچھ نہیں بولتی نہ سنتی ہے نہ جواب دیتی ہے۔ کیا کہا عامل بابا نے؟“

ابا تنکے تنکے سے انداز میں صوفے پر بٹھ گئے تھے۔

”اس کے ساتھ جن ہے۔ شادی سے پہلے ہے ہے۔ یہ پانی دیا ہے بابا نے۔ پلانا ہے اس کو۔ اللہ کرم کرے گا۔“

بڑی آپا کو پانی دیا تو پہلے تو تنکلی باندھ کر پانی کو دیکھتی رہیں پھر ایک جھکے سے بوتل اٹھا کر غٹا غٹ پی گئیں آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں اور عجیب سی آواز میں بولیں۔

”پی لیا اب تم لوگ جاؤ۔ مجھے تنگ مت کرو۔ جاؤ یہاں سے مجھے آرام کرنا ہے۔“

اماں ابا پہلے ہی خوفزدہ تھے فوراً ہا ہر چلے گئے تھے ابا نے اماں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ چھوٹی کو کچھ مت پتا چلے وہ سسرال میں پریشان ہوگی۔ کیا جواب دے گی وہاں اس کی اور بڑی آپا کی شادی ایک ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اور نعمان بھائی کو اماں خود نہیں بتانا چاہتی تھیں مرنے کے تو ان کی اسلام آباد میں نوکری لگی تھی۔ بہن بھائیوں کے پیار سے واقف تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ نوکری چھوڑ کر آجائے۔

بڑی آپا کی آنکھوں کی آگ بابا جی کا پانی پی گئی تھی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔

اماں دہل کر رہ گئیں ”آئے ہائے کیا اول فول بجے جا تی ہو۔ کس نے کہا تھا۔ کون ہے یہاں۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

بڑی آپا نے اس طرح دیکھا جیسے ان کو اماں کے بچپنے اور لاعلمی پر حیرت ہوئی ہو مسکراتے ہوئے اماں کو دیکھا اور پھر نظریں پھیر لیں اور آہستگی سے باہر نکل گئیں۔ اماں نے دیکھا آج تو بڑی آپا کی چال ہی الگ تھی۔ موقع اب بھی ایسا نہیں تھا کہ بات کو طول دیتیں اندر بیٹھیں زیتون خالہ کا نیٹ ورک بہت وسیع تھا آن کی آن میں بات سارے محلے میں پھر جاتی اماں بدنامی سے زیادہ اس بات سے ڈرتی تھیں کہ بات اگر بڑی آپا کے سسرال جا پہنچی تو معاملہ کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔

ابھی تین مہینے پہلے ہی تو ہوئی تھی شادی۔ اور پہلے ہی مہینے میں شوہر اس کو واپس چھوڑ گیا تھا جانے کیا بات ہوئی تھی بڑی آپا کچھ کہتی تھیں اور شوہر کچھ اور ساس کی تو خیر زبان کو ویسے ہی آرام نہیں تھا۔ ان کی کہانیاں ہی سب سے الگ ہوتی تھیں ہاتھ نچا نچا کر بولی تھیں۔

”لڑکی تیار نہیں تھی شادی کے لئے تو کی کیوں۔ اب ظاہر ہے بیاہ کر لایا ہے میرا بیٹا۔ بہن بنا کر تو نہیں رکھ سکتا ناں۔“

اماں تو شرم سے پانی پانی ہو گئیں ابا سے بھی بات کی تو ابا کی حالت بھی اماں سے کم مختلف نہ رہی۔ اس کے علاوہ کیا کہہ سکتے تھے کہ ”اس کو سمجھاؤ عذرا میں تو بات کر ہی نہیں سکتا۔“

اماں کیا سمجھاتی کسی کے سمجھانے سے کچھ ہوتا ہے کیا۔ بات تو اندر سے اٹھتی ہے بڑی آپا کے نہیں اٹھتی تھی سو نہیں اٹھی اور پھر دعویٰ ہی چلی گئی۔ چوتھا مہینہ لگ گیا تھا سسرال والے تو سمجھو بھول ہی بیٹھے تھے اماں نے مشہور کر دیا کہ ”حسن خیر سے دعویٰ چلا گیا ہے اس لئے یہاں چھوڑ گیا ہے اس کو۔“

چار دن چہ میگوئیاں ہوئیں اور پھر زبانوں نے ذائقہ بدل لیا۔ پر اب اماں کو لگتا تھا کہ بات دہنے کی نہیں ہے رات میں شوہر گھر آیا تو اس کے سر ہو لیں۔

تعویز گندے جھاڑ پھونک سب کروایا گیا۔ چلے بھی گئے پر نہ کٹی تو بڑی آپا پر سے یہ مصیبت نہ گئی۔
چھ سات ماہ ہو گئے تھے بڑی آپا کی حالت سمجھنے میں ہی نہ آتی تھی بلکہ مزید خراب ہونے لگی تھی کبھی کہتی کہ کمرے سے بدبو آتی ہے اور سرف ذال کر پورا کمرہ دھوتے دھوتے شام کر دیتیں کبھی ہر گھنٹے بعد نہانے گھس جاتیں اور کبھی دس دس دن تک پانی کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ اب تو سر میں جو میں بڑ گئی تھیں جسم سے بدبو آتی تھی۔ آنکھیں اندر جا دھنسی تھیں ہفتوں کچھ نہ کھاتی تھیں اور جو کبھی کھانے پیئتی تو سات سات روٹیاں ڈکار جاتیں۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

اماں نے کوشش تو بہت کی مگر بات چھپی نہ رہی چھوٹی کے سسرال والے بھی آئے اور نعمان بھائی بھی ہفتہ رہ کر چلے گئے۔ محلے والے آ کر اب آنا چھوڑ گئے تھے رہ گئی غریب اماں، بابا، بڑی آپا اور ان کا جن لگتا تھا جن تو عاشق ہے ہی بڑی آپا بھی کم عاشق نہ تھیں اس پر۔ اب تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر سنگھار کرنے لگی تھیں سرخی پوڈر لگا کر بدن کو خوشبوؤں میں رچا کر کمر بند کر اینٹنی صبح نئی نویلی دہن کی طرح شرماتی پھرتیں اماں اور بابا نے کوششیں تیز کر دیں۔

کوئی بنگالی بابا تھا ہر جمعرات کو گھر آنے لگا اماں بے چاری تو پاگل ہی ہو گئی تھیں بنگالی بابا نے خوب نوٹ کمائے اور نتیجہ کچھ نہیں پھر انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ بڑی آپا کی آنکھوں کی وحشت اب پورے گھر میں پھیل چکی تھی سنانے راج کرنے لگے۔ بابا اماں آپس میں اب بس آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کیا کرتے تھے۔ بڑی آپ تو گویا دنیا جہان سے بے خبر ہو گئیں تھیں۔ ان کو نہ آواز سنائی دیتی تھی نہ سنانا ہولانا تھا۔

پھر ایک دن ساس آن دھمکی اور بڑی آپا کو دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اماں نے بہت کوشش کی تھی کہ بڑی آپا سامنے نہ آئیں لیکن وہ آ گئیں اور وہ واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔ گندی گالیاں، طعنے کو سننے اور جانے کیا کیا جومت میں آتا تھا کتنی جاتی تھی ایک ہی رات تھی

کہ یہ مجھے کیوں لینے آئی ہے میں اس عورت کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ساس بے چاری صحن میں بیٹھی کانپ کانپ کر روئی تھی۔ اماں نے زندگی میں شاید پہلی بار ہی بڑی آپا پر ہاتھ اٹھایا تھا اور ساس کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کر بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہاں سننے کو تیار تھیں اٹھ کر چلی گئیں۔ اگلے دن طلاق نامہ آ گیا۔

گھر پر تو موت کا سا سماں تھا پر بڑی آپا۔ ان سب باتوں سے بے خبر ایک طرف بیٹھی گنگنائی رہیں اور اسی شام انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ بابا نے تو ڈنڈا اٹھا لیا اور بار بار مار ان کا بھر کس نکال دیا اماں بے چاری بے ہوش ہوئی جاتی تھیں کہ اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں پر قصور تو ابا کا بھی نہیں تھا سال بھر سے بغیر شوہر کے یہاں بیٹھی بنی نے حاملہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا وہ بھی کیا کرتے۔

اس مار پیٹ نے بڑی آپا پر بہت اثر ڈالا تھا۔ وہ سب سے خائف ہو گئی تھیں کھانے میں ان کو لگتا کہ اماں نے زہر ملایا ہے۔ پانی میں ان کو کتے بھونکتے دکھائی دینے لگے۔ شروع میں کپڑے پھاڑنے لگیں اور پھر الفنگی ہو کر کمرے میں تپنے لگیں انا تو اب بس بیٹھک میں ہی رہتے تھے بھوک پیاس اڑ گئی تھی دونوں کی کسی عالم کو بھی بلانے سے رہے۔

انہتے بیٹھتے ماں باپ بڑی آپا کے مرنے کی دعائیں مانگتے تھے مگر دعائیں بھی اثر ٹھوچکی تھیں بڑی آپا ایک معمر بن چکی تھیں۔ جن تو بڑا ہی بے غیرت تھا اچھی خاصی نیک اور شریف لڑکی کو متنازعہ بنا دیا تھا۔

نعمان بھائی اس مرتبہ چھٹی لے کر آئے تو ان کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ اماں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ عاملہ ہیں بڑی آپا کا علاج کریں گی۔

عاملہ نے تین چار گھنٹوں کے بعد ہی بڑی آپا کے جن کا راز کھول دیا تھا۔

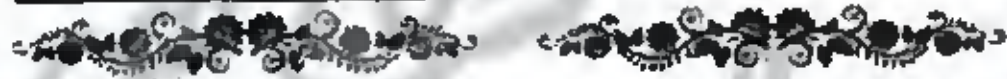
بڑی آپا پر عاشق جن کا نام "شیر و فیروز" تھا۔

پراسرار نمبر کی قسم کی کہانی



رضیہ مہدی

کمر میں ٹیلی فون کے تو عرصہ ہوا تو پھر بالکل ٹیلی فون پر اپنی کس سبیلی سے بات کرتی تھیں۔



شاید..... ماسی پوچھا لگاتے لگاتے چونک سی پڑی۔ انہوں نے شاید نمبر ملا لیا تھا ان کے چہرے پر پھیلے اضطراب نے ماسی کو چونکا دیا۔

ماسی یک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ عجیب سی مسکراہٹ جیسے کوئی تکلیف میں ہو اور درد کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو پھر انہوں نے ریسیور کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر زور سے چیخیں۔

”تبسم! تبسم!!“ ماسی نے اپنا کام چھوڑ دیا اور ان کے بیڈ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تم ٹھیک ہو وہاں۔ تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ناں۔ میرا مطلب تھا تم تو.....“ وہ جیسے سانس کو کھینچ رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے تم بات کر سکتی ہو۔ تبسم تم نے رابطہ کیوں چھوڑ دیا مجھ سے۔“ وہ ہلک رہی تھیں۔

”میں تو بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ تم تو جانتی ہو میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔“

ماسی کو ان کی بات اچھی نہیں لگی ماشاء اللہ وہ دو دو بیٹے، بہویں، پوتے، پوتیاں بھرا پڑا گھر، پھر وہ سوچنے لگی مگر بات تو ان کی ٹھیک ہے۔ اس کی آنکھ بھی بھر آئی۔

وہ بہت دیر سے اپنی پرانی ڈائری الٹ پلٹ رہی تھیں جس میں وہ ٹیلی فون نمبر لکھتی تھیں۔ ایک لمبی پتلی سی ڈائری پتا نہیں کس نے بیگم وقار النساء کو تحفے میں دی تھی، بیگم وقار النساء..... وہ یاد کر کے ہنسنے لگیں۔ کیا دن تھے وہ کہاں گئیں وہ، جن کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے لوگ سوچتے تھے۔ پھر ڈائری یاد آگئی کس نے دی تھی اسے حافظے کو کیا آواز دینا وہ تو کب کا خدا حافظ کہہ کر رخصت پر جا چکا ہمیشہ کے لیے۔

وہ ڈائری پر جھک گئیں اور پھر پورے استغراق سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ پرانے نمبروں کو کاٹ رہی تھیں جن سے مدتوں سے رابطہ نہ ہوا تھا اور ان کی گود میں دھرا ٹیلی فون سیٹ ایسا تھا جیسے کوئی پیارا بچہ، وہ اسے سمیٹے بیٹھی تھیں۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ سے تو ان کا کبھی دوستی کا ساتھ ہوا نہیں بلکہ انہوں نے ہاتھ لگانا ہی پسند نہ کیا۔ کسی نے اصرار بھی نہ کیا۔ اصرار..... وہ ہنس پڑیں اب کہاں تھے ان سے کسی بات کے لیے اصرار کرنے والے۔ اب لے دے کر یہ فون ہی تو تھا ان کی تنہائی کا ساتھی۔

وہ نمبر کاٹتے کاٹتے آخری نمبر پر چونک سی گئیں۔ ”تبسم، تبسم کا نمبر مگر وہ تو شاید..... مگر وہ تو

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

یہ کالج سے ریٹائر ہوئی تھیں پر نپل تھیں۔ میاں سعودی عرب سے آئے تھے کیا کمرہ تھا ان کا، نوکرتھے، وقت ہائے وقت..... باجی روکتی رہیں کھانا کھا کر جائیں مگر بے چارے جلدی ہے بس آپ سائن کر دیں..... کروا کر چلے گئے۔ ماسی ہی گیٹ بند کرنے گئی تو ان کی بیگم نے پوچھا۔ ان کے دو بیٹے تھے ناں۔ وہ کہاں ہیں ماسی کو یاد آیا اس نے بتایا تھا کہ وہ اوپر رہتے ہیں۔ دو پورشن کر لیے ہیں۔ وہ دونوں جلدی سے نکل گئے۔ پھر وہ سوچنے لگی پتا نہیں۔ یہ تبسم کون ہیں روز شام کو ان سے فون پر باجی بات کرتی ہیں۔ خوش رہتی ہیں بتاتی ہیں رات کو آرام سے سو بھی جاتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی باتیں سنتی تھی۔

”اور تبسم تمہاری وہ ہنسی کہاں گئی۔ ہاں یا رہی کچھ وقت کی گرو میں کھو جاتا ہے۔ میں بھی ویسی کہاں ہوں۔ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں نصیحت خانم بن گئی ہوں اور کوئی کیوں میری نصیحتوں کو جھیلے کس کے پاس وقت ہے۔ پتا ہے تبسم میری امی ایک ایک کے بعد سن اور

وہ یاد کرنے لگی کچھ دن پہلے کی بات ہے یا شاید کچھ مہینے پہلے کی۔ بہر حال وہ دو میاں بیوی تھے جو یہ گھر ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ باجی سے شاید دس پندرہ سال قبل انہوں نے ملیر کا کوئی مکان خریدا تھا۔ اب کے ڈی اے نے کہا تھا کہ اپنے نام کروانے یا پتا نہیں کیا کروانے کے لیے انہیں باجی کا ایک دستخط چاہیے۔ وہ بہت ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے گلشن اقبال اور باجی کے لان سے گزر کر سامنے ہی تو باجی کا پورشن تھا۔ ماسی ہی تو انہیں یہاں لائی تھی۔ باجی اس وقت کچن میں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ تب باجی اپنا کھانا خود پکاتی تھیں۔ اب کہاں..... اب تو جب اوپر والوں کو یاد آتا ہے بھیج دیتے ہیں۔ باجی کا دل چاہتا ہے کچھ کھا لیتی ہیں ورنہ پھر میں لے لیتی ہوں ان کا حصہ بھی، کیا کروں۔ وہ دونوں پریشان ہوتے رہے۔ باجی نے دو روٹیاں بھی اتنی دیر میں پکا میں کہ وہ دونوں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اتنا سا کمرہ اور کچن اور یہ کبھی سی ذرا سی جگہ بیٹھنے کی پندرہ سال پہلے

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اردو کہتیں اور وہ ایسی کہ پنجابی میں کہیں کہیں اردو کا کوئی جملہ یا صرف لفظ ہی آ جاتا مگر ہم آپس میں مگن تھے۔ پھر کچھ یوں ہونے لگا کہ میں گھر میں کچھ ایسے بولنے لگی کہ میرے دادا ڈانٹنے لگے۔

بہنی یہ آپ کس طرح کی زبان بول رہی ہیں۔ اچھا ہے کہ آپ کی دوست پنجابی ہیں ان سے ان کی زبانی سیکھیے۔ بابا بلیمے شاہ کی زبان، وارث شاہ کی زبان اور انہیں اپنی سکھائیے مگر یوں نہیں۔ ہائے بے چارے میرے دادا انہیں کہاں پتا چلا کہ نہ وہ، وہ رہی نا میں، میں رہی۔ ہم دونوں کراچی کی زبان بولنے لگے جس میں پھنسا بھی ہوتا ہے۔ وہ زور سے ہنسنے لگیں۔

”خیر سب ٹھیک چلتا رہا پھر ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ہماری دنیا الگ الگ ہو گئی مگر دل ایک ہی رہے۔“ وہ ایسی کھوئی رہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی کہ نای کب کی اٹھ کر جا چکی ہے۔

☆.....☆

پھر وہ اچانک بہت بیمار ہو گئیں۔ مای صبح آئی تو وہ آدھی بیڈ پر تھیں اور آدھی زمین پر، اتفاق سے اتوار تھا۔ وہ تیزی سے اوپر دوڑی، دونوں پورشن میں ناشتا ہو رہا تھا۔ بیگمات نے ترچھی نظر سے دیکھا۔

”ارے ہم کر لیتے تو بھیج بھی دیتے۔“ مگر وہ اتنی بوکھلائی تھی کہ ان پر توجہ دیے بغیر بیٹوں سے مخاطب ہوئی۔

”بھائی! باجی.....“

”کیا بات ہے۔“ بیگمات نے پھر غصے سے کہا۔

”نیچے باجی بے ہوش پڑی ہیں۔“ اب دونوں بیٹے نیچے دوڑے۔

اسپتال گئیں۔ دو دن موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ وہاں بھی کون سا تھ رہتا۔ اس سے پہلے کہ پریشان ہوا جاتا مای نے خود اپنی خدمات پیش کر دیں۔ سب کو سکون ہوا اور پھر وہ دونوں بعد وقار النساء بیگم بڑے وقار اور سکون سے ابدی سکون کی طرف چل دیں۔ ایسبوالینس گھر آ گئی۔

دونوں سلیقہ شعار بہویں اس سے پہلے ہی لان اور اطراف میں اگر بٹیاں جلوا چکی تھیں۔ دریاں اور

سمجھ تو سکتی تھیں بول نہیں سکتی تھیں۔ میں ان سے کہتی تھی خوش رہا کیجیے کہ نصیب ور ہیں آپ۔ نہ بولنا بھی خدا کی نعمت ہے۔ باتیں، عمل برے لگیں تو انسان کھلبلاٹا ہے اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اپنی عمر بھر کی کمائی کی اصلاح کی کوشش ضرور کرتا ہے اور بول پڑتا ہے۔ بس یہی غضب ہے۔ برداشت نہیں ہوتا۔ اب آپ نہیں بول پاتیں چاہ کر بھی تو برداشت کر جاتی ہیں، مجھے ویکھیں نا ڈھنگ سے سنائی دے نہ دکھائی دے مگر جو زبان عمر بھر آرام سے پڑی سوتی رہی اب وہ جاگی ہے تو جیسے عمر بھر کی چپ کی سزا وے رہی ہے سب کو۔ کون برداشت کرے اس کو۔“

پھر جو رونا شروع کیا تو مای گھبرا کر پھر بیڈ سے سر نکا کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر میں یوں لگا شاید وہاں سے تسلی ملی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

”اچھا تم نہ رو، لو میں اپنے آنسو پونچھ رہی ہوں۔ اچھا نہ، پانی پی رہی ہیں بس اب تم بھی چپ ہو۔“

ایک دن بات کر کے خوش خوش دکھائی دیں۔

ماسی کی ہمت بڑھی پوچھ بیٹھی۔

”باجی یہ تبسم باجی کون ہیں۔“

”ہیں..... آں ہاں۔“ وہ چونک سی گئیں پھر مسکرا کر بتانے لگیں۔

”ہم دونوں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بڑی مزے دار دوستی تھی ہماری حالانکہ شکل و صورت، عادات، اطوار، مزاج حتیٰ کہ زبان تک میں فرق تھا۔ میں گول چہرے قدرے سانولے رنگ، موٹی موٹی آنکھوں والی اور ہمیشہ بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی جب کہ ہماری تبسم صاحبہ خوب گوری، لمبی پتلی دہلی تھیں۔ میں کتابوں میں گم اور بقول ان کے زبان بھی گم کر کے بیٹھی رہتی اور وہ شاید زبان کو کبھی آرام دینے کی قائل ہی نہیں تھی اور صرف ہر کھیل میں دلچسپی تھی بس کتابوں میں دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ میں کلاس میں پہلی پوزیشن سنبھالے بیٹھی رہتیں اور وہ میری کاہیوں کو امتحانات میں لے کر رٹے لگاتی۔ میں ایسی اردو بولتی جس کو کلاس کی لڑکیاں گاڑھی

کرنے آئی ہیں۔“
 ”تبسم! کون تبسم؟“ آہستہ آہستہ ایک دوسرے
 کی طرف دیکھا جا رہا تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں
 سوال و جواب ہو رہے تھے۔ مای پیچھے کھڑی تھی اور
 وہی تھی جو واقعی آنسو گر رہی تھی۔ سچے آنسو۔ وہ
 چوکی۔ اسے یاد آیا اپنی مالکن کی بات۔
 ”تبسم تمہارا ایکسڈنٹ ہوا تھا تو ٹانگ میں چوٹ
 آگئی تھی۔“

وہ پھر جیسے دوڑی اور آگے آگئی۔ بہویں چوٹیں
 پاگل ہو گئی ہے۔ پھولی ہوئی سانس میں بولی۔
 ”آپ تبسم ہیں..... آپ تبسم ہیں۔ باجی نے
 آپ کو بہت یاد کیا۔ وہ بے ہوشی میں بھی بس آپ کو ہی
 پکار رہی تھیں۔“ وہ رونے لگیں۔
 ”ہم بھی اسی لیے تو آئے ہیں۔“
 مای قریب آنے لگی۔

ملازمہ نے آہستہ سے اسے دور کیا اور کہا جسے
 صرف مای ہی سن سکتی تھی۔
 ”تمہاری محبت اور محنت کا صلہ تمہیں مل جائے گا۔“
 پتا نہیں مای نے سنایا نہیں وہ تو جیسے کرنٹ سے
 بے ہوش ہو گئی تھی۔

جتنا زہ تیار ہو چکا تھا۔ وہ ویل چیئر کو وہاں لے
 گئی۔ لوگ خود بخود ادھر ادھر ہو گئے انہوں نے چہرہ
 دیکھا اور آہستہ سے خدا حافظ کہا۔
 ویل چیئر مڑی اور پھر لوگوں کو لگا کہ شاید پل بھر
 میں وہ سب کچھ وہاں نہیں تھا جو انہوں نے دیکھا تھا یا
 شاید نہیں۔ سب لوگ جادو کی چھڑی کے اثر سے باہر
 آگئے تھے۔ وہ مای سے حساب کتاب لے رہے تھے
 مگر اسے جو پتا تھا بتا دیا تھا۔

دونوں بہویں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ ان
 کے گھر میں لینڈ لائن کہاں تھی۔ انہوں نے تو کب کی کٹوا
 دی تھی۔ سب کے پاس اپنے موبائل فون تھے۔ سب ہی
 انٹرنیٹ کے قیدی تھے۔ انہیں اس کی ضرورت کہاں تھی۔
 البتہ مای نے نوکری چھوڑ دی تھی اسے بھی ضرورت نہیں
 رہی تھی اسے واقعی بہت کچھ مل گیا تھا۔

☆☆☆

سفید چاندنیاں، بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ بازے پڑھ
 رہے تھے۔ بہویں خود بھی سوگوار سی آکر بیٹھی تھیں۔
 تھوڑی سی دیر میں پڑوسی اور اعزاء آنے لگے۔ وہ پھر
 سے رونے لگیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ آنسو رک نہیں
 رہے تھے۔ ماں جیسی ہی جانا اب ان کا دنیا سے جانا
 شاک تھا۔ کوئی بزرگ خاتون سمجھا رہی تھیں۔
 ”بہت خدمت کی تم لوگوں نے، قسمت کی دھنی
 تھیں، میاں چاہنے والا تھا، بیٹے تابعدار رہے،
 بہویں خدمت گزار لگیں۔“

کوئی خاتون سب کو چنے پڑھنے کی طرف بل رہی تھی۔
 ”آئیے رونے سے بہتر ہے زیادہ سے زیادہ
 مرحومہ کو پڑھ کر پیچھے اس میں زیادہ ثواب ہے۔“
 تدفین کا انتظام ہو رہا تھا۔ گھر اتنا بڑا تھا۔ کس چیز کی
 تھی۔ پڑوسیوں کے پاس سے چائے آگئی تھی۔ صبح
 سے رونا دھونا ہو رہا تھا۔ بے چارے وارثین کے
 چہرے زرد ہو رہے تھے۔ پیارے کی محبت میں
 مرنے کا جی چاہتا ہے۔ ”امی امی۔“ بہویں
 دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ عورتیں ایک دوسرے
 سے کہہ رہی تھیں۔

”بیٹی نہیں تھی مگر ایسی بہویں بیٹی سے کم ہوتی ہیں
 کیا۔“

ایسے میں ایک لموزین دروازے پر آکر رکی۔ گھر
 کا بڑا سا گیٹ ایک چر کی آواز کے ساتھ خود پورا کھلتا
 چلا گیا۔ پیچھے والی گاڑی سے کچھ گارڈ نائپ لوگ
 اترے اور انہوں نے دونوں طرف کا راستہ روک لیا۔
 لموزین کا دروازہ کھولا اور اس پر ایک ویل چیئر لگائی
 گئی۔ پھر ماحول پر جیسے ایک عجیب سا سکوت طاری ہو
 گیا۔ کوئی جادو کی چھڑی پھر گئی۔ وہ چور تھی، پری تھی یا
 کوئی اور آسمانی مخلوق جو سفید سایا سا تھی۔ سر سے پیر
 تک سفید لباس میں جب کہ اس نے چہرے پر نقاب
 بھی سفید لگائی تھی پر چہرے سے ایک روشنی نکلتی رہی
 تھی۔ جو ویل چیئر ٹھیک کر رہی تھی وہ شاید ملازمہ
 تھی۔ سب چونک گئے مگر بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

”یہ کون ہے؟“

”تبسم صاحبہ محترمہ وقار النساء بیگم کو رخصت

پراسرار نمبر کی چوتھی خاص کہانی

سچ گیا ایمان



افتخار چوہدری

اس سٹلی عامل کا قصہ جو کالے علم کے آخری درجے تک رسائی حاصل کر چکا تھا مگر
ایمان والوں کو نڈا کفر کی دلدل سے اس طرح نکالتا ہے کہ قتل بھی ہو سکتا ہے

”مور کھ اگر اپنی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر
تمہیں شانے کی ہڈی لانے کا کشت تو اٹھانا ہی پڑے
گا۔“ لٹاں والی سرکار نے جلالی لہجے میں سرخ
آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تو اس
کے منہ سے نکلنے والے بدبو کے بھکے سے میرا دماغ
چکرا کر رہ گیا، چاہنے کے باوجود میں ناگواری کا
اظہار نہ کر سکا کیونکہ اس کی سرخ آنکھوں میں موجود
مقتناطیسی کشش نے مجھے اپنے حصار میں لے کر پینا
ناز کیا ہوا تھا۔ میں بنا بلیکس جھپکائے ایک ٹک اس
کی طرف دیکھے جا رہا تھا، کچھ دیر بعد اس نے
اچانک اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے
میں چلا گیا، اس کی نظریں بنتے ہی مجھے ایک زوردار
جھٹکا لگا اور ایسے محسوس ہوا جیسے میں اس کی قید سے
آزاد ہو چکا ہوں اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت
واپس آگئی ہے۔

”مگر بابا جی میں شانے کی ہڈی کہاں سے
لاؤں گا کیونکہ قصاب جانتے ہیں کہ اس ہڈی پر سٹلی
اور کالا جادو ہوتا ہے اس لیے وہ ہڈی کو توڑے بنا
نہیں چھوڑتے۔“ میں نے منمناتے ہوئے اپنی جان

چھڑانے کے لیے عذر تراشا۔
کڑکی کرتے ہو سارا دن فائلیں ادھر سے ادھر کر
کے خوب پیسے کھاتے ہو تو کیا اپنی محبت کے کارن تم ما
س کا وہ پورا ٹکڑا نہیں خرید سکتے جس کے اندر وہ ہڈی
ہوتی ہے۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی میری بات
کا جواب دیا، میں اس غلیظ بابے کے منہ سے اپنی
نوکری کے بابت سن کے مبہوت رہ گیا۔ اب تو مجھے
حقیقتاً اس سے خوف آنے لگا تھا، میں زندگی میں پہلی
بار اس سے مل رہا تھا مگر وہ میرے بارے میں ہر
بات پہلے سے جانتا تھا جیسے وہ مدتوں سے میرا شناسا
ہو۔ کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس
نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں، مسکرانے
سے اُس کے گہرے پیلے دانت جن پر سیاہی غالب
آچکی تھی نظر آنے لگے۔ اس کی مسکراہٹ میں
خباثت نمایاں تھی شاید اس نے بچپن سے بال
نہیں کنوائے تھے جس کی وجہ سے اس کے بال موٹی
رسیوں جیسی لنوں کی صورت اختیار کر چکے تھے، جسم
ڈھاپنے کے نام پر جسم کے زیریں حصے پر ایک انتہائی
گندے کپڑے کا لنگوٹ بندھا ہوا تھا جو اپنا اصل

Downloaded From Paksociety.com

کوشش کر چکا تھا مگر وال قلمی نظر نہیں آرہی تھی، دو بار میرے والدین رشتہ مانگنے کے نام پر ان کے گھر سے بے عزت کر کے نکالے جا چکے تھے، دوسری بار تو میں خود بھی انہیں فوزیہ کے گھر بھیجنے کے حق میں نہیں تھا مگر فوزیہ نے مجھے پکا یقین دلایا تھا کہ اس بار اس کے گھر والے رشتہ دے دیں گے، جب میں نے امی ابو کو ایک بار پھر فوزیہ کے گھر جانے کے لیے کہا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئے تھے، پھر میں نے خودکشی کی دھمکی دی تو انہیں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے، لیکن پہلے کی طرح اس بار بھی میرے فرشتہ صفت والدین کو بے عزت کر کے نکالا گیا تو میں واقعی شرم کے مارے سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا، میں فوزیہ کی محبت میں تمام حدیں پھلانگ چکا تھا اسی لیے تو بات میرے والدین کی تک تک آپہنچی تھی اس سانچے کے بعد میں حتمی طور پر فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اب کبھی اس دشمن جاں کی شکل تک نہیں دیکھوں گا، مگر دوسرے دن ہی اس نے

رنگ اور پرنٹ تو نہ جانے کب کا کھو چکا تھا اب تو وہ محض ایک چیتھڑے سے مشابہہ تھا جو کئی جگہ سے پھنا ہوا تھا، اور عریانی کو چھپانے کی بجائے مزید عیاں کر رہا تھا اس پر اسرار شخصیت کے جسم پر گوشت نام کو بھی نہیں تھا اسے دیکھ کر بدھ مت کے بانی گریٹ بודה کا وہ مجسمہ ذہن میں ابھر رہا تھا جس میں وہ اکثر سادھی جمائے بیٹھا ہوتا ہے، اس مجسمے کی طرح اس باپے کی جسمانی ہڈیوں پر بھی گوشت کی بجائے محض چمڑا چڑھا ہوا نظر آ رہا تھا، تمام پسلیاں اور ہڈیاں علیحدہ علیحدہ گنی جاسکتی تھیں، مجموعی طور پر وہ ایک کراہیت آمیز بوڑھا شخص تھا جو غذائی کمی کا شکار نظر آ رہا تھا، نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے فوزیہ کی باتوں میں آ کر یہاں آنے کی حامی بھری تھی فوزیہ میری بڑوسن اور بچپن کی محبت تھی ہم شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس کی فیملی اپنے خاندانی اقدار اور کئی مجبوریوں کی وجہ سے کسی بھی صورت میں اسے میری دلہن بنانے پر راضی نہیں تھے، میں ہر ممکن

جیسے ابھی الفاظ میرے منہ میں ہوں گے اور وہ میری بات مان کر میرے ساتھ چل پڑے گی۔
 ”چلو کورٹ میرج کر لیتے ہیں یقین مانو چند دن میں ہی سب راضی ہو جائیں گے۔ میں سب سنبھال لوں گا پلیز مجھ پر ایک بار اعتماد کرو۔“ آخر کار میں اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا، میری بات سن کر اسے ایسے جھٹکا لگا جیسے اس کا ہاتھ برقی رو سے چھو گیا ہو۔

”میرے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ وہ شرم سے ہی مر جائیں گے۔“ اس نے رو ہانسی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”ہاں میرے والدین ہی شرم پر وف ہیں جو تمہارے گھر والوں سے دو دو بار بے عزت ہونے کے باوجود ڈھٹائی سے زندہ ہیں۔ جاؤ بی بی جاؤ اپنے والدین کی عزت کو سنبھالو کسی نے ہمیں یہاں اکٹھے دیکھ لیا تو تمہارے گھر والوں کی عزت مٹی میں مل جائے گی اور پھر انہیں شرم سے مرنا پڑ جائے گا۔“ میں نے غصے سے ابلتے ہوئے لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے پلٹ آیا۔

”نزا کت سنو، سنو، پلیز سنو۔“ فوزیہ نے عقب سے مجھے کئی بار پکارا مگر میں نہیں رکا تو وہ دونوں چھتوں کے درمیان موجود پانچ فٹ کی دیوار کو ایک ہی جست میں پھلانگ کر ہماری چھت پر آگئی اور مجھے پیچھے سے ہی چھٹی ڈال کر کھڑی ہوگئی، میرا نامراد دل ایک بار پھر سے امید و ناامیدی کے درمیان ڈولنے لگا۔

”نہ تمہارے گھر والے مانتے ہیں اور نہ تم میری بات مان رہی ہو تو اس طرح چھپ چھپ کر ملنے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہ جاتا۔“ میں نے بے بسی کی کیفیت میں جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اپنے غصے کو کنٹرول کر کے ٹھنڈے دل سے میری بات سنو تو ہو سکتا ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکل ہی آئے۔“ اس نے نرم و ملائم لہجے میں کہا۔

”بتاؤ اگر تمہارے پاس کوئی قابل عمل حل ہے تو۔“ میں نے ایک گہری سانس لیکر خود کو نارمل کرتے

میرے سل فون پر منیج بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے کوئی ضروری بات کرنی ہے، تو میرے خود کا کیا ہوا فیصلہ تنکوں کی طرح ہوا میں بکھر کر رہ گیا، ہمارے گھر کی چھت ان کی چھت سے ملحق تھی ہماری اکثر ملاقاتیں وہیں ہوا کرتی تھیں، میں اس کے بتائے ہوئے وقت پر وہاں پہنچ گیا، وہ پہلے سے ہی چھت پر موجود تھی۔

”اب کیوں بلوانا ہے کیا ابھی ہماری عزت افزائی میں کوئی کسر رہی ہے۔“ میں نے سرو لہجے میں بے رخی سے کہا، تو مجھے محسوس ہوا جیسے آج سے پہلے میں اتنے غصے میں کبھی نہیں آیا ہوں گا۔

”اوہو جتا ابھی تک غصے میں ہیں، اوکے یار سوری اور وہ بھی کان پکڑ کر۔“ فوزیہ نے مسکین سی صورت بنا کر اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا، تو غصے کی وجہ سے میری رگوں میں بہتا ہوا خون جو تیز رفتاری کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا یکدم سرد ہونے لگا اور اس کی رفتار بھی کم ہونا شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ہی دل پر رکھی ہوئی سرد میری کی سل جیسے تیزی سے پھٹنے لگی۔

”مجھے خود ای نے تمہارے گھر والوں کو دوبارہ بلوانیکے لیے کہا تھا مگر پھر آخری لمحوں میں ایک بہت امیر شخص کا میرے لیے رشتہ آیا تو سب کچھ الٹ ہو گیا۔“ فوزیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں صفائی دی تو میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا اور میں اپنے والدین کی بے عزتی بھول کر ایک بار پھر پہنچ گیا۔

”اوکے ٹھیک ہے مان لیتا ہوں کہ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا تو وہ کھل اٹھی۔ ”میں نے آج تک تمہاری کوئی بات رد نہیں کی کیا تم ہماری محبت کی خاطر میری ایک بات بھی نہیں مان سکتی ہو۔“ میں نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا، تو اس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

”نزا کت ایسا کیوں کہہ رہے ہو تم حکم تو کرو، میری جان بھی تمہارے لیے حاضر ہے۔“ فوزیہ نے مجھ سے بھی زیادہ جذباتی زبان استعمال کی تو مجھے لگا

تم مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو، جب تمہارا کام ہو جائے تو میرا ایک چھوٹا سا کام کر دینا۔“ بابے نے ایک بار پھر سے اپنی پر اسرار مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میرا کام ہو گیا تو آپ جو کہو گے میں کروں گا۔“ میں نے دھڑکتے دل سے وعدہ کر لیا، فوزیہ سے شاوی کا سن کر ہی میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی تھی۔

”دیکھو بالک تم ہم سے ویدہ کر رہے ہو کے تم فوزیہ سے سگائی کے بعد میرا کام کرو گے، اب اگر تم ویدے سے مکرے تو پھر ہم بھی رنگ میں بھنگ ڈال دیویں گے۔“ بابے نے وعدے کے ع کو بے سے بدلتے ہوئے کہا۔

”آپ بتائیں میں پہلے ہی وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے اس کی سلی کے لیے کہہ دیا۔

”نہیں بالک ہمیں تمہارے ویدے پر یقین ہے، اب تم جاؤ اور جا کر ہڈی کا بندوبست کرو۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کوئی بات کرنے سے روکتے ہوئے کہا، اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے مراقبہ کی حالت میں چلا گیا، میں چند ثانیے خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر واپس چلا آیا۔

اگلے دن میں گھر کے قریب بازار میں موجود تمام قصابوں کی دکانیں کھنگال چکا تھا، مگر کسی کے پاس مطلب کا پارچہ نہیں تھا، دوسرے محلے کے بازار سے بالآخر مجھے مطلوبہ ہڈی والے گوشت کا پورا پیس مل گیا، وزن کرنے کے بعد قصاب اس کی بوٹیاں کرنے لگا تو میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ گھر جا کر خود ہی کر لوں گا۔

”بیٹا اس میں سے نکلنے والی ہڈی ضرور توڑ دینا اگر کسی خبیث کے ہاتھ لگ گئی تو کئی غریبوں کا خانہ خراب کر دے گا۔“ قصاب نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا، تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گوشت کے پارچے کو تھیلے میں ڈال کر موٹر سائیکل پر اپنے آگے رکھ لیا، اور دریا کی طرف چل پڑا۔

ہوئے کہا، اور اپنے سینے پر سے اس کے بازوؤں کا حلقہ کھول کر اس کی طرف گھوم گیا۔

”میری سہیلی نے ایک بہت ہی کرنی والے بزرگ لٹاں والی سرکار کے بارے میں بتایا ہے جو شہر کے مضافات میں دریا کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں، وہ بہت پینچے ہوئے بزرگ ہیں، تم اگر ان کی خدمت میں حاضری دو تو ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، پلیز انکار مت کرنا۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر میری منت کرتے ہوئے کہا۔ میں ایسے دو نمبری بابوں کے سخت خلاف تھا، اس لیے میرے ذہن نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، مگر فوزیہ نے اپنی سہیلی کی زبانی اس کرنی والے بابے کی کرامات کے ایسے نقشے کھینچے کہ مجھ جیسا حقیقت پسند انسان بھی سبز باغ دیکھنے پر مجبور ہو گیا، اور اگلے دن ہی میں آفس سے چھٹی کر کے اس بابے کو ڈھونڈتا ہوا دریا کے پاس ویران جنگل میں پہنچ گیا۔

☆.....☆

اب اس منحوس بابے نے میرے بتائے بغیر ہی میری ساری پریشانی مجھے بتا دی جس سے میں بہت متاثر بھی ہو گیا، اب بابا کا رخ کرنے کی حای تو بھر رہا تھا مگر مجھے کسی جانور کے شانے کی ہڈی اور سات عدد لیموں لانے کا کہہ رہا تھا جبکہ میں تو یہی سوچ کر آیا تھا کہ بابا مجھے کوئی تعویذ وغیرہ بنا کر دے گا، یا پھر کوئی چلہ کر کے میرا کام کر دے گا، اب مرنا کیانہ کرتا کے مصداق حای بھرنی پڑی۔

”ٹھیک ہے بابا جی، میں ہڈی اور لیموں لے آؤں گا، مگر آپ کی فیس کیا ہوگی۔“

بالآخر میں نے وہ بات کی جس سے اسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔

”میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔“ اس نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا، تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، کہ وہ واقعی کہہ رہا تھا، کہ فیس نہیں لوں گا۔

”بابا جی میں سمجھا نہیں۔“ میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

”میں تم سے کوئی روپیہ پیسہ نہیں لوں گا، ہاں اگر

ایک ویران جگہ دیکھ کر میں نے وہاں گوشت میں سے ہڈی کو علیحدہ کر لیا، اور ایک بار پھر بابے کے پاس پہنچ گیا، وہ جھوپڑی کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے سناہمی لگائے بیٹھا تھا، میرے پاس پہنچتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں، جو خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

”آگئے بالک میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا اور میرے ہاتھ میں موجود تھیلا لے لیا، اور اس میں سے ہڈی نکال کر اسے غور سے دیکھنے لگا، اسی دوران میں نے پولی تھن کا بیگ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ جس میں لیٹوں تھے۔

”یہ تم نے اچھا کیا کہ ماس کا پورا ٹکڑا خرید کر خود ہڈی نکالی ورنہ قصاب تو اس ہڈی کو توڑ دیتے ہیں یا پھر داغی ضرور کر دیتے ہیں، سمجھ لو تمہارا کام ہو گیا۔“ اس نے ہڈی کو واپس تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”بابا جی کیا ایک بار پھر مجھے اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجنا پڑے گا۔“ میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا، کیوں کہ اب تو یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا، کہ میرے والدین ایک بار پھر رشتے کے لیے جاتے، چاہے اس بار میں سچ میں ہی خودکشی کیوں نہ کر لیتا۔

”نہیں اب تمہارے گھر والوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی والے خود چل کر رشتہ دینے آئیں گے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، تو مجھے لگا کہ پہلی ملاقات کی طرح اس بار پھر اس کی آنکھوں کی کشش نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ مجھ پر بے خودی طاری ہونے لگی تھی۔

”اب آپ بتائیں میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟“ میں نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تم کس دن پیدا ہوئے تھے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا تو مجھے اس کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، مجھے بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ہوا

میں معلق ہوں، اور میرے ارد گرد دھند چھائی ہوئی ہے۔

”جی میں فلاں سن میں پیدا ہوا تھا، میں نے اپنی پیدائش کا سال بتاتے ہوئے کہا۔“

”نہیں بالک میں جنم کی تاریخ نہیں پوچھ رہا۔“

چلو ہم خود ہی تمہیں بتا دیتے ہیں، کہ تم کب پیدا ہوئے تھے، اس دن سورہہ گرہن لگا ہوا تھا، اور پھر اسی رات کو چندرما کو بھی گرہن لگا تھا، ایسا ہزاروں سال بعد ہوتا ہے، کہ ایک ہی دن اور رات میں سورج اور چاند کو گرہن لگے، تمہارا جنم اسی خاص گھڑی میں ہوا تھا، اور اس خاص گھڑی میں پیدا ہونے والے بچوں میں سے آج صرف تم زندہ ہو، اسی لیے اب پوری دنیا میں تم اکیلے ہو جو میرا کام کر سکتے ہو۔“ یہ باتیں سن کر بے خودی کی کیفیت میں ہونے کے باوجود میرے روتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

”میرے والدین نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا اس بارے میں۔“ میں نے حیرانگی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے ان کے لیے یہ کوئی اہم بات نہ ہو، مگر ہمارے لیے تو یہ بات تمہیں بہت مہان بنا دیتی ہے، اب تم جاؤ کل تک تمہارا کام ہو جائے گا، مگر یاد رکھنا جب تمہارا کام ہو جائے تو تمہیں اپنا ویدہ نبھانے کے لیے واپس آنا ہوگا، اور اگر تم نہ آئے تو تمہیں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا، تب ہم سے گلہ مت کرنا۔“ بات کے اختتام تک اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ اس وقت تک میرے ارد گرد سے دھند چھٹ چکی تھی، میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا چاہا، مگر اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے ہی وہاں سے جانے کا کہا، تو میں ذہن میں بے شمار سوال لیے واپس آ گیا۔

☆.....☆

اگلے دن جب میں سہ پہر کے وقت آفس سے گھر پہنچا، تو فوزیہ کے والدین کو اپنے گھر میں دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ لوگ خوش گوار موڈ میں امی ابو سے کہیں لگا رہے تھے، مجھے دیکھتے

اپنی والدہ سے بھی تصدیق کرتی تھی۔ بابے نے واقعی سچ کہا تھا، میں ایسے ہی دن پیدا ہوا تھا جب سورج کو گرہن لگا تھا اور اسی رات کو چاند گرہن بھی لگا تھا۔

”بابا جی بتائیں میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔“ میں نے انتہائی فرمانبرداری سے پوچھا۔

”بتا دیں گے بتا دیں گے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، بالک ویسے تمہارے والد نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا، انہیں چاہیے تھا کہ کل ہی فوزیہ کو تمہاری دلہن بنا کر گھر لے آتے، تو اسی بہانے تمہیں ہمارا کام کرنے سے پہلے معاوضہ تول جاتا۔“ بابے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید کھینچتے ہوئے خباثت بھرے لہجے میں کہا، تو میرے پاس اس کی مسکراہٹ میں شامل ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

”کوئی بات نہیں بابا جی میں کچھ دن مزید انتظار کر لوں گا، آپ نے ہمارا گھر خوشیوں سے بھر دیا ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے، آپ بتائیں میرے لیے کیا حکم ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

”اتنا اصرار کر رہے ہو تو بتا ہی دیتے ہیں بابے نے پہلو بدلتے ہوئے کہا، تمہیں تین کام کرنے ہیں جب تم ایک کام کر لو گے تب ہم تمہیں دوسرا اور پھر تیسرا کام بتائیں گے۔ سب سے پہلے تو تمہیں ہمارے لیے کچی مٹی کے بنے ہوئے سات چراغوں کا بندوبست کرنا ہو گا۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، جب میں یہاں آیا تھا تو اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں، مگر اب وہ نارمل لگ رہی تھیں۔

”سمجھ میں آپ کا کام ہو گیا، اور کوئی حکم۔“ میں نے تابعدار مریدوں کی طرح پوچھا۔

”چراغوں کو جلانے کے لیے بھی تو کچھ چاہیے ہو گا، اس نے میری توجہ تیل کی طرف دلائی، جی میں تیل بھی لیتا آؤں گا۔“

”تیل نہیں بالک ہمیں کچھ خاص چیز چاہیے۔“ بابے کے لہجے میں اس بار کچھ خاص بات تھی جس کا میں اور اک نہیں کر پاتا تھا۔

ہی آنٹی نے اٹھ کر میرا ہاتھ چومنا، اور انکل جو میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، مجھ سے گلے لگ کر ایسے ملے جیسے وہ میرے بچپن کے لنگوٹے ہوں۔ یہ تو معجزہ ہو گیا تھا، میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا، مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں، میں بار بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب حقیقت میں ہے۔

”ٹھیک ہے شفیق صاحب اگر آپ کہتے ہیں تو ہم یہ محرم کے چند دن رُک جاتے ہیں ورنہ اسلام میں تو کوئی پابندی نہیں ہے ان دنوں میں نکاح کرنے کی۔ میری مائیں تو آج ہی نکاح کر دیتے ہیں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے، ولیمہ وغیرہ محرم کے بعد کر لیں گے۔“ انکل نے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔

”نہیں سلیم صاحب ان سوگ کے دنوں میں خوشی کی تقریب مناسب نہیں ہے، اور پھر لوگ بھی باتیں بنائیں گے، ہم محرم کے بعد دھوم دھام سے شادی کریں گے۔“ ابو نے حتی لہجے میں جواب دیا۔

”چلیں بھائی صاحب جیسے آپ کی مرضی بہر حال فوزیہ آپ لوگوں کی امانت ہے ہمارے پاس، آپ کی جب مرضی ہو آکر لے جائیں۔“ آنٹی نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”بیگم بیٹے کا منہ تو بیٹھا کر واؤ۔“ انکل سلیم نے کہا تو قہقہوں کی گونج میں انہوں نے پلیٹ میں سے گلاب جامن اٹھا کر میرا منہ بیٹھا کر وا دیا، منزل کو اتنا قریب دیکھ کر میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی، اس وقت میرے بہن بھائیوں اور والدین کے چہروں پر چند دن پہلے فوزیہ کے گھر والوں کی طرف سے کی گئی بدسلوکی کا شائبہ تک نہیں تھا، جو میرے لیے مزید دلی سکون کا باعث بن رہا تھا۔

اگلے دن میں منجائی لے کر بابے کے جھونپڑی نما آستانے پر حاضری دینے پہنچ گیا۔ میں آج سے پہلے تک ان تعویذ گنڈے کرنے والوں کو خبیثوں کی لسٹ میں شمار کرتا تھا، مگر آج اس بابے کی تمام تر کراہیت آمیز شخصیت کے باوجود میں اس کے سامنے مجسم تابعدار مرید کی طرح بیٹھا تھا، میں نے

”آپ حکم کریں آپ جو کہیں گے میں لے آؤں گا۔“ میں نے ایک بار پھر انگساری سے جواب دیا۔

”سور یا کتے کی تازہ چربی چاہیے ہو گی۔“ بابے نے اتنے سادہ سا لہجے میں اپنی ڈیمانڈ بتا دی، جیسے وہ کسی حلال جانور کی چربی لانے کا کہہ رہا ہو، میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کسی سور یا کتے کو ذبح کر کے اس میں سے چربی نکالنے کا سوچ کر ہی مجھے ایسا آگئی۔ ”بابا جی میں نے تو کبھی مرغی بھی ذبح نہیں کی، یہ کام میں کیسے کروں گا، آپ کی جتنے پیسے چاہیے ہیں وہ مجھ سے لے لیں اور کسی سے منگوا لیں۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا، اس خبیث کی بات سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔

”تم ایسے کرو جو پیسے مجھے دے رہے ہو وہ کسی اور کو دے کر اپنی اور فوزیہ کی شادی کا تعویذ بنوا لینا، ہو سکتا ہے اس طرح تمھاری اس سے شادی ہو جائے میں نے جو تمھارا کام کیا ہے، وہ ابھی ختم کئے دیتا ہوں۔“ بابے نے برا سامنہ بناتے ہوئے دھمکی دی تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اچانک میرے ذہن میں ہماری گلی سے کوڑا اٹھانے والے ولیم مسیح کا خاکہ ابھرا تو مجھے مسئلے کا حل نظر آ گیا۔

”ٹھیک ہے بابا جی آپ کو کتے کی تازہ چربی بھی مل جائے گی۔“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”یہ کام تمہیں اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوگا، ولیم مسیح کی لائی ہوئی چربی ہمارے کسی کام کی نہیں ہو گی، یاں تم اس سے کسی حد تک مدد لے سکتے ہو مگر چربی تمہیں خود نکالنی ہوگی، اور ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا، تم جب اسے ذبح کرو تو اپنے مذہب کے مطابق ذبح کرنا، جیسے حلال جانور کو ذبح کرتے وقت تکبیر پڑھتے ہو اس کو بھی بالکل ویسے ہی ذبح کرنا۔“

بابے کے منہ سے ولیم مسیح کا نام سن کر میں سناٹے میں آ گیا، اس کا مطلب کہ اسے میرے دل میں

ابھرنے والے خیال تک رسائی تھی، اس نے مجھے عجیب دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا، ایک طرف میری محبت تھی، اور دوسری طرف یہ بوزھا شیطان مجھ سے شیطانی کام کرانا چاہتا تھا، جسے کر کے ہی فوزیہ میری ہو سکتی تھی، میں نے بے بسی کے عالم میں ہاں کرنا چاہی تو زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، میں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی، تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اب تم جاؤ اور تب ہی لوٹنا جب چراغ اور چربی لے آؤ، وہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اٹھا اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا، میں بوجھل قدموں سے گھر واپس آ گیا، بار بار ایک ہی خیال ذہن میں آ رہا تھا، کہ اگر کسی نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو میں اپنی فیملی سمیت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، رات کو فوزیہ سے بھی ملاقات ہوئی پر میں اسے بابے کی شیطانی ڈیمانڈ بتانے کی جرأت نہیں کر سکا۔

☆.....☆

اگلی صبح جب ولیم مسیح کوڑا اٹھانے آیا تو میں پہلے سے اس کا منتظر تھا، میں نے بات کرنے سے پہلے نذرانہ دینا مناسب سمجھا، اتنے سارے لال نوٹ دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا، مگر پھر میری بات سننے کے بعد اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی۔

”باؤ جی کیا آپ کو ایک ہی چاہیے؟“ اس نے ایسے پوچھا جیسے یہ اس کے لیے کوئی کام ہی نہ ہو۔

”یار میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے نہیں میرے ایک دوست کو ضرورت ہے، اگر تم میری بتائی ہوئی جگہ پر بروقت پہنچ گئے تو مزید اتنے نوٹ دوں گا۔“ میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا، تو مزید رقم کا سن کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور پھر جب میں مقررہ جگہ پر پہنچا، تو وہ ایک صحت مند کتے کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

”باؤ جی پھر کبھی ضرورت ہو تو مجھے ضرور کہنا۔“ اس نے نوٹ گنتے ہوئے کہا۔

”ہاں ضرور۔“ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں !!

آئیے! دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہو جائیے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے..... خود کو منور بننے والے قلم سے.....!

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کی نگاہ پر پڑتے ہیں۔

شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے۔

تو پھر قلم اٹھائیے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے

میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمائیے۔

ماہنامہ دوشیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کے خیالات کو، آپ کے جذبات کو

ہوسکتا ہے عنقریب منعقد ہونے والی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتہ:

II C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کس جگہ

دش

سچی کہانیاں کے چرچے ہیں

ان بے گناہ سچی کہانیوں کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں کو برستے دیکھتے ہوئے غموں کو کرتے اور ہمیں ان کے بھیتے چہرے پر سچی کہانیاں کہے فارمین وہ ہیں جو سچائیوں کے مشکوکی اور انہیں ہر دل رسنے والے ہیں

میں وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ سچی کہانیاں میں آپ بتائیں جگہ بتائیں اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں ناقابلِ غفلت کہانیاں دلچسپ و سنسنی خیز کہانیاں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین امریکہ و میان دلچسپ نوں جھونک احوال۔ سب کے لیے سچی کہانیاں ہیں۔

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پیرل پبلی کیشنز: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جانی کمرشل۔ ڈیڑھ گھنٹہ آؤٹ رینج ڈیلیوری۔ 7 کراچی۔ فون نمبر: 021-35893121-35893122

www.paksociety.com

اور استقامت سے باہر تھے، میں بری طرح سے پھنسن چکا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ دوسرا کام بتائیں۔“ میں نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔

”دوسرا کام یہ ہے کہ جب کسی نوجوان کنواری لڑکی کی لاش کو دفنایا جائے تو تم نے اسی رات اس کی قبر کھول کر اس کے کانوں اور ناک میں موجود روئی نکال کر لاؤ گے، میں اسی روئی سے چراغوں کی بتیاں بناؤں گا۔“ اس کی بات مکمل ہونے تک میرے جسم کے تمام مساموں نے بیک وقت پانی پسینے کی شکل میں خارج کرنا شروع کر دیا تھا فضا میں اچھی خاصی خشکی ہونے کے باوجود میں پسینے میں ایسے نہا گیا جیسے کسی نے پانی کی بھری ہوئی بالٹی مجھ پر انڈیل دی ہو، میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو کر رہ گئی، میرے لیے ناچائے ماندن ناچائے رفتن والی صورت حال بن گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے فوزیہ کا عکس گھوم رہا تھا وہ مجھے مل تو رہی تھی مگر اس کی قیمت میری توقع سے کہیں زیادہ لگائی جا رہی تھی میرے خود کے اندر جنگ چھڑ چکی تھی بالکل ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر دو قوتیں آپس میں بھڑگئی ہوں اور ان کے درمیان گھسان کا رن پڑ گیا ہو، ایک دل چاہ رہا تھا کہ لعنت بھیجو اس محبت کے کھیل پر اور اپنا ایمان بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤں، مگر دوسرے لمحے ہی اندر سے آواز اٹھتی کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا اگر میں اپنی محبت کو پانے کے لیے کسی مردے کے کانوں سے روئی چرا لوں گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔ اس سے مردے سمیت کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، بس مجھے قبر کھولنے کی ہمت کرنی پڑے گی اور فوزیہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔

میں مآؤف دماغ کے ساتھ واپس آ گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تو اندھیرے سے پہلے ہی خوف کھاتا تھا ایسے میں کسی دیران قبرستان میں رات کے وقت کسی قبر کو کھولنے کا

کہا اور اسے وہاں سے رخصت کر دیا، اور کہتے کو لے کر قریب ہی موجود درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں آ گیا اور اسے ایک درخت کے تنے کے ساتھ اس انداز سے باندھ دیا کہ اس کا منہ بالکل تنے کے ساتھ لگ گیا، اس کے بعد اس کی ٹانگیں باندھ کر اسے مکمل طور پر بے بس کر دیا۔

گنبد پھیر کر چربی نکالنے تک کوئی خاص دشواری تو نہیں ہوئی مگر مجھے خود سے نفرت ہو گئی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ گھناؤنا کام میں نہیں بلکہ مجھ میں موجود کوئی دوسری قوت کر رہی ہے میں تو محض خاموش تماشا کی حیثیت رکھتا ہوں۔

اس غلیظ کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا بابے کے پاس جا پہنچا، وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا، میں نے سنی سے بنے سات چراغ اور چربی اس کے سامنے رکھ دی۔

وہ بالکل مجھے اندازہ ہے کہ تم یہ سب کچھ کرنے میں کتنی تکلیف اٹھا رہے ہو، بس دو کام اور اس کے بعد تمہیں دنیا کا امیر ترین شخص بنا دوں گا، بس دو کام اور رہ گئے ہیں۔“ اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا، تو میری گھبراہٹ دیدنی ہو گئی۔

”وہ... وہ... کیا ہیں۔“ میں نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”دیکھو بالکل اگر تم ہمارا کام کرو گے تو ہم تمہیں وہ کچھ دان کریں گے، جو تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا، ہم چند دن میں ہی تمہیں تمہارے آفس کی سب سے اونچی کرسی پر بٹھا دیں گے۔ اس شہر میں جس جگہ کہو گے محل بنوا دیں گے، تمہاری تمام خواہشات پوری کر دیں گے، اور اگر تمہیں ہماری بات پہ شک ہے تو ہم پہلے ہی تمہیں یہ سب کچھ دینے کو تیار ہیں، اس کے بعد تم ہمارا کام کر دینا، ہم تم سے یہ سب کروانے کے لیے اس لیے مجبور ہیں کہ تم واحد شخص ہو جو یہ کر سکتے ہو اور کوئی نہیں۔“

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ جو کچھ مجھے دینے کی بات کر رہا ہے، وہ اسے پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا، مگر اس کے بتائے ہوئے کام میری طبیعت

خیال ہی میرے لیے سواہن روح بنا ہوا تھا۔ دل ایسے ڈوبا جا رہا تھا جیسے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہو، اگلے دو دن اسی کیفیت میں گزر گئے اگر دوران میرے کان لاشعوری طور پر مسجد کے لاؤڈ سپیکر کی طرف لگے رہے، مگر ابھی تک سوائے ایک بزرگ شخص کی فوجی کے علاوہ اور کوئی اعطان نہیں ہوا تھا، دفتر سے واپسی پر میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا اور مجھ پر نیم غنودگی کا عالم طاری تھا کہ اس خبیث بابے کی شکل ذہن کی سکرین پر ابھر آئی۔

”مورکھ ایسے کسی نوجوان لڑکی کی موت کا انتظار کرتے ہوئے تو تیسریں کئی سال نگ جائیں گے، تم خود ہنست کر کے کسی لڑکی کی جان لے لو یا پھر ہسپتال کی ایمرجنسی میں چلے جاؤ تو امید ہے کام بن جائے گا۔“ اس کے ہونٹ ہلے اور عصبانی آواز سنائی دی تو میں ایک جھٹکے سے انھہ بیٹھا، آواز صاف اور واضح تھی میرا وہم یا خیال نہیں تھا۔

.....

اگلے دن میں اس کے سمجھائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہسپتال جا پہنچا، وہاں جاتے ہی میرا کام بن گیا، وہ کسی نوجوان کنواری لڑکی کی لاش ہی تھی، جو ایمرجنسی میں پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی تھی، پوسٹ مارٹم کے بعد جب لاش اس کے لواحقین کے سپرد کی گئی تو میں بھی اپنی بانیٹک پرائیویٹ بولینس کے پیچھے چل دیا، گھر دیکھ آنے کے بعد میں اس کے جنازے میں بھی شامل ہوا اور اب آدھی رات کے بعد اس کی قبر کے پاس کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا میں بیچہ اور کسی ساتھ لے کے آیا تھا قبر پر کسی چلائے سے، پے عسوس ہوا کہ جیسے میں نے اپنے دل پر ہی کسی چلائی ہو، اس کے بعد میں نے بے خودی کے عالم میں قبر سے ساری مٹی نکال کر لحد پر رکھے ہوئے لکڑی کے سمنے بھی اٹھا دیئے، سمنے اٹھتے ہی فضا میں کافی خوشبو پھیل گئی، کفن کا بند کھولنے کے بعد میں نے نارنج آن کی تو مجھے لگا کہ لاش جیسے جاگتی آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہو میں ڈر کے مارے قبر سے باہر نکلنے کے لیے واپس مڑا مگر لحد کے

کنارے سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں لحد میں لاش کے اوپر جا کر، خوف سے میری کھلی ہندہ گئی، جیسے تیسے کر کے میں لحد سے باہر نکل آیا اور اپنے جسم کی تمام قوت صرف کر کے نارنج کا رخ ایک بار پھر لاش کی طرف کیا اور نیچے جھک کر اس کے کانوں اور منہ میں دی گئی روٹی کو باہر کھینچ لیا، منہ والی روٹی لیس دار رطوبت سے بھری ہوئی تھی، رطوبت کے انگلیوں سے لگتے ہی مجھے جھرجھری آگئی، میں نے جلدی سے روٹی کو اپنے پاس موجود ڈبیا میں رکھ لیا اور وہاں سے حقیقت میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، اس وقت مجھ میں اتنی سی بھی اخلاقی جرات نہیں رہ گئی تھی کہ اس معصوم لڑکی کی قبر کو واپس ہندہ ہی کر دیتا، مگر پہنچنے تک مجھے شدید بخار ہو گیا تھا اور صبح تک تو بار بار بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے، اب مجھے ہسپتال لے گئے سارا دن کئی قسم کی بوتلیں اور نیکے لگنے کے بعد طہارت سنبھل گئی تو رات گئے ہم واپس گھر آ گئے، اگلا سارا دن گھر میں گزار کر شام کے وقت میں ایک بار پھر بابے کے پاس جا پہنچا۔ روٹی دیکھ کر بابا انتہائی جذباتی ہو گیا جذبات کی شدت سے اس کے چہرے کے عضلات پھڑکنے لگے، میری پشت پر سورج غروب ہوئے کو تھا، جس کی آخری کرنیں میرے سامنے بیٹھے ہوئے بابے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، اس کا چہرہ کسی دہکتے ہوئے شعلے کے جیسا لگ رہا تھا، مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے آگ سے بنا ہوا چہرہ مسکرارہا ہو۔

”بس بالک آج کے بعد تم ہمارے شرن میں ہو، ہم نے تمہیں اپنا پتر مان لیا ہے، ہم تمہیں اس دنیا کا امیر ترین شخص بنا دیں گے۔ نوگ تمہارے جیسی زندگی کی تمنا کریں گے، تم جس ناری کی طرف دیکھو گے وہ خود تمہارے قدموں میں آ بیٹھے گی، بس یوں سمجھ لو ہم تمہارے لیے سورگ اور حوروں کا ہمیں بندوبست کر دیں گے۔“ بابے نے ایک ہاتھ اٹھا کر اتنے تکبرانہ انداز میں کہا، جیسے اس کا نکات کا سارا نظام اسی کے اشارے کا محتاج ہو۔

”تو سب فحش ہے مگر اس روٹی سے آپ کو کیا

صحابہ کرام کی محبت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 6)

صحابہ کرام کی پوری پوری زندگیاں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مصداق تھیں۔ بلاشبہ انہوں نے ایک اشارۃ رسالت ﷺ پر اپنی جانیں فجاہور کر دیں اور ایک آج ہم جیسا ہمارے پاس عشق مہ طنی ﷺ کے دعوے جیسا ہم جاں نثارانِ مصطفیٰ کے نعرے لگاتے ہیں مگر ہماری زندگیاں اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ محبت کے تقاضے تو کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ محبت تو یک جہش لب دنیا جہان چھوڑا دیتی ہے جب کہ ہماری محبت تو ہم سے معمولی نوعیت کی معاشرتی برائیاں چھڑوانے سے بھی عاجز ہے۔ چ جائیکہ سباز سے بچا جائے۔ منسرتین فرماتے ہیں کہ گناہوں اور مصیبت سے بچنے کا بہترین نسخہ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت ہے۔

حسن انتخاب: کرن شہزادی۔ راولپنڈی

پھیکا، اپنا پتر بٹایا، اور دنیا کی تمام تسلیں تمہارے نام کر رہے ہیں، بدلے میں تم ہمیں دعا دینے پر تل گئے ہو، ہم تم سے فوز یہ سمیت سب کچھ پیچیں لیں گے۔" بابے نے غضب ناک لہجے میں پھٹکارتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے ایمان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے ایک چھوڑو میں ایک ہزار لڑکیوں کے بدلے بھی اپنے ایمان کا سوا نہیں کروں گا انا معلوم باپ کی اولاد میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور فوز یہ پر بھی۔" میں نے غراہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا اور غصے کی شدت سے اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا اور پوری قوت سے اسے تھپنر دے مارا، مگر تھپنر اسے لگنے کی بجائے میرا ہاتھ ہوا میں ہی گھوم گیا، وہ ایک لمحہ پہنے جہاں موجود تھا، اب وہاں

حاصل ہوگا، میں نے جرأت کر کے اپنے ذہن میں آنے والا سوال پوچھ ہی لیا، وہ چند ثانیے میری طرف غور سے دیکھتا رہا، اور پھر گویا ہوا۔

"ہم نے تمہیں اپنا پتر مان لیا ہے اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں، ہم ساری عمر تمہیں کر کے کالے علم کے پانچویں درجے پر پہنچے ہیں، اس علم کی تاریخ میں اس درجے پر پہنچنے والے ہم ساتویں انسان ہیں، اس سے آگے آج تک کوئی نہیں بڑھ سکا، اب تم جیسا دھن بھاگی مجھے مل گیا ہے، تو میرے ست چراغی چلے کی راہ ہموار ہو گئی ہے، اب مجھے چھٹے درجے کی طاقتیں حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، بس تم آخری چیز مجھ تک پہنچا دو اس کے بعد ساری زندگی عیش کر رہا، اور عیش بھی ایسا جس کی دنیا حسرت کرے۔" اس نے تفصیل کے ساتھ سارے عمل کی وجہ بتائی اور خاموش ہو گیا۔

"اور تمہارا کام کیا ہے، میں نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے گہرا ہونے لگا تھا۔

"آخری کام تو پہلے سارے کاموں سے آسان ہے تمہاری مقدس مذہبی کتاب کے پہلے چار اور آخری تین ورق چاہیں، بابے نے اپنا بیت سے کہا۔

"ان اوراق کا کیا کرو گے۔" میں نے چونک کر پوچھا۔

"جو سات چراغ جلاؤں گا ان چراغوں کے نیچے رکھنے ہیں۔" اس نے بدستور ملائم لہجے میں جواب دیا، اس کی بات سن کر میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی اور یکدم میری رگوں میں پہنچے والا خون بارہ بن گیا، میں لاحول پڑھتا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا، مجھ جیسا گہنگارا اور دین سے ور نہیں بھی مقدس کتاب کی بے حرمتی کا سن کر ہتھ سے اکھڑ گیا، میرے منہ سے لاحول و لاقوۃ کے الفاظ سن کر بابا بھی ایسے جھنکا کھا کھا کر اٹھا جیسے اچانک اس کے سامنے کوئی زہریلا سانپ نکل آیا ہو۔

"مورکھ ہم نے فوز یہ کو تمہارے قدموں میں لا

نہیں تھا، میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ ایک طرف کھڑا مجھے گھور رہا تھا، اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، اس کے اس طرح غائب ہو کر دوسری جگہ پہنچ جانے پر میں بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔

”میں تمہارا سب کچھ نشٹ کر کے تمہیں دنیا کے سامنے عبرت بنا دوں گا۔“ اس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو اس کا لہجہ غیر انسانی تھا، اب میرے پاس وہاں سے بھاگنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں مقدس کتاب کی آیات با آواز بلند پڑھتا ہوا موٹر سائیکل تک پہنچا اور پھر آندھی طوفان کی طرح اسے اڑاتا ہوا شہر کی طرف جانے لگا۔ ابھی میں نے چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ موٹر سائیکل جھٹکے کھانے کے بعد بند ہو گئی، میری ہر ممکن کوشش کے باوجود وہ دوبارہ اشارت نہیں ہوئی، تو میں اسے لے کر پیدل ہی چل پڑا، مجھے بار ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی میرے پیچھے آرہا ہے مگر جب مڑ کر دیکھتا تو کوئی نظر نہیں آتا، کئی بار تو ایسے ہوا کہ کوئی چیز مجھے چھوتی ہوئی گزری ہو، خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس تمام دورانیے میں میں مقدس کلام اونچی آواز میں پڑھتا رہا، خوف سے پیچھا چھڑانے کے لیے شاید میں اشعوری طور پر ایسا کر رہا تھا۔ آخر کار میں ایسی صورتحال سے نپٹتا ہوا کئی کلو میٹر کا سفر کر کے شہر پہنچ گیا، راستے میں ایک دوست کے گھر موٹر سائیکل کھڑی کرنے کے بعد بس کے ذریعے اپنے اسٹاپ پہنچ گیا، یہاں سے ہمارا گھر چند گلیوں کی مسافت پر تھا، رات گہری ہو چکی تھی، ابھی میں گھر کی طرف چلا ہی تھا، کہ اس سارے علاقے کی بجلی آف ہو گئی، اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا، دفعتاً مجھے اپنے پیچھے کسی کے چلنے کی آواز آئی، جیسے کوئی عورت بازیب اپنے میرے پیچھے آرہی ہو۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آیا، اتنا ضرور ہو کہ میرے رکنے سے پازیبوں کی آواز بھی رک

گئی، میں اپنا دھم سمجھ کر ایک بار پھر چل پڑا تو وہ آواز پھر سے آنے لگی۔ میرے اعصاب ایک بار پھر سے تن گئے، میں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور ساتھ ساتھ با آواز بلند آیت کریمہ پڑھنے لگا، میرے پیچھے آنے والی آواز کی رفتار بھی تیز ہو گئی، میں خوف کے مارے دوڑنے لگا میرے پورے جسم کی طاقت سمٹ کر ناگوں میں آگئی تھی، میں اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا، کچھ دیر پہلے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پیچھے کوئی عورت آرہی ہے مگر اب ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہی دوڑ رہی ہے، میں خوف کی وجہ سے اپنے برابر میں دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا کچھ دیر میں ہی میرا سانس دھونکی کی طرح چلنے لگا تو خود بخود میری رفتار کم ہونے لگی، میری ناگہم خوف سے کانپ رہی تھیں، میں قدم رکھ کر کہیں رہا تھا اور وہ پڑ نہیں رہا تھا، اسی کشمکش میں اپنی گلی میں پہنچ گیا تو دل کو کچھ ڈھارس ہوئی، ابھی میں اپنے گھر کے تقریباً سامنے پہنچا ہی تھا جب اچانک کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا تو میں توازن کھو بیٹھا اور قلابازیاں کھاتا ہوا در تک چلا گیا اس طرح گرنے سے جسم پر کئی جگہ خراشیں آئیں، میں نے مڑ کر عقب میں دیکھا تو میری سٹی گم ہو گئی، میرا حلق اس قدر خشک ہو چکا تھا کہ تھوک نگھنا بھی مشکل ہو گیا، بلاشبہ وہی خبیث کچھ قاصدے پر کھڑا مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔

”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں، اپنے کیے ہوئے دیدے کو پورا کر دو، پر تو تم ساری زندگی فوزیہ کی شکل دیکھنے کو ترسو گے، اور میں تمہارے جیون کو نرکھ بنا کے رکھ دوں گا، بالکل گندی ٹالی کے کیڑے جیسی۔“ اس نے انتہائی سرد لہجے میں وارننگ دی تو مجھے اپنی ریزہ کی ہڈی میں سننا ہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی، بری طرح گرنے کی وجہ سے میرے آنکھوں کے آگے نیلے نیلے تارے گردش کر رہے تھے، اتار کی جیسے بار بار ذہن پر جھپٹ رہی تھی، میں نے اپنی ہمت کو جمع کیا، اور اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میری جان لے سکتے ہو تو لے لو، مگر تم میرا ایمان کسی صورت نہیں چھین سکو گے، چاہے تم کالے جادو کے آخری درجے پر ہی کیوں نہ پہنچ جاؤ، میں تم پر اور ایسی محبت پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے لیے مجھے اپنا ایمان گنوانا پڑے۔“

آخری الفاظ کہتے ہوئے میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجھے واپس ہوش و ہواس کی سرحد میں داخل ہونے پر سب سے پہلے جو احساس ہوا، کہ جیسے میں بارش میں بھیگ رہا ہوں، اس کے ساتھ ہی مجھے جسم کے مختلف حصوں میں اٹھنے والی درد کی تیز لہروں نے مکمل ہوش کی وادی میں لا پھینکا، تو میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں، میرے اوپر ایک سفید بارش فرشتہ صورت شخص میرے چہرے پر پانی کے پھینٹے ڈال رہا تھا۔ قریب ہی گھر کے سب افراد موجود تھے جن کے چہرے غم کی تصویر بنے ہوئے تھے، وہ فرشتہ صورت شخص میرے لیے اجنبی تھا، مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب کے چہرے ہل اٹھے، پہلے تو میں خالی الذہنی کی کیفیت میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا، کچھ دیر میں تمام واقعات جزئیات سمیت مجھے یاد آ گئے۔

”سب لوگ ذرا باہر جائیں مجھے بر خوردار سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔“ اس بارش بزرگ نے کہا تو سب لوگ باہر چلے گئے، میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو میں ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم کن چکروں میں پھنس کر اس خبیث کے ہتھے چڑھے تھے تمہارے ایمانی جذبات دیکھ کر میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ میں تمہاری جان اس سے چھڑواؤں، تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ اب تک تو منکر نکیر تمہارا حساب بھی لے چکے ہوتے۔ بہر حال تم مبارک باد کے مستحق ہو، کہ تم نے اس کے کسی لالچ میں آ کر اپنی

ابدی زندگی خراب نہیں کر لی۔ میں نے اس خبیث کا ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ وہ اب تمہیں کبھی شک نہیں کر سکے گا۔ تمہیں اپنے گمراہیوں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا ہے، اور ہاں فوزیہ کا خیال ذہن سے نکال دو وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔“ اس فرشتہ صفت انسان نے تفصیل سے بات کی تو صورتحال مجھ پر واضح ہو گئی۔

”اب مجھے اجازت دو۔“ اس نے جانے کی بات کی تو بے اختیار میں نے پوچھ لیا کہ آپ کون ہیں۔“

”تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں اور مجھے بتانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔“ اس نے بات ختم کرنے کے بعد جھٹ کر میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا، اس کی بات سن کر مجھ پر محبت طاری ہوئی، وہ یقیناً کسی غیر مرئی مخلوق سے تعلق رکھتا تھا، کچھ دیر بعد سب گھر والے اندر آ گئے۔

”بیٹا تم زخمی کیسے ہو گئے۔“ ابو نے اندر آتے ہی پوچھا۔

”وہ ابو... ایک جھوٹا سہا جادو ہو گیا تھا، میں اپنی گلی تک تو جیسے تھے گھر کے پہنچ گیا، لیکن پھر اچانک گر کر بے ہوش ہو گیا۔“ اسی بے اختیار میری طرف دیکھے جا رہی تھیں وہ میری اتنی سی چوٹ پر اتنی پریشان ہو گئی تھیں اگر آج مجھے کچھ ہو جاتا تو ان کا کیا حال ہوتا، میں نے اسی کی گود میں سر رکھا اور چھوٹے بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔

دوسرے ہی دن فوزیہ کے گھر والے اچانک ہی کسی اور جگہ چلے گئے تھے۔ مہینوں بعد بھی ان کی کوئی خبر نہ آئی تو مجبوراً ہمیں اس شادی کی تاریخ کو ختم کرنا پڑا تھا۔ آج میں اپنے چار بچوں کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزار رہا ہوں اور فریحہ جیسی حسین ترین اور محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ پر میں خدا کا جتنا شکر کروں، کم ہے۔

☆ ☆ ☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

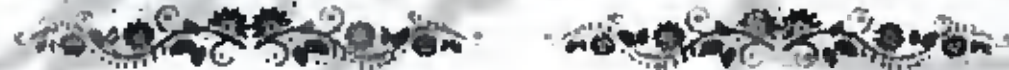
پراسرار نمبر کی پانچویں خاص کہانی

جودگی

ارم ناز



اس جوگن کی داستانِ عجب جس کا جوگی آج بھی اس کے ہمارا ہے



والا۔ تم وہی کلو کی کلو ہی رہو گی۔

میرا رنگ صرف کالا ہوتا تو گزارا تھا۔ میرے نمین نقش بھی سونے پر سہاگنا تھے۔ صرف ابو ہی تھے جو میرا خیال کرتے ورنہ سب گھر والوں کو مجھ سے خدا واسطے کا پیر تھا۔ دو خوب صورت بھانسیوں کے لیے خوب صورت بھابھیاں آچکی تھیں۔ میرے لیے جو بھی رشتہ آتا وہ میری بہنوں کو پسند کر لیتے یہی سب ہوتے ہوتے میری بہنوں کی بھی شادی ہو گئی اب صرف میں ہی لم نصیب رونے کو رہ گئی تھی۔ خدا جانے میری ماں نے مجھے کیا کھانا کسے پیدا کیا تھا اور اس مشکل پر میرا نام نازنین بھی رکھ چھوڑا تھا۔ بھئی بھئی میں سوچتی کہ خوب صورت لوگوں کی زندگی کتنی آسان اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہے۔ حسن سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چاہیے اور چاہے جانے کی خواہش میرے دل میں بھی تھی مگر اس شکل و صورت کے ساتھ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ ٹھکرائے جانے کے احساس سے میں چڑچڑی بھی ہو گئی تھی یوں سمجھ میں کر لیا وہ بھی نیم چڑھا۔

بد صورت کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ میں اپنی ماں

شکل و صورت کا میاب زندگی گزارنے کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہے، اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ کہے ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بڑے دو بھائی خوب صورت، مجھ سے چھوٹی دو بہنیں خوب صورت، میرے ماں باپ خوب صورت پھر پتا نہیں میں کیوں اتنی بد صورت تھی۔ موٹے ہونٹ، موٹی ناک، چھوٹی آنکھیں سیاہ رنگ غرض یہ کہ تمام بری چیزیں ایک جگہ اکٹھی ہو گئی تھیں۔ میں بچپن سے جوانی تک لوگوں کے طنز کا نشانہ بنتی رہی۔ جو بھی مجھے دیکھتا مجھ پر جملہ ضرور کہتا۔ ”اندھیری رات، کالی چڑیاں، کونٹے کی کان، کھو پری، کلمو ہی اور اسی طرح کے کئی جملے میں سن سن کے ٹھگ آگئی تھی۔

میرے لیے کپڑے خریدے جاتے تو رنگ کا انتخاب بڑا سوچ سمجھ کے کیا جاتا۔ چپل خریدی جاتی تو ہمیشہ بند جوتا کیونکہ اماں کا خیال تھا کہ بند جوتے میں میرے سیاہ اور بھدے پیر چپے رہتے ہیں۔ میرے منہ دھونے پر میری بہن طنز کر میں۔

”جتنا تم بھی رگڑ رگڑ کر منہ دھولو، چاہے جتنا صابن لگائیں دو مگر تمہارے چہرے پر کوئی فرق نہیں پڑنے

کی نظر میں بد صورت تھی۔ میں انڈے سے نکلنے والا وہ
چڑیا کا بچہ تھی جو چڑیا سے بالکل مشابہت نہیں رکھتا بلکہ
چڑیا کا بچہ کم اور کیڑا کوڑا زیادہ لگتا ہے۔ میں بس
زندگی کو وہ کادے رہی تھی۔

.....

ان ہی روکھے پھیکے دنوں میں میری خالہ جان
امریکہ سے آگئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دو بیٹیاں اور
ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔
خالہ جان اماں کی بہن ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت
مختلف تھیں۔ خالہ جان دو تین سال بعد پاکستان کا چکر
لگاتیں تو سیر سپاٹوں کے پروگرام بنتے۔ اس مرتبہ بھی
ہم نے کلری ہیل جانے کا پروگرام بنایا۔ طے یہ پایا
کہ ہم بختے کی صبح گھر سے نکلیں گے اور ننھہ میں عبداللہ
شاد اصحابی کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے کلری ہیل
جائیں گے۔

میری دونوں بہنیں جمعہ کی رات ہی آگئیں تمام
تیاری مکمل ہوئی۔ خالہ جان کے بچے بہت خوش تھے۔
صبح سب تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے بھی نہا
کر لان کا جوڑا پہن لیا کیونکہ یہ گرمیوں کے دن تھے۔

ہم پہلے مزار پر پہنچے۔ فاتحہ پڑھی۔ ننھہ میں اور
بھی بہت سے مزارات ہیں مگر شہنشاہی عبداللہ شاہ
اصحابی کی ہے۔ میں مزار سے باہر آ کر ننھے درختوں کی
پنھاؤں میں بیٹھ گئی۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔
دور نہیں رپڑیو پر المن فقیر کی آواز گونج رہی تھی۔ کتنی
پرسوز آواز تھی۔ لگتا تھا ساری کائنات اس آواز میں
سمٹ آئی ہے۔ میں آٹھ دس قدم چل کر ایک ننھے
درخت کے سائے میں منڈیر پر بیٹھ گئی۔ درختوں پر
بیٹھے پرندے بھی خاموش تھے۔ لگتا تھا شریں بچے منہ پر
انگلی رکھ کر چپ بیٹھے ہیں۔ المن فقیر کی آواز میں وہ سحر
تھا کہ پرندے بھی خاموشی سے سن رہے تھے۔



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

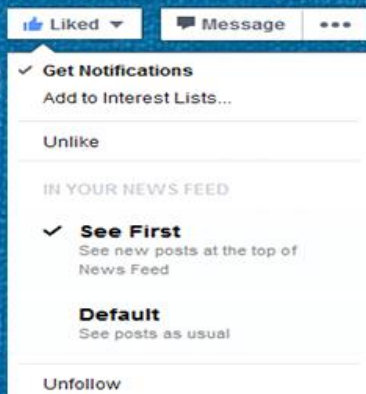
بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



کچھ فاصلے پر بیٹھا جوگی گا ہے بگا ہے میری طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے بڑی نہیں لگ رہی تھی۔ جوگی معمولی شکل و صورت کا تھا مگر آنکھیں غضب کی تھیں۔ خاص کشش والی آنکھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی بس ایک لمحہ اس سے زیادہ میں اس سے نظر نہ ملا پائی اور اسی ایک لمحے میں صدیوں کا سفر طے ہو گیا۔ جوگی میرے لیے اجنبی نہ رہا میں جوگی کی اور جوگی میرا ہو گیا۔

ہم لوگ ٹھنڈے سے کھری پہنچے۔ سب نے پکنک کا خوب لطف اٹھایا مگر میں ہمہ دم تصویر بنی ایک جگہ بیٹھی رہی۔ دماغ کہتا تھا جوگی کے علاوہ کچھ نہ سوچ۔ آنکھیں کہتی تھیں جوگی کے علاوہ کچھ نہ دیکھ۔ دل جوگی کی پکار لگا رہا تھا۔ دل، دماغ، آنکھیں میرے ہوتے ہوئے بھی میرے قابو میں نہ تھے۔

اچھا خاصا بیٹھا بیٹھا گم ہو جاتا ہوں اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں مغرب کے وقت یہ پکنک اختتام کو پہنچی۔ رات دس بجے ہم گھر پہنچے مگر میں تو اپنا آپ ہی کہیں کھو آئی تھی۔

☆.....☆

بستر پر لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات کے آخری پہر نیند آئی تو خواب میں جوگی مسکراتے ہوئے مجھے بلارہا تھا۔ میں کھینچی چلی جا رہی تھی۔ دور کہیں اماں ابو کی آواز آرہی تھی۔ وہ مجھے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے مگر میں جوگی کی جوگن سننے جا رہی تھی۔ میں جوگی کے قریب پہنچ گئی۔ جونہی جوگی نے میرا ہاتھ تھاما میرے وجود میں ایک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور آنکھ کھل گئی۔

میں بستر پر لیٹی پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ صبح ہونے کو ہی تھی کچھ دیر بعد دن چڑھ آیا۔ روزمرہ کے کام ہوتے رہے۔

رات آئی میں سو گئی اور پھر خواب میں جوگی کی ہمراہی میں ایک حسین وادی کی سیر کی۔ اب تو میں ہر رات جوگی کے ساتھ ہوتی۔ دن بے چینی میں گزرتا

اور رات کا انتظار رہتا۔ رات آتے ہی جوگی خواب میں آ جاتا۔ عہد و بیان ہوتے روشنی پھلتے ہی خواب ٹوٹ جاتا۔ میری حالت عجیب پانگھوں کی سی ہو گئی تھی۔ دن بھر کھوئی کھوئی رہتی۔ میں نہیں جانتی تھی یہ عشق کی کون سی منزل ہے۔ میں اپنے محبوب کے ساتھ خوابوں کے سفر میں ہی خوش تھی۔ اب میں دن میں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی تھی۔ درحقیقت میں جوگی سے بات کر رہی ہوتی تھی۔ کبھی رات خواب میں بھی جوگی جوگی چیخنے لگتی۔ گھر والے سوتے سے اٹھ جاتے اور میرے گرد جمع ہو جاتے۔ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی جا رہی تھی۔

ابو کا خیال تھا مجھے ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں جب کہ اماں کی سوچ اس کے برعکس تھی وہ کہتی تھیں آسیب کے زیر اثر ہے۔ سال بھر دوا دارو ہوتا رہا۔ کبھی یہ ڈاکٹر بھی وہ ڈاکٹر مگر سب بے سود..... مجھ پر دواؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

پھر عاملوں کے چکر کبھی یہ عامل کبھی وہ عامل، آستانے پر آستانہ بدل دیا گیا مگر نتیجہ صفر۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا احساس مجروری ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے شادی کرو و خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اماں کو کسی خاتون نے مشورہ دیا۔ ”ٹھنڈے لے جاؤ شاید وہاں جا کر ٹھیک ہو جائے۔“ خاتون کی بات پر غور کیا تو اماں کو خیال آیا کہ بیماری بھی تو وہیں سے ہو کر آئی ہے ٹھیک کبھی تو ہیں سے ہوگی۔

☆.....☆

اماں اور بھائی مجھے ٹھنڈے لے گئے۔ میں گاڑی سے اترتے ہی دوڑی اور دوڑ کر وہیں پہنچ گئی جہاں جوگی بیٹھا تھا مگر وہاں جوگی نہ تھا۔ میں اونچے نیچے راستوں پر دوڑنے لگی۔ گرتی پھر اٹھ جاتی پھر دوڑتی نہ چپل کا ہوش نہ دوپٹے کی فکر سر پر دھوپ برساتا سورج اور میں دوڑتی پھرتی جوگی جوگی چیختی۔

کیا محبت اتنی ہی طاقت ور ہوتی ہے؟ محض ایک نظر نے مجھے پاگل بنا دیا۔ کچھ تو غیر معمولی تھا جوگی میں

گواہ ہے کہ میں قربانی سے کبھی نہیں ڈری۔“
میں نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر جوگی کو اپنے
ساتھ جانے پر راضی کر لیا۔ ہوش میں آتے ہی پہلا لفظ
میرے منہ سے یہی نکلا۔

”گھر چلیں اب میں فحش ہوں۔“
اب جوگی میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں
رہتا ہے۔ جوگی کہتا ہے نازنین تم بہت خوب صورت
ہو۔ بالکل سنگھار سے جیسی۔ ہاہر سے سیاہ مگر اندر سے
سفید۔ تمہارا ظاہر کچھ بھی ہو مگر باطن بہت ستھرا ہے۔
ہم پہروں باتیں کرتے ہیں مگر اماں کو پتا نہیں کیا ہو گیا
ہے۔ ہر ایک سے کہتی پھرتی ہیں۔

”میری جوان بچی پاگل ہو گئی ہے۔ خود سے
باتیں کرتی ہے۔“

اماں کو شاید جوگی نظر نہیں آتا۔ اب انہیں کیسے
ہتاؤں کچھ چیزیں عقل سے ماورا بھی ہوتی ہیں۔ کچھ
لوگوں کو ہم صرف دل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ جوگی
بھی ایسا ہی ہے۔

☆ ☆ ☆

ورنہ ایک نظر میں پونہ تو کوئی پاگل نہیں ہوتا۔ میں
سارا دن بھاگتی رہی۔

شام نہ چلے تھک ہار کے، چپ گر گئی۔ میں بے
ہوش ہو گئی تھی۔ اماں اور بھائی مجھے اٹھا کر مزار کے
اٹاٹے میں لے آئے۔ جو لوگ مزار پر حاضری کو گئے
ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ مزار کے ساتھ ہی خواتین
کے لیے ایک کمرہ بنا ہے، جس میں مسافر خواتین
تھہرتی ہیں۔ مجھے بھی اسی کمرے میں ڈال دیا گیا۔

ادھر میرا یہ عالم تھا کہ ہوش سے بیگانہ ہوتے ہی
جوگی میرے پاس آ گیا۔ میں نے لپک کر جوگی کا
دامن پکڑ لیا۔

”جوگی میں اب تمہیں جانے نہ دوں گی۔
میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ کیوں مجھے
اپنے عشق میں پاگل کر کے پھوڑ گئے۔ اگر تم
میرے ساتھ نہ گئے تو میں یہیں پتھروں سے سر نکرا
نکرا کر مر جاؤں گی۔ تم جانتے ہو میں جب سب سے
تھی تو کچھ گھڑے کی پروا کیے بغیر چناب میں اتر
گئی۔ سسکی بنی تو زمین میں سما گئی۔ جوگی تارخ

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول ’تاشون‘ کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ

ان کے ذاتی تحریکات اور اصل حقائق و اثرات

سعادت و محنت کا حساب، حیرت و تجسس پر مبنی ناول

تحریر: شازی سعید مغل

تاشون

۳۵۰ صفحات

Postage
Rs. 50

برصغیر میں علمِ تغیر کے بانی حضرت کاش البرہی کی

عاملیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا

کے تحریکات و مشاہدات پر اسراریت کے نئے راز کو ناول ایک

سحر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرہی ”پیام“

”تاشون“ ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کرادیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر آنا ڈر بک کرادیں۔

Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800



قیمت: ۵۰۰ روپے

الابھوری اگیٹ کا وہ مکان

محمد بلال فیاض

اُس جوڑے کی کہانی جو نئے مکان میں شفٹ ہوا تھا

مگر وہ جگہ تو ہزاروں برس سے کسی اور ہی مخلوق کی آماجگاہ تھی



جا بچتی نظروں سے وہ بغور اسے دیکھتی رہی۔
"نالہ قریب نہ جائیں کہیں یہ آپ کو کوئی نقصان
نہ پہنچا دیے۔" وہ پکن کی دلیز پر کھڑی ہی ہدایات
دے رہی تھی۔ اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔
"ارے کچھ نہیں ہوتا بی بی جی۔" کہہ کر وہ آگے
بڑھی۔ ہاتھ بڑھا کر انگلی سے جیسے ہی اس چمکاؤ کو چھوا
تو آگے ہی لمحے وہ چمکاؤ حرکت میں آئی اور تیزی سے
پھڑپھڑاتی ہوئی، نادیہ کے کندھے کو چھوئی ہوئی پکن
سے باہر نکل گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور
کندھے کو چھوتے ہی جیسے اس کی جان نکل گئی تھی۔
پکن سے نکل کر وہ چمکاؤ کہاں غائب ہوئی اس بات
کی فکر اس وقت کے تھی۔ ایک زوردار چیخ بھی جو
نادیہ کے حلق سے برآمد ہوئی تھی اور خالہ پکن میں اپنی
جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس نے فوراً امر کو فون کیا مگر وہ اپنے پاس کے
ساتھ کسی میننگ میں مصروف ہونے کی وجہ سے فوراً نہ
آسکا۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے خالہ کے
ساتھ مل کر گھر کا کونا کونا پھان مارا مگر وہ چمکاؤ تو یوں
غائب ہوئی تھی جیسے سرے سے وہاں آئی ہی نہ ہو۔

جیسے ہی اس نے پکن کی دلیز پر قدم رکھا، وہ ٹھٹھک
کر رگ گئی۔ سامنے سیب پر کوئی سیب سی چیز پڑی
تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھی تو
بے اختیار خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں
سرایت کر گئی۔ سیب پر چونے کے پائیں ایک بڑے
سائز کی چمکاؤ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ اپنے
قدموں واپس پکن کی دلیز تک آئی۔ ایک ہاتھ سینے پر
رکھے وہ یک ٹک پھنی پھنی آنکھوں سے اسے دیکھے
جا رہی تھی۔ کالی سی وہ بد صورت چمکاؤ آخر آ کہاں
سے سکتی تھی۔ پکن کے روشن دان میں جالی لگی ہوئی
تھی۔ پکن سے باہر نکل کر اس نے ہر طرف کا جائزہ
لیا۔ تمام کھڑکیاں اور روشن دان جالیوں سے پُر تھے۔
پھر یہ چمکاؤ؟ دماغ میں بہت سے سوالیہ نشان
چکرانے لگے۔

"نسرین خالہ... خالہ... وہ جہاں۔" چہرے پر
خوف اور حیرت کے ملے جیسے تاثرات نمایاں تھے۔
خالہ ہاتھ میں جھانزن پکڑے بھاگی بھاگی آئی تھی۔
"وہ... وہاں... وہ دیکھیے۔" اس کے اشارہ
کرنے پر خالہ پکن کی طرف بڑھی۔ قریب جا کر

یہ مکان کافی سے دامنوں مل گیا تھا۔ ابھی انہیں اس مکان میں آئے ایک دن ہی ہوا تھا جب اگلے دن صبح صبح بیرونی دروازے کی کھنٹی بجی اور پھر دروازہ زور زور سے بجایا جانے لگا۔ ان کے اس گھر میں شفت ہونے کے بعد یہ پہلی اجنبی دستک تھی۔

”کون؟“ نادیہ نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا ضروری سمجھا کیونکہ احمر اس وقت ناشتا لینے باہر گیا ہوا تھا اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔

”دروازہ کھولیں بی بی جی..... میں ہوں نسرین۔“ ایک شفیق زنانہ آواز آئی۔ اس نے پرسوج انداز میں بند دروازے کو دیکھا۔ فی الوقت اس کے ذہن میں ایسی کوئی نسرین نامی خاتون نہ آسکی جسے وہ جانتی ہو۔

دروازہ ایک بار پھر بجایا گیا۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک عورت نے نرم مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور ساتھ ہی سلام بھجوا دیا۔

”سلام بی بی جی! میرا نام نسرین ہے.... اور ویسے

”آخر چمکاؤر گئی تو گئی کہاں؟“ تھک مار کر وہ صوفے پر ڈھسے گئی۔ خالہ پاس ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”نجانے کہاں دفعتان ہوئی..... میں نے تو اسے کچن سے نکلتے ہی دیکھا تھا..... اس کے بعد کا پتا نہیں۔“ خالہ نے ماتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نادیہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

”آپ لوگوں کے آنے سے پہلے یہ گھر کچھ عرصہ بند رہا تھا اور بند گھروں میں ایسی ہیسی چیزیں نکل ہی آتی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں بی بی جی۔“ خالہ کی اس بوہی دلیل پر اس نے غور کر اسے دیکھا کیونکہ پیچھے تین دن سے تو وہ خالہ کے ساتھ مل کر اس گھر کو صاف کر کر کے ہلکان ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اب گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔

اور چمکاؤر کسی سوالیہ نشان کی طرح ہی رہی۔ وہ کہاں سے آئی اور کہاں گئی۔ یہ معہ مل نہ ہو سکا۔

انہیں اس مکان میں شفت ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے۔ اندرون شہر کے ایک بہتر محلے میں انہیں



Downloaded From
Paksociety.com

PAKSOCIETY.COM

سے بند پڑا تھا؟" کسی سوچ کے زیر اثر نادیا اس سے پوچھتی تھی۔
 "کافی عرصے سے بند پڑا تھا۔ کوئی گا کہ ہی نہیں گستاخا اس کا۔ مجھے والے تو سب جانتے ہی تھے کیونکہ....." اپنی ہی رائے میں بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ نادیا یہ چوکی۔

"کیا مطلب؟" کیا جانتے تھے محلے والے..... اور آپ اچانک کچھ جانتے تھے کہ رک کیوں نہیں خالی؟"
 "پتا نہیں بی بی آپ ایسی باتوں پر یقین کرتی بھی ہیں یا نہیں..... مگر حقیقت تو یہی ہے کہ....." چند ثانیوں کے لیے وہ رک کی پھر بولی۔ "بس بی بی جی! یہاں تو کافی لوگ آئے اور کئی گئے..... آپ سے پہلے جو رابعہ باقی یہاں رہتی تھیں ان کے ساتھ بھی بہت برا آواہ خدا جھوٹ نہ بولانے کئی عجیب و غریب واقعات تو میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔" جانتے ہوئے خالہ اس کے قریب کھسک آئی۔ اس کی آواز سرگوشی سے بند نہ تھی۔ وہ یوں بول رہی تھی جیسے کسی اور کے سن لینے کا خطرہ لاحق ہو۔ نادیا یہ وہل کر رہ گئی۔
 "کنک..... کنک..... کیا؟" وہ ہلکا سا اتنا ہی بول پائی۔

"کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ یہاں تو کوئی نکتا ہی نہیں۔ بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں جی لوگوں نے جو یہاں رہ کر گئے ہیں۔ میں نے تو خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا۔ رابعہ باجی نے اپنے تینوں بچے گنوا دیے۔ ہائے بیچارہ! مجھے تو بڑا ترس آتا تھا جی ان کی حالت پر۔ نیم پاگل سی ہو گئی تھیں۔ ملقینا یہ گھر آپ کو بڑے سستے داموں ملا ہو گا۔" ساری باتیں بتا کر اس نے قیاس آرائی کی۔
 "ہاں..... مگر....." نادیا نے گھبرائی آواز میں اتنا ہی کہا تھا کہ خالہ بول اٹھی۔

"ہائے بے چاری باجی رابعہ....." خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر سے شروع ہو گئی۔
 "پہلے تو کئی دن گھر کی دیواروں پر خون کے چھنٹے پڑتے رہے۔ بڑے بڑے عالموں کو لایا گیا۔ مگر قسمت میں جو لکھا ہو وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے جی۔ ایک

مجھے سب خالہ خالہ کہتے ہیں۔ آپ لوگ شاید یہاں نے شفت ہوئے ہیں۔ آپ سے پہلے جو باجی یہاں رہتی تھیں وہ تو مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔ میں اس گھر میں منٹائی کرتی تھی، بلکہ کپڑے، برتن سب کچھ..... محلے داروں سے مجھے پتا لگا کہ یہ گھر بخر۔ آباد ہو گیا ہے تو سوچا کہ پوچھ لوں آپ کو گھر کے کام کاج کے لیے کسی عورت کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔ یہ عورت ہوں جی..... اور یہی کام کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔" اس نے ایک ہی سانس میں سارا تعارف کرا ڈالا۔ وہ پہلے چپ چاپ سنتی رہی، پھر بولی۔
 "یہاں، اس گھر میں کس گھر میں کام کرتی ہیں آپ؟"

"یہ جو گلی کی کمر پہ سبز گیت والا گھر ہے نا باجی فرحت کا، وہاں کام کرتی ہوں جی۔ آپ اپنی سنی سنی رہائیں۔ میں جانتی ہوں آج کل حالات اچھے نہیں اور انجان بندے پر اعتبار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں کوئی ایسی دیسی عورت نہیں ہوں بی بی جی۔"
 "ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں....." نادیا شرمندہ سی ہو گئی۔ شاید خالہ نے اس کی جانچتی نظروں کے جواب میں یہ وضاحت پیش کی تھی۔
 "نھیکہ سے خالہ، آپ آج دوپہر سے ہی آجائے۔" کہہ کر وہ دروازہ بند کیے اندر آ گئی۔ وہ عورت اسے شریف اور ضرورت مند لگی تھی مگر دل ہی دل میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ فرحت باجی کی طرف جا کر تصدیق ضرور کر لے گی کیونکہ آج کل کے دور میں واقعی کسی پر اعتبار کرنا مشکل تھا۔

دوپہر کو خالہ آگئی اور بڑی دل جھس سے اس کے ساتھ سارا کام کر وایا۔ شام کو وہ اتنا تھک چکی تھی کہ فرحت باجی کے گھر جانے اور ان سے سرین خالہ کی بابت پوچھنے کا تاثر ہی نہ ملا۔ سو اس نے یہ کام اگلے دن پراٹھا رکھا۔

اگلے دن احمد کے آفس جانے کے چند گھنٹوں بعد چگاڑ والا واقعہ رونما ہو گیا جسے لے کر نادیا خاصی پریشان تھی۔

"وہی خالہ ایک بات بتائیں۔ یہ گھر کب

رات اچانک ان کے تینوں بچے غائب ہو گئے۔ بڑا بیٹا دس سال کا تھا، اس کے بعد بیٹی بھی آٹھ سال کی اور سب سے چھوٹا بیٹا پانچ سال کا تھا۔ ہائے معصوم بچے۔ آج بھی سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا راتوں رات تینوں بچے خود بخود گھر سے غائب ہو گئے؟" نادیا آلتی پالتی مارے صوفے میں جھنس بیٹھی۔ خوف سے مزید سٹ کر رہ گئی۔ ایک ہاتھ سینے پر دھرا تھا۔

"ارے ہاں تو اور کیا..... صبح اٹھ کر دونوں میاں بیوی نے پاگلوں کی طرح انہیں اڑھونڈا۔ پورا گھر چھان مارا مگر بچے تو کہیں نہ ملے لیکن گھر کے پچھلے کمرے کا نقشہ ہی اور تھا۔ کمرے میں ایک ساتھ تھار میں تین قبریں بنی ہوئی تھیں....."

"ہائے نہیں....." نادیا کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔

"ارے آگے تو بیٹے بی بی بی بی اربعہ باجی تو خوف سے وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ ان کے شوہر نے پاگلوں کی طرح آگے براہ کر قبریں کھود ڈالیں۔ ان کے تینوں بچے قبروں میں مردہ حالت میں پڑے تھے۔ اف کیا قیامت تھی جو ان دونوں پر ٹوٹی تھی۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ خدا ایسا دکھ دشمن کو بھی نہ دے۔" خالہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا اور نادیا کی تو وہ حالت تھی کہ کان تو لہو نہیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار بے اولاد ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"بس بی بی جی! سنا ہے کوئی ایسا زبردست آسیب ہے یہاں جو کسی کو بسنے بھی نہیں دیتا اس گھر میں۔ برباد کر کے رکھ دیتا ہے..... خدا آپ لوگوں کو محفوظ رکھے۔"

سکزی سمنی جیٹھی نادیا سانس روکے، آنکھیں پھاڑے خالہ کی باتیں سن رہی تھی۔

"اور جب بچوں کا پوسٹ مارنم کروایا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ بچوں کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

"اوہ میرے خدا! تو کیا بچوں کو زندہ سلامت قبر میں گاڑ دیا گیا تھا؟" نادیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں جی! سب بھی خیال کرتے ہیں۔ اور بچوں کی الم ناک موت سے ایک دن پہلے میں نے رابعہ باجی کے بیدروم میں جو منظر دیکھا میری توجہ جان نکل گئی جی۔"

"گت..... کیا دیکھا خالہ آپ نے؟"

"ایک صبح میں صفائی کرنے باجی کے بیدروم میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ عین بستر کے درمیان میں ایک کالا سرسٹا کتا پڑا تھا اور پورے بید پر تازہ خون پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنے قدموں واپس بھاگی۔ رابعہ باجی اس وقت کمرے میں تھیں۔" خالہ ابھی بات کرتی رہی تھی کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی بجانے کا وہ مخصوص سا شانل اصر کا ہی تھا۔

"احرا آگئے۔" نادیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میں کھولتی ہوں دروازہ۔" خالہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں..... نہیں... خالہ میں کھولتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔" مارے خوف کے نادیا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ دو منٹ بھی تباہی نہیں اس کے لیے سوہان روح تھا۔

احمر کے آنے پر نادیا نے خالہ کو چھنی دے دی اور خود احمر کو لپے کمرے میں آگئی۔

"احرا! ہم سے تو بڑی غلطی ہو گئی جو یہ گھر خرید لیا۔" پریشانی اور خوف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ارے یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایک چمک دوز کو لے کر تم اتنا سیریس ہو رہی ہو۔ میں بھی بھانم بھانم آیا آفسل سے کہ بتا نہیں محترمہ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا زندگی میں کبھی چمک دوز نہیں دیکھی تھے؟"

"یہ بات نہیں ہے کہ میں نے بھی چمک دوز نہیں دیکھی یا میں چمک دوز سے ڈر گئی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر چمک دوز آئی کہاں سے اور پھر غائب کہاں ہو گئی؟"

"چمک دوز ہی تھی کوئی ہاتھی تو نہیں تھا جو کچھ میں یا گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اور غائب ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ارے بھی اڑ گئی ہوگی! احرا دھر کہیں۔ تم پڑھی لکھی عورت ہو، دل میں ایسے دہم کیوں پال رہی ہو۔" احمر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے خالہ نسرین کی

سارے سر پہ کلا کا لاکھڑا آجاتا اور کبھی بد صورت چمکاؤز۔
 نین بچوں کو گھر کے پچھلے کون میں قبریں بنا کر ان میں
 زندہ گاڑ دیتے والی بات اس کے ذہن کی اسکرین پر
 ساری رات کسی فلم کی طرح چلتی رہی تھی۔

ہٹا..... ہٹا

اگلے دن احمر کے دفتر جانے کے بعد وہ خالہ کا
 انتظار کرنے لگی۔ آج وہ معمول سے کچھ لیٹ ہوئی
 تھی۔ آدھا گھنٹہ مزید انتظار کے بعد بھی جب وہ نہ آئی
 تو اس نے بھوپ لگوانے کے لیے بستر اٹھائے اور
 چھت پر جانے کے لیے میڑھیان چڑھنے لگی۔ چھت
 کا دروازہ کھولی کر جیسے ہی اس نے چھت پر پہلا قدم
 رکھا، خوف و ہشت سے بے اختیار اس کی پیچ نکل
 گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ پتھر اکر رہ گئی۔ یہ سب
 اسے اپنی آنکھوں کا دھوکا محسوس ہو رہا تھا۔ پوری
 چھت اس وقت چھوٹے بڑے چمکاؤزوں سے بھری
 ہوئی تھی۔ بد صورت بھیت کے بہت سے چمکاؤ چھت
 پر اڑتے اڑتے بڑا قہقہہ ناک منظر پیش کر رہے
 تھے۔ دن کی اس روشنی میں بھی اسے لگا جیسے وہ کوئی
 رات کے آخر کی پہر کا ذراؤنا خواب ہے۔ ایک جھٹکے
 سے وہ اپنے قدموں کی نیچے بھاگ آئی تھی بستر تو
 میڑھیوں پر ہی گر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد خالہ آئی تو وہ
 ڈرتے ڈرتے دروازے تک گئی۔

”شکر ہے خالہ آپ آگئیں۔“ وہ اس سے لپٹ گئی۔

”ارے کیا ہوا بی بی! خیریت تو ہے؟“

”بس خیریت ہی تو نہیں ہے خالہ۔“ یہ کہہ کر اس

نے سارا ہوا خداؤں کے گوش گزار کیا۔

”ہائے میرے خدا! خالہ نے سینے پر دو ہتھوڑا

مارا۔“ بی بی میری بات مانو تو یہاں سے چلی جاؤ۔ اس

سے پہلے کہ یہ آسیب تمہیں یا تمہارے شوہر کو کوئی جانی

نقصان پہنچائے۔“ وہ جو پہلے ہی خوف زدہ بھی خالہ کی

بات سن کر مزید دہل گئی۔

شام کو امرا آفس سے آیا تو نادیا نے آج کا تازہ واقعہ

اس کو سننے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے خاموشی

سے سارا واقعہ سن لیا۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ

نادیا کو وہم و گھبراہٹ ہے اور اب اس کے اہم کا علاج تسلی

بتائی ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

”یہ خالہ تمہیں حوصلہ دینے کے بجائے تمہیں ذرا تانی

رہی ہے کیا۔ عجیب جانس عورت ہے یہ۔“ وہ فٹے سے

بولی۔ ”اور حیرت بھی اس بات کی ہے کہ تم نے اس

ان پڑھ، ضعیف الاعتقاد عورت کی باتوں پر یقین

کر لیا۔ کمال ہے بھی۔“

”یہ بات تو میں مانتی ہوں کہ وہ ان پڑھ عورت

ہے مگر اس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے امیر۔“ وہ نہ ہوتی

تو شاید میں بے ہوش پڑی ہوتی اس وقت... خالہ کی

موجودگی سے میرے دل کو بڑا حوصلہ ہوا اور میرا دل

کہتا ہے کہ خالہ کی ساری باتیں جوت یا مرضی ہرگز

نہیں ہیں۔ بھلا وہ کوئی میری دشمن ہیں جو ایسے فرضی

واقعات گھڑ گھڑ کر مجھے سنائیں گی۔ کچھ تو ہے۔ کچھ تو

ہے ان واقعات کے پس پردہ۔“

”یار تمہارے منہ سے ایسی باتیں سوت نہیں

کرتیں۔ تم تو ایک ایجوکیٹڈ عورت ہو۔ اگر کوئی ان

پڑھ عورت ایسی باتیں کرتی تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔“

اس نے انہوں سے سر ہلایا۔

”اس کائنات پر جنات کے وجود سے تو انکار نہیں

ہے نا آپ کو؟ اور ایک بات آپ مجھے بتائیں کہ ہمیں

یہ گھبراتا سنا کیوں مارا؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس

علاقے میں زمین کا کیا ریٹ ہے اور اس حساب سے تو

یہ گھر ہمیں کوڑیوں کے مول ملتا ہے۔ آخر کیوں؟“

”نادیا یہ تم کیوں دو مختلف باتوں کو آپس میں گوند

کر رہی ہو۔ تمہیں یاد ہوگا ڈیڑھ لے ہمیں بتایا بھی تھا

کہ مانگ مکان جند از جند بیرون ملک شفٹ ہونا

چاہتا ہے اور اس کے پاس اقدت بھی کم تھا۔ وہ جند از

جند اپنی جائیداد فروخت کرنے کے چلے ہیں تھا۔ اور

بلیز اب یہ سوال مت اٹھانا کہ وہ اتنی جلدی بیرون

ملک کیوں جانا چاہتا تھا، کیونکہ یہ اس کا پرسن معاملہ

تھا۔“ احمر کی باتوں پر نادیا نے مزید بحث کا ارادہ

ترک کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ احمر اپنی ضد کا پکا ہے۔

وہ بھی بھی سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔

مگر وہ رات نادیا پر خاصی بھاری گزری تھی۔

ساری رات وہ سو نہ سکی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے

آجائے گی۔ تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اس نے تسلی دی۔

”اور پلیز سمجھ کریں احمر۔ کوئی اور گھر یکمیں۔ ہمیں جلد از جلد اس گھر کو چھوڑ دینا چاہیے۔ پسے تو آپ میری بات پر یقین نہیں کرتے تھے مگر اب تو آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس گھر میں کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔“

”تم فکر نہ کرو..... میں کچھ کرتا ہوں۔“

اسی وقت بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔
”لگتا ہے خالد آگئے۔“ ناویہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆

شہروز اس کا کوئیٹک ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا دوست بھی تھا۔ آفس میں آکر چند ضروری کام نمٹانے کے بعد وہ شہروز کے کیمپن میں چلا آیا اور سارے واقعات سن و عن اس کے گوش گزار کر دیئے۔ وہ خاموشی سے سب سنتا رہا پھر بولا۔

”بات تو خاصی تشویش ناک ہے۔ میں ایک بابا بی کو جانتا ہوں۔ جسے پوری امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں تمہاری مدد ضرور کریں گے۔“

”پھر کب چلیں ان کے پاس؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”جب تم کہو۔“

”ٹھیک ہے آج آفس سے واپسی پر چلتے ہیں۔“

ووجہ بحث یہ ہونا کیونکہ وہ بغداد از جلد ان سے ملنا چاہتا تھا اور اب تو اسے بھی کافی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ گھر میں کچھ تو ہے۔“

اس نے اپنی آگشت شہادت کو غور سے دیکھا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد خون تو اب رک چکا تھا مگر ایک بڑا اور شخ دم کا نشان وہاں موجود تھا جو اس کے لیے کسی نمٹے سے کم نہ تھا۔

☆.....☆

احمر کے آفس سے آنے تک اس نے خالد کو روکے رکھا تھا کیونکہ تنہا رہنے کا سوچ کر ہی اس کے رانگنے

کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ اسے اس بات کا احساس دلاتا کہ وہ مستقل وہم کا شکار ہو گئی ہے تو ایک نئی بحث کا آغاز ہو جاتا تھا سو اس نے فی الوقت بات بدلنا ہی مناسب سمجھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔ تم بس جلدی سے میرے لیے کھانا لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ میں جلدی سے نہا کر فریش ہو جاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ ناویہ مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بندرہ منت بعد وہ واش روم سے باہر نکلا تو ششدر رہ گیا۔ اچھ واش روم کی دلیں پر قدم رکھے وہ ساکت تھا۔ بستر کی چادر جو پندرہ منٹ پہلے بے داغ تھی اب اس پر جا بجا تازہ خون کے دھبے تھے۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے قدموں سے آگے بڑھا۔ خون کے تازہ سرخ قطرے کو آگشت شہادت سے پھوٹا اور چند لمحے بعد ردیکھتا رہا۔ یہ ایک اسے احساس ہوا کہ خون اس کی انگلی کی پور سے بہہ رہا ہے۔ بالکل اسی جگہ سے جہاں سے اس نے بستر پر موجود خون کو پھوٹا تھا۔ اس نے کندھے پر پڑے توالے سے انگلی صاف کی مگر خون دوبارہ بہنا شروع ہو گیا۔ کبھی وہ حیرت سے اپنی انگلی سے بہتے خون کو دیکھتا اور کبھی بستر پر موجود خون کے چھینٹوں کو۔ یہ وہم ہرگز نہ تھا۔ اگر یہی بات اسے ناویہ بتاتی تو وہ ہرگز یقین نہ کرتا اور اسے اس کا وہم قرار دے دیتا مگر اس غیر معمولی نوعیت کے واقعے نے فی الوقت اس کے حواس منہدم کر دیے تھے۔

”کھانا تیار ہے احمر آجائیں۔ میں کب سے آپ کا ویٹ کر رہی ہوں۔“ اپنی ہی رو میں بولتی وہ اندر داخل ہوئی لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

☆.....☆

”جب تک خالد نہ آجائیں آپ مجھے اکیلا پھوڑ کر آفس نہ جائیے گا۔“ اٹھ دن صبح ناشتے کے بعد ناویہ نے اسے بڑی قہر مندی سے کہا تھا۔ امداد رات دونوں نے تقریباً جاگتے ہی گزاری تھی۔

”فکر نہ کرو، میں تب ہی جاؤں گا جب خالد

میں اجازت دو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور ہاں میاں! ایک بات اور۔" وہ جاتے جاتے رکے، پٹنے، پھر بولے۔ "گھر کے تمام افراد پر کڑی نظر رکھنا۔" یہ آخری بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ان کی اس بات کا آخر کیا مطلب تھا اور گھر میں افراد ہی کتنے تھے؟ وہ سخت الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

☆.....☆

اگلا دن بڑا عجیب تھا۔ وہ آفس کے بعد فوراً باباجی کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ باباجی آج ہی حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے ہیں۔ اس نے اسی وقت شہر و زکوٰۃ ل کر کے یہ اطلاع دی، وہ بھی حیران رہ گیا۔ اس بات نے احمد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اچھے بھنے باباجی جنہیں وہ کل رات اپنے ساتھ گھر لے کر گیا تھا آج اس دنیا میں ہی نہ رہے تھے۔ بہت سے راز وہ اپنے سینے میں لیے ہی دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ انہوں نے آج اپنے تعویذ دینے کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں بھی بتانی تھیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور ان کی گھر کے افراد پر نظر رکھنے والی بات نے تو اسے خاصا بے چین کر رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج یہ عقدہ بھی کھل جائے گا مگر اس کی تو نوبت ہی نہ آئی تھی۔ بے حد رنجیدہ سادہ گھر واپس آ گیا۔

"کیا بات ہے، خالہ جندی چلی گئیں کیا آج؟" گھر پر ناد یہ کوا کیلاد کچھ کر اس نے استفسار کیا۔

"ہاں، ان کو کوئی کام تھا، میں نے بہت روکا مگر وہ بڑی منت سماجت کر رہی تھیں۔"

"اچھا، سب ٹھیک ہے نا گھر میں؟" اس نے مخصوص سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"ہاں اب تک تو ٹھیک ہے۔"

"ایک بری خبر ہے۔"

"کیا؟"

"باباجی انتقال کر گئے ہیں۔"

"کیا؟؟؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی کل تو وہ....."

وہ بھونچکی رہ گئی۔ امید کی ایک کرن جو باباجی کی صورت میں سامنے آئی تھی اب ختم ہو گئی تھی۔

کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس دن احمد آفس سے واپس آیا تو اس کے ہمراہ ایک لمبی سفید دائی دالے بزرگ تھے۔ احمد نے ناد یہ کو ایک طرف لے جا کر باباجی کے بارے میں بتایا تو اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔

باباجی پورے گھر کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ گھر کے تمام افراد، احمد، ناد یہ اور حتیٰ کہ خالہ کو بھی ٹھور ٹھور کر دیکھتے رہے۔ پھر ہنکارا بھر کے بولے۔

"گھر میں کل کتنے افراد رہائش پذیر ہیں؟" اس دوران وہ ہاتھ میں تسبیح لیے مسلسل کچھ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔

"ایک سو بیس۔" بے اختیار خالہ نسرین کے منہ سے نکلا۔ ناد یہ اور احمد نے صوم کر اس کی طرف دیکھا۔ انہیں خالہ کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ ناد یہ کو خالہ سے اس بے وقوفی کی توقع نہ تھی۔ باباجی بھی پورے کے پورے خالہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ گڑ بڑا کر بولی۔

"معاف کیجیے گا..... میں مکان نمبر بتا بیٹھی..... یہ مکان نمبر ایک سو بیس ہے۔" اس بودے جواز پر احمد اسے ٹھور کر رہ گیا۔ سوال گندم جواب چنا۔ خالہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

"ہوں۔" باباجی نے حسب عادت ہنکارا بھرا۔ پھر گھر کے در و دیوار کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"پورا کنبہ ہے۔ اچھی خاصی تعداد ہے بھئی۔"

"کیا مطلب باباجی؟ میں سمجھا نہیں۔" وہ باباجی کو لیے ذرا تنگ روم میں آ گیا تھا اور ناد یہ خالہ نسرین کو لیے بیڈ روم میں چلی گئی۔

"سمجھا دیں گے۔ اتنی جندی کا ہے کی ہے۔ لیکن فی الحال اتنا ہی نہیں گے کہ اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے۔ اور تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ میاں تمہارا کام ذرا مشکل ہے مگر ہو جائے گا۔ ذرا دیر لگے گی مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ تم کل آنا میرے پاس۔ ہم تمہیں کچھ تعویذات دیں گے اور ساری تفصیل بھی بتا دیں گے۔ اور جتنا زیادہ ہو سکے گھر میں قرآن کی تلاوت کیا کرو یا آواز بلند۔ مصیبتوں سے بچے رہو گے۔ اچھا بھئی۔ فی الحال

”اب کیا ہوگا؟“ سینے پر ہاتھ رکھے وہ پوچھ رہی تھی۔
 ”اللہ خیر کرے گا۔۔۔ وہ مالک ہے، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔“ احمر نے حسب معمول تسلی دی مگر نادیہ کی پریشانی میں رتی برابر فرق نہ آیا۔

اگلے دو دن خالہ نسرین غائب تھیں۔ وہ دونوں حیران تھے۔ آخر وہ بغیر اطلاع کے گئی تو گئی کہاں؟ وہ دن دونوں پر خاصے بھاری تھے۔ احمر خوب تسلیاں دینے کے بعد بڑی دیر سے آفس جاتا اور پھر بھاگ بھاگ شام سے پہلے پہلے گھر واپس آ جاتا۔ دن کا وہ حصہ نادیہ ایکلی بڑی اذیت سے گزارتی۔ ہر دم دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ خوف کے سائے منڈلاتے رہتے۔ اوپر سے روز کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوتا بھی ٹھویا لازم تھا۔ کبھی چھت سے کسی کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آتیں، کبھی کمرے کی کھڑکی سے چمکاڑوں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں اور یوں لگتا جیسے بہت سے چمکاڑ کمرے کی کھڑکیوں سے اندھا دھند ٹکریں مار رہے ہیں۔ کبھی پچھلے کمن سے بہت سی عورتوں کے قہقہے سنائی دیتے۔ زرد چہرہ لیے وہ خوف سے کانپتی رہتی۔ اور ہر رات ان کے پیڈ پر خون کے چھینٹے پڑنا تو معمول کی بات ہو گئی تھی۔ دونوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔

تیسرے دن اس کے اعصاب جواب دے گئے، برداشت کی ہمت ختم ہو گئی تھی۔ اسے یاد آیا خالہ نے بتایا تھا کہ وہ کئی کی ٹکڑ پر فرحت باجی کے گھر میں بھی کام کرتی ہے۔ گھر میں ہونے والے پراسرار واقعات میں پھنس کر دماغ ایسا ماؤف ہوا تھا کہ وہ اب تک ان کے گھر بھی نہ جاسکی تھی۔ تیسرے دن احمر کے آفس جاتے ہی وہ نکل کھڑی ہوئی۔ فرحت باجی کو اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے خالہ نسرین کے بارے میں پوچھا تو وہ حیرت سے بولیں۔

”میں تو ہمیشہ سے ہی سارے گھر کا کام خود ہی کرتی ہوں۔۔۔ آج تک کوئی کام والی نہیں لگوائی۔“
 ”کیا؟“ وہ ششدر رہ گئی۔

”تو کیا آپ کسی خالہ نسرین کو نہیں جانتیں؟“
 ”نہیں تو۔۔۔ میں نے تو کبھی یہ نام نہیں سنا، اس محل

میں جو دو تین عورتیں مختلف گھروں میں کام کرتی ہیں، ان کو تو میں اچھی طرح جانتی ہوں، اور مجھے تو اس محلے میں رہتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔“ فرحت باجی کی باتیں سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

پھر نسرین خالہ کون تھیں؟ کہاں سے آئیں اور کہاں گئیں؟ وہ حیرت زدہ، خوف میں ڈوبی گھر واپس آئی۔ اس وقت وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ بیرونی دروازہ دلاک کرنے کا ہوش بھی نہ رہا تھا۔

اندرو داخل ہوتے ہی اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ اسے یوں لگا وہ پتھر کی ہو گئی ہے۔ لایونج میں صوفے پر خالہ نسرین براجمان تھیں۔ وہ حیران تھیں، اول تو خالہ نے کبھی اتنی جرأت ہی نہ کی تھی کہ صوفے پر اتنے طمطراق سے براجمان ہو۔ دوسرا سوال یہ اٹھتا تھا کہ خالہ اندر کیسے آئی جب کہ وہ بیرونی دروازہ دلاک کر کے فرحت باجی کے گھر گئی تھی۔

”خا۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔ اندر۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کیسے؟“ وہ مشکل اتنا ہی بول پائی تھی۔ جوابا خالہ نے عجیب سے انداز میں زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ ایک غیر انسانی قہقہہ تھا۔

نادیہ کا دل بند ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خالہ کی چکل تبدیل ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر کانوں تک بچ گئیں اور نچلا جبر اکھل کو یوں لٹک گیا جیسے فانیج زدو ہو۔

نادیہ مارے خوف کے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ یہ مناظر اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔

”یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم نے تمہیں بہت دفعہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چلی جاؤ یہاں سے اپنے شوہر کو لے کر۔ چھوڑ دو یہ مکان۔ مگر تم لوگ نہیں سمجھے۔۔۔۔۔ اور چلے تھے ہمیں یہاں سے نکلوانے۔۔۔۔۔ بابا بابا۔۔۔۔۔ کہاں گیادہ تمہارا بابا؟ اس کی بھی چھٹی کرا دی ہم نے۔۔۔۔۔ جو بھی ہمارے راستے میں آیا زندہ نہ بچ سکا۔“

شکل کے ساتھ ساتھ خالہ کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ نادیہ آنکھیں پھازے دیکھ اور سن رہی تھی۔ اسے یہ

انہونی کا احساس ہوا تو وہ کھلا گیٹ پارکر کے اندر داخل ہوا۔ اندر سے آنے والی عجیب و غریب آوازوں نے اسے تیز تیز چلنے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی کھلی بندھ گئی مگر پھر نادیہ کو اس غیر انسانی حقوق کے ہاتھوں میں دیکھتے ہی اس نے ہوش کے ناخن لیے۔ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی تو اسے باباجی کی بات یاد آئی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے با آواز بلند قرآنی آیات کی تلاوت کرنا شروع کر دی۔ جو جو آیات اسے زبانی یاد تھیں وہ پڑھتا رہا۔ جب اسے کمرے میں خاموشی اور تنہائی کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ نادیہ ایک کونے میں بے ہوش پڑی تھی۔ وہ برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا۔ اسے اٹھا کر باہر گاڑی تک لایا۔ گاڑی میں ڈال کر اس نے گاڑی کل اسپید سے اسپتال کی طرف بڑھا دی۔

☆.....☆

ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں سے نادیہ کو بچالیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زکا کہتا تھا کہ نادیہ کو گھلا دبا کر مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اسے اسپتال لانے میں کچھ دیر ہو جاتی تو اسے بچانا ممکن نہ ہوتا۔ یہ عقدہ بھی کھل چکا تھا کہ باباجی نے گھر کے افراد پر نظر رکھنے کو کیوں کہا تھا۔ اس سارے واقعے کو احمر نے میڈیا اور پریس سے کیسے بچایا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ آج اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ نادیہ کے صحت یاب ہونے کے بعد ان دونوں نے غلطی سے بھی اس آسیب زدہ مکان میں قدم نہیں رکھا اور دوسرا مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ مگر اتنے سال گزر جانے کے بعد آج بھی اندرون لوہاری گیٹ لاہور کے ایک محلے میں آج بھی وہ پر اسرار مکان بڑی ہیبت سے کھڑا ہے۔ ویران اور خالی۔ شام کے بعد لوگ اس مکان کے آگے گزرنے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔

☆☆☆

سب کسی ذرا آنے خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ اچانک گھر کے پچھلے صحن سے شور کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر یکایک بہت سی خوف ناک شکوے والی عورتیں اور عجیب و غریب ہیبت والے بچے وحشادھڑلاؤنج میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا لاؤنج اس غیر انسانی حقوق سے بھر گیا۔ پچھلے صحن سے مسلسل عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں جیسے وہاں ابھی بھی بہت سے لوگ موجود ہوں۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ناٹھوں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ فق چہرہ لیے وہ بامشکل دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچا پاتی تھی۔

وہ عورت جس نے خالہ نسرین کے نام سے انسانی روپ دھار رکھا تھا اچانک نادیہ کے بے حد قریب آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ نادیہ کو چھوٹی، وہ چکرا کر مری اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆.....☆

بہت دیر سے اسے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ بار بار کام سے توجہ بٹک جاتی۔ شہروز نے اس کی بڑھتی ہوئی بے چینی نوٹ کی تو بول اٹھا۔
"خیریت تو ہے یار! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"ہاں..... نہیں..... پتا نہیں..... پتا نہیں نادیہ کیسی گھر میں کس حال میں ہوگی؟ خالہ بھی نہیں آرہی آج کل۔"

"تمہارا تو ذہن گھر میں ہی اٹکا رہتا ہے یار۔ کال کر لو گھر۔" شہروز کے کہنے پر اس نے گھر کال کی مگر نادیہ فون ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے بار بار کال کی مگر جواب نہ دار۔ اب اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"تم ایسا کرو، گھر کا ایک چکر لگا آؤ.... تب تک میں کام سنبھال لوں گا۔" شہروز کی تسلی پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ بڑا حیران ہوا۔ پیرونی دروازہ کھلا پڑا تھا۔ نادیہ اتنی لاپرواہ تو ہرگز نہ تھی کہ دروازہ اس طرح کھلا چھوڑے رکھے۔ اسے



پیر امیر زبیر بن ہمایون کا چہرہ لہائی

وہ پتیل کا دیا

مہتاب خان

مکان خریدنے سے پہلے اس کی جانچ پڑتال کرنے والے اس نوجوان کا قصہ عجیب

جو اس گھر کے آسب کا شکار ہو چلا تھا

میں جس وقت کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ جگہ اتنی چھان آباؤ نہیں تھی نہ ہی یہ خیرگیٹ بن چکا تھا، بہر حال اسی ٹیسٹ کے ساتھ دوا میں جانب پہلی فلی میں مجھے رہائش کے لیے ایک کمرہ ہاتھ دوم گئے ساتھ مناسب کرایے پر مل گیا تھا۔

میرے گھر کے برابر میں ایک فیملی رہتی تھی جو تین افراد پر مشتمل تھی، دو بیٹے اور ایک ان کی والدہ۔ یہ ایک بڑا نیک اور دیندار گھرانہ تھا۔ بڑے لڑکے کا نام سنیان اور چھوٹے کا نام نعمان تھا۔ نعمان میرا ہم عمر تھا لہذا بہت جلد میری اس سے اچھی دوستی ہو گئی تھی، ان کی امی مٹھے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھیں۔ بڑی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی قرآن پاک حفظ کیا ہوا تھا۔ بڑا بھائی سنیان کی اچھی فرمائیں چاہتا تھا جب کہ نعمان ان دنوں گریجویٹ کر رہا تھا۔

نعمان سے دوستی ہوئی تو ابھی کچھ دنوں ان کے گھر بھی جانے لگا یا کبھی نعمان میری طرف آ جاتا تھا۔ نعمان کی امی جنہیں میں آنی کہتا تھا اکثر میرے لیے کھانا بھیج دیتی تھیں۔ یوں مجھے گھر کا پکا ہوا کھانا میسر

میرا نام فیصل ہے اور میرا تعلق ضلع بہاولپور کے نزدیک واقع ایک گاؤں ہستی سہانوالہ سے ہے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں روزگار کی خاطر کراچی آیا تھا۔ میری طرح ہزاروں نوجوان اپنے علاقوں میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور وہ ہری مشقت میں پستے ہیں۔ ایک طرف روزگار کی مشقت اور دوسری طرف اپنے گھر اور گھراؤوں کی دوری برداشت کرتے ہیں۔

کراچی آنے کے بعد مجھے سامیت ایریا میں واقع ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب مل گئی تھی۔ فیکٹری آنے جانے میں دقت نہ ہو یہ سوچ کر میں نے فیکٹری کے قریب ہی رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ میری فیکٹری سے قریب ترین رہائشی علاقہ نیمرہ ول تھا۔ ان علاقے کے شراباز میں کچے کچے مکانوں پر مشتمل زیادہ تر ہمارے جنٹلمن پنشنڈوں کی ایک گھنٹن آبادی ہے جو آٹے بدرس تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں زیادہ تر مزدور طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ذرا آگے بہتیس اور خیرگیٹ سے داخل ہوں آگے متوسط طبقے کی آبادی ہے۔

آ جاتا تھا جو اس وقت میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ نعمان کا گھر اندھنی میری طرح کمرائے کے گھر میں رہ رہا تھا۔ سفیان بھائی چاہتے تھے کہ ایسا اپنا گھر خرید لیا جائے۔ کچھ جمع پونجی آنٹی کے پاس تھی اور کچھ پیسوں کا انتظام سفیان بھائی نے آپس سے لون لے کر کر لیا تھا۔ وہ سست زمانہ تھا، مکان کی قیمتیں ابھی آسمان پر نہیں پہنچی تھیں۔ سفیان بھائی نے اسٹینٹ ایجنٹ کو کہہ رکھا تھا کہ اس کو بجٹ کے مطابق اگر کوئی گھر ملے تو انہیں بتا دے۔

اسٹینٹ ایجنٹ نے ہفتے بھر میں ہی ان کے لیے گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ گھر ہماری ہی گلی میں واقع تھا۔ ہماری گلی کافی طویل ہے اور آگے جا کر یہ ایک چھوٹے سے قبرستان سے جا ملتی ہے۔ وہ گھر نعمان کی فیملی کے بجٹ کے مطابق اور اچھا بنا ہوا تھا مگر قباحت یہ تھی کہ وہ قبرستان کے سامنے واقع تھا۔

میں اس شام نعمان کے گھر گیا تو آنٹی نے بتایا کہ گھر بہت اچھا بنا ہوا ہے۔ وہ اور نعمان آج ہی وہ مکان دیکھ کر آئے تھے۔ زمین کمروں پر مشتمل یہ مکان ان کی فیملی کے لیے کافی تھا۔ ایک فاضل کمرہ مکان کی تنہا پر بھی بنا ہوا تھا۔ آنٹی نے مجھ سے کہا کہ فیصل بیٹا اگر ہم نے وہ خرید لیا تو اوپر والا کمرہ تم لے لینا۔

”نھیک ہے آنٹی جو کرایہ میں ابھی مالک مکان کو دیتا ہوں وہ آپ کو دیا کروں گا۔“

انہوں نے مجھے پیار بھری ڈانٹ پلائی اور کہا کہ تمہارا کرایہ بچانے کے لیے تو تمہیں یہ پیشکش کی ہے۔“

بہر حال نعمان اور آنٹی کو وہ مکان پسند آ گیا تھا اور مکان کی چابی نعمان اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ شام کو سفیان بھی مکان دیکھ لے تو پھر خریدنے کی بات کی



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیج و پکار سن کر ڈاکٹر صاحب آگئے اور ہمیں کمرے سے باہر بھیج کر ان کا معائنہ کرنے لگے۔ بعد میں انہماں کے استفسار پر ڈاکٹر نے بتایا کہ سفیان بھائی کسی چیز سے ڈر گئے ہیں۔ جب ان کا یہ خوف دور ہو جائے گا تو وہ نارمل ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ان سے زیادہ بات نہ کی جائے۔

سفیان بھائی اسپتال میں تقریباً ایک ہفتہ ایڈمٹ رہے تھے۔ اس دوران آنٹی اور نعمان بہت پریشان رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ آنٹی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ آخر کار انہیں اسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ گھر آگئے۔ وہ بالکل نارمل ہو چکے تھے لیکن ابھی انہوں نے آفسی جوائن نہیں کیا تھا۔ آفس سے انہیں میڈیکل یونٹ مل گئی تھی۔

☆.....☆

اس شام میں نعمان کے گھر گیا تھا۔ سفیان بھائی بڑے خوشگوار موڈ میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہم سب نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا تھا۔ نماز کے بعد آنٹی ہم تینوں کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھیں اور خود سونے چلی گئیں۔ دوسرے دن اتوار تھا اس لیے مجھے بھی گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ہی نعمان نے سفیان بھائی سے پوچھا۔

”بھائی جان! اس دن ایسا کیا واقعہ ہوا تھا جو آپ اتنے خوفزدہ ہو گئے تھے؟“ نعمان نے ان سے ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا تھا کہ ہمیں ان کی ذہنی کیفیت پھر نہ بگڑ جائے لیکن اس کے اس خیال کے برعکس سفیان بھائی نے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”میں اس سوال کی توقع بہت پہلے کر رہا تھا۔“

”آپ کی حالت کے پیش نظر آپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

انہوں نے چائے کا خالی کپڑے میں رکھتے ہوئے کہا۔

”جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو میں ڈر پوک یا بزدل

جائے۔ اتنے میں سفیان بھائی بھی آگئے۔ انہوں نے مکان کی چابی یہ کہہ کر نعمان سے لے لی کہ آج تو وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل شام وہ دفتر سے واپسی پر مکان دیکھتے ہوئے آئیں گے۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ رات کے کوئی بارہ بجے تھے، میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک دروازہ زور سے بجانے کی تیز آواز سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو بارہ بج رہے تھے۔ یا اللہ خیر اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ کیا افتاد پڑی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں اٹھ بیٹھا اور تیزکی سے دروازہ کھولنے بڑھا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے حواہن باختم نعمان کھڑا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”فیصل جلدی سے میرے ساتھ چلو، سفیان بھائی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہ مکان دیکھنے گئے تھے اور ابھی گھر پہنچے ہیں، آتے ہی چلانے لگے۔ مجھے بچالو، مجھے بچالو۔ پھر گر کر بے ہوش ہو گئے۔“

میں نے جلدی سے دروازے کو تالا لگایا اور نعمان کے ساتھ ان کے گھر آگیا۔ سفیان بھائی کو نعمان نے برآمدے میں پڑی ہوئی چار پائی پر لٹا دیا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ آنٹی شاید اندر کمرے میں سوئی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں اس وقت اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے نعمان کو ٹیکسی لانے بھیج دیا تھا اور خود سفیان بھائی کو ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا تھا۔ میں نے جیسے ہی انہیں چھوا ان کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں ٹیکسی آگئی۔ ہم سفیان بھائی کو لے کر اسپتال چلے گئے۔

اسپتال میں سفیان بھائی کا فورن طور پر علاج شروع ہو گیا تھا۔ انہیں دوسرے دن ہوش آیا تھا۔ نعمان نے صبح آنٹی کو سفیان بھائی کے بارے میں بتایا تھا جب سے وہ اسپتال میں سفیان بھائی کے سر ہانے بیٹھی دعائیں پڑھ پڑھ کر ان پر پھونک رہی تھیں۔ جوان بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ان کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ سفیان بھائی کو جیسے ہی ہوش آیا وہ چلانے لگے۔

”بچاؤ بچاؤ، خدا کے لیے میری مدد کرو۔“ ان کی

بالکل بھی نہیں ہونی مگر اس ذات اتنے عجیب و غریب واقعات میرے ساتھ پیش آئے کہ میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہوا یوں کہ اس دن آفس سے نکلتے ہوئے مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس مکان پر پہنچتے پہنچتے مجھے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ میں نے نارنج اپنے ساتھ رکھی ہوئی تھی اور سوچا تھا کہ مکان کا سرسری جائزہ لے کر جلدی گھر واپس چلا جاؤں گا۔ امی اور نعمان نے تو مکان پسند کر ہی لیا تھا۔ نعمان نے مجھے بتایا تھا کہ اس مکان کا مالک برابر والے گھر میں ہی رہتا ہے۔ میں نے سوچا تھا مکان کا جائزہ لے کر میں واپس جاتے ہوئے ان سے بھی مل لوں گا۔

”لیکن بھائی مالک مکان کے برابر تو.....“ نعمان نے ان کی بات کاٹی۔

”مجھے پورا واقعہ سنانے دو پھر بتانا۔“ انہوں نے گہری سانس لی اور پھر کہنا شروع کیا۔

”میں اس مکان کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ایک مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے تالا کھولا تو مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اندر داخل ہوا وہاں اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے نارنج جلائی اور اس کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ دروازہ دیوار اور فرش مٹی سے اٹے ہوئے تھے جگہ جگہ ٹکڑیوں نے جالے تانے ہوئے تھے۔ میں جس کمرے میں اس وقت کھڑا تھا وہاں دیوار کے ساتھ دائیں طرف کمرے میں ساہ نگر کی بنی ہوئی الماری رکھی تھی۔ اس الماری پر کچھ نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے جو ایک عرصہ گزرنے کی وجہ سے پھیکے پڑ گئے تھے۔ الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور ان میں کپڑے رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں حیران تھا، میری اطلاع کے مطابق یہ مکان بالکل خالی تھا لیکن سامان کی موجودگی یہاں کسی کے رہنے کا پتا دے رہی تھی۔ میں بے حد حیران ہوا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے میں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے نارنج کی روشنی ذرا کھائی تو ایک سمت میں ٹکڑی کا دروازہ نظر آیا جو شاید دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ ہر شے پر مٹی کی تہیں جمی

آئی تھیں۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک کونے میں ویسی ہی ٹکڑی کی الماری اور کمرے کے وسط میں بھاری میز رکھی ہوئی تھی جس کے گرد کچھ کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

میں نے نارنج کی روشنی ذرا اوپر بھائی تو بری طرح اچھل پڑا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحوں تک میں ساکت ہو کر رہ گیا تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے قریب جا کر نارنج کی روشنی میں بغور کرسیوں کا جائزہ لیا تو وہ خالی پڑی تھیں اور ان پر مٹی جمی ہوئی تھی جیسے برسوں سے انہیں کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ میں نے اس انسانی ہیولے کو اپنا دھم سمجھا۔ اس کمرے کا ماحول چکرا دینے والا تھا۔ میری جاگہ کوئی اور ہوتا تو چینیں مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ یہاں کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ برسوں سے یہاں کسی نے قدم نہیں رکھا ہے۔ مکان کا مالک اسے بیچنا چاہتا تھا۔ خریدار اسے آکر دیکھتے ہوں گے۔ کیا اتنے عرصے میں مکان کا مالک بھی یہاں نہیں آیا۔ اس قسم کے بہت سے سوال میرے ذہن میں آ رہے تھے مگر میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ حالات جو بھی تھے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔

میرے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس گھر کو پورا دیکھوں گا۔ کم از کم اتنا تو پتا چل جاتا کہ مکان خالی ہے یا اس میں کوئی رہ رہا ہے اور یہ سامان کس کا ہے۔ میں دبے قدموں اندر کی جانب بڑھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے اور یہاں آکر میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا تو میں یہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھتا۔ لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔

اندرونی دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے کھولنے کے لیے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا وہ بھاری دروازہ چرچاہٹ کے ساتھ وہ بخو دکھتا چلا گیا۔ جیسے میرے ہاتھ لگانے کا ہی مقصد ہو۔ جیسے ہی دروازہ خود بخود کھلنے لگا میں گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خوف کی سرد لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی لیکن چند ہی منٹ

محسوس ہوا جیسے پشت کی طرف سے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے بدحواس ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہو گیا کہ کوئی ایسی ناویدہ ہستی یہاں تھی جو میرا جائزہ لے رہی تھی۔ میری چھٹی حس کسی ناویدہ خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ پوری عمارت پر اعصاب شکن سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک ایک ہولناک چیخ مکان میں گونجی۔ میں بری طرح اچھل پڑا۔ چیخ کی آواز اوپر کسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ یہ آواز کسی عورت کی تھی۔

ہلکی ہلکی سکیوں کی آواز مجھے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ مجھے فوراً یہاں سے دور بھاگ جانا چاہیے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں مڑا ہی تھا کہ ایک خیال میرے ذہن میں کوندا کہ ہو سکتا ہے مکان خالی دیکھ کر کوئی شیطان فطرت انسان اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے یہاں آیا ہو۔ میں خیران تھا کہ چیخ کی آواز خاصی بلند تھی۔ آس پاس کے رہنے والوں کو وہ چیخ سنائی کیوں نہیں دی تھی۔ رات کے سناٹے میں تو اس کی آواز دور دور تک سنی گئی ہوگی۔ پھر آخر کوئی یہاں کیوں نہیں آیا؟

بہر حال سبب کچھ بھی ہو، میں اتنا بزدل اور کمزور بھی نہیں تھا کہ ایک مظلوم لڑکی کی مدد بھی نہ کر سکوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چیخ کی آواز دوبارہ گونجی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ میرا رخ زینے کی جانب تھا جہاں سے سکیوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ میں نہایت چوکنا انداز میں سینرھیاں طے کر رہا تھا۔ مجھے ہر پل یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ہیں میری موجودگی سے وہ شخص واقف نہ ہو جائے۔

سینرھیاں طے کر کے جیسے ہی میں آگے بڑھا تو وہ آوازیں یک یک بند ہو گئیں۔ اوپر ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ میں نارنج روشن کیے کمرے کی

میں میں نے اپنے خوف پر قابو نہ لیا۔ اندر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا۔ میں وہ مختصر راہداری عبور کرنے لگا۔ راہداری ختم ہوئی تو میں نے خود کر برآمدے میں کھڑا پایا۔ برآمدے میں دائیں ہاتھ پر لکڑی کا ایک زینہ اوپر کی طرف جارہا تھا۔ زینے کے ساتھ ایک کمرہ تھا۔

راہداری اور کمروں میں حشرات الارض نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ چند لمحے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر نارنج کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ میرے دماغ پر خوف طاری تھا۔ اس میں اب اور اضافہ ہو گیا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا خوف کی لہریں میرے رگ و پیے میں سراپت کرتی جا رہی تھیں۔ عجیب ویران عمارت تھی۔ اس کے ور و دیوار سے خوف و وحشت کی لہریں نکل رہی تھیں۔ میں خیران تھا، ای اور نعمان نے اس گھر میں کیا دیکھا تھا جو وہ اس قدر تعریفیں کر رہے تھے۔

”بھائی جان! ہم نے جو مکان دیکھا تھا وہ ہرگز ایسا نہیں تھا۔“ نعمان جھٹ بولا۔

”سفیان بھائی! آپ آگے سنائیں، پھر کیا ہوا۔“ میں نے تجسس بھرے لہجے میں انہیں نوکا۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

زینے کے قریب جو کمرہ بنا تھا اس کا دروازہ بند تھا۔ ایک بار تو دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس پر اسرار مکان سے دور بھاگ جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا اور تسلی دی کہ تم ایک بہادر اور ولیر انسان ہو۔ تم نے حالات سے بھی ڈرنا اور بھاگنا نہیں سیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوچ نے میرے دل کو بہت ڈھارس بندھائی اور مجھ میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب پورے مکان کا جائزہ لے کر میں یہاں سے جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں ایک نئے حوصلے سے آگے بڑھا۔ میں اب تک یہ نہیں سمجھا تھا کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ دراصل میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ میں دروازے کے سامنے کھڑا تھا اچانک مجھے کچھ ایسا

طرف بڑھا۔ اس وقت میں نے خود کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میں نے بند دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے دروازے سے اندر جھانکا تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ وہ کمرایا لکل خالی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں مسہری رکھی تھی اور مسہری کے پاس ایک چھوٹی سی میز بھی تھی۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ اس عمارت میں اب تک جتنی بھی چیزیں نظر آئیں وہ سب کی سب بے حد قدیم تھیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس بات نے مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ کمرے میں صدیوں کی گرد جمع تھی۔ فرش پر بھی مٹی کی موتی جھیں جمی ہوئی تھیں۔ اوپر نیچے دروازے پر کڑیوں نے جالے تان دیئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے میں صدیوں سے کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ میز پر ایک پتیل کا چھوٹا سا دیا بھی رکھا تھا اور اس پر بھی مٹی جمی ہوئی تھی۔ چچ اور سسکیوں کی آواز مجھے اسی سمت سے آئی تھی۔ میں حیران تھا اگر کوئی یہاں آیا تھا تو اس کے قدموں کے نشان تو ہونے چاہیے تھے۔ حیرت سے میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور میرا ذہن بے شمار خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اگر کوئی یہاں نہیں آیا تو پھر چیخوں کی وہ آوازیں کہاں سے آئی تھیں۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی پیچھے سے مجھے گھور رہا ہے۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا لیکن کمرے میں ہولناک ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے جونہی دروازے کی سمت دیکھا تو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نکلڑی کا وہ بھاری دروازہ چڑچڑاہٹ کی بھیا تک آواز کے ساتھ آپ ہی آپ بند ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے جسم کا خون جیسے خشک ہو گیا تھا۔ جب دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تو مجھے اچانک جیسے ہوش آ گیا۔ میں بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود۔ یوں لگتا تھا جیسے دروازہ کسی نے باہر سے

بند کر دیا ہو۔ لیکن میں دروازے کو خود بخود بند ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اب تو میں بری طرح گھبرا گیا۔ اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آسیب کا خیال آتے ہی میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بچپن میں سنی ہوئی جن بھوتوں اور بدروحوں کی بیسیوں کہانیاں مجھے یاد آ گئیں اور بے اختیار میرے ہاتھ پاؤں کا پٹنے لگے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ مجھے تنہا یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی تھی لیکن کس طرح؟ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی، سامنے دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو اس عمارت کے عقب میں کھلتی تھی۔ میں بے اختیار کھڑکی کے پاس پہنچا۔ میں باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کھولا، باہر کچھ لوگ گئی میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں مدد کے لیے پکارا مگر کسی نے میری آواز پر توجہ نہیں دی۔ چیختے چیختے میرا گلا سوکھ گیا تھا اور حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ مجھے اس وقت شدید پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

کھڑکی کا فاصلہ نیچے سے کوئی تیس فٹ تھا۔ یہاں سے نیچے بغیر کسی مدد کے اترنا ناممکن تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ لوگوں کو نہ میں دکھائی دے رہا ہوں اور نہ ہی انہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے۔ میں وہاں بے بس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ معامیر نے نظریں فرش پر پڑی اور میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ منظر تھا ہی اتنا انوکھا اور حیرت انگیز۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر فرش کی مٹی پر پراسرار انسانی قدموں کے نشان بننے چلے جا رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی نادیدہ ہستی فرش پر چل رہی ہو۔ مجھے وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا، کمرایا لکل خالی تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھانے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نشان دروازے تک پہنچے۔ اچانک دروازہ کھلا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے کھولا ہو اور وہ نشانات باہر نکلتے چلے گئے۔ میرے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ میں تیزی سے بھاگتا ہوا دروازے

کے قریب پہنچا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکنے سے بند ہو گیا اور میں اپنے ہی زور سے دروازے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ پہلے جب لوگ آسیب یا بدروحوں کی باتیں کیا کرتے تھے تو میں ان پر ہنسا کرتا تھا لیکن اب جب کہ خود میرا ان سے رابطہ پڑا تو پتا چلا کہ آسیب کیا چیز ہوتے ہیں۔ آج کی رات جو مجھ پر گزری تھی اس کا ایک ایک لمحہ میرے لیے ناقابل بیان تھا۔ اس بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ بھوک پیاس اور خوف و دہشت نے میرے جسم سے ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ اتنے آباد علاقے میں یہ جادوگری موجود تھی لیکن اس پاس کے رہنے والے اس سے ناواقف تھے۔ اچانک دروازے کی چڑچاہٹ سے میں چونکا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔ میں بے اختیار بھاگتا ہوا زینے تک پہنچا تو جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہوش و حواس ایک لمحے کے لیے محفل ہو گئے۔ زینے کی درمیانی سبز جیوں پر ایک خونخوار سیاہ بلا کھڑا میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔

اچانک اس بلے کے چہرے پر مجھے مسکراہٹ نظر آئی۔ میں نے ہزاروں بار افسانوں کو مسکراتے تو دیکھا تھا مگر کسی خونخوار بلے کو مسکراتے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یقین جانو اس بلے کی مسکراہٹ اتنی حیرت انگیز اور خوفناک تھی کہ میری سانسیں رکنے لگیں۔ میں پتھر کا بت بنا اسے گھورے جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کھڑے ہوئے مجھے صدیاں نذر گئی ہوں۔ اچانک بلا خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا تو جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں واپس اسی کمرے کی طرف بھاگا۔ خونخوار بلے کا پنجہ میری ٹانگ پر پڑا تھا اور میری پیٹ کا پانچھ لے اڑا تھا۔ میں نے کمرے میں آکر دروازہ بند کر دیا۔ میں دونوں ہاتھ دروازے پر رکھے ہانپ رہا تھا۔ وہ بند دروازے پر پنجے مار رہا تھا اور میں اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ میری

قوت مدافعت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت موت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں اس دہشت ناک صورت حال کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکتا تھا۔ پنجے مارنے کی آواز اب بند ہو گئی تھی اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تیزی سے میز کی طرف گیا اور چیتل کا وہ دیا اٹھالیا کہ اب۔ بنے سے سامنا ہوا تو اس کے سر پر دسے ماروں گا۔ میں دوبارہ کھڑکی تک گیا اور ہڈیالی انداز میں مدد کے لیے چیخنے لگا۔ "بچاؤ، بچاؤ، ارے کوئی ہے۔ بچاؤ۔"

یہاں تک پہنچ کر سفیان بھائی رک گئے۔ جذبات سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔ میں اور نعمان حیرت زدہ ان کی آپ جتنی سن رہے تھے۔ سفیان بھائی کی آنکھیں سرخ تھیں اور ان کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے پانی مانگا۔ نعمان پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آیا تو دو تین گھاس پانی پی کر ان کی حالت کچھ اعتدال پر آئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میں انسانوں سے تو مقابلہ کر سکتا تھا مگر مافوق الفطرت ہستیوں سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس آسیب زدہ مکان میں میرا ایک ایک پل مجھے صدمہ جیسا لگ رہا تھا مصیبت کے ایسے لمحات میں ہر انسان کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ خود غرض انسان کو جب کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہوتی تو وہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتا مگر جب برا وقت آتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ یہی اس وقت میرا بھی حال تھا۔ میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے دعا مانگنے لگا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ اس سے میری وحشت میں نمایاں کمی آئی اور دل کو ڈھارس ہوئی۔

اسی وقت ایک تیس پینتیس سالہ شخص کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔

"ارے ڈرو نہیں، میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ تم کافی دیر سے آوازیں دے رہے تھے۔" اس نے اندر آتے ہی مجھے تسلی دی۔

”خدا کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالیں! میں یہاں آکر جنس کیا ہوں۔ یہاں عجیب و غریب حالات ہیں۔ میں نہ جانے کتنے گھنٹوں سے یہاں بھٹک رہا ہوں۔“

”آپ اطمینان سے بیٹھیں، یہ پانی نہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس مجھے تنہا دیا اور کہا۔ ”اپنی حالت دیکھیں، خوف سے آپ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر اور آپ کی آوازیں سن کر میں اندر آ گیا۔ میں یہاں نزدیک ہی رہتا ہوں۔“ ہم اسی مسہری پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”آپ کس نے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا؟“

”ہمارا ایک مکان خریدنے کا ارادہ تھا۔“

”یہ جگہ کیسے نیچی جاسکتی ہے۔ یہ تو ایک آبی آماجگاہ ہے۔“

”آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟“ میرا خوف اب کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔

”میں بہت عرصے سے یہاں رہ رہا ہوں اور اس جگہ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہیں؟“ میری جنس کی حس پھر بیدار ہو گئی تھی۔

”اس جگہ بدروحوں کا قبضہ ہے۔ ہوا یوں کہ اس مکان میں ایک پولیس انسپکٹر اپنی بیوی اور چار سالہ بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ اس علاقے میں اس کی نئی نئی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ اس نے یہ مکان بڑے ارمانوں سے خریدا تھا مگر اسے یہاں رہنا اور بسنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی بیوی کو سامنے واقع قبرستان سے بڑا خوف آتا تھا۔ شوہر تو دن میں ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا اور وہ اور اس کا چار سالہ بیٹا پورا دن تنہا رہتے تھے۔ اسے یہ مکان شروع سے ہی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بضد تھی کہ اسے سچ کر کہیں اور شفٹ ہوا جائے۔ انسپکٹر اسے بارہا سمجھا چکا تھا کہ مکان بیچنا اور دوسرا مکان خریدنا اتنی جلدی ناممکن ہے مگر وہ بڑی جذباتی اور ضدی عورت تھی۔

آئے دن ان میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔

ایک دن صبح صبح ان دونوں میں تکرار شروع ہوئی۔ تکرار نے کچھ ہی دیر میں جھگڑنے کی صورت اختیار کر لی۔ انسپکٹر ریاض کو ایک غصہ آ گیا اور اس نے ایک ہاتھ اپنی بیوی کو جز دیا اور خود ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک تو روٹی رہی پھر جذبات اور غصے میں اندھی ہو گئی۔ اس نے اپنے چار سالہ معصوم بیٹے کو گلا دیا کر مار ڈالا اور خود کو اسی کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، چھت کے پٹکے سے لٹکر خودکشی کر لی۔

اوتھر انسپکٹر ریاض کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی اور بے چینی اس پر سوار تھی۔ وہ صبح اپنی بیوی سے لڑ جھگڑ کر نکل تو آیا تھا مگر وہ اپنی بیوی کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت سے ذرتا تھا۔ اس نے جلدی چھٹی لی اور گھر آ گیا۔ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھکا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے اپنی بیوی اور بچے کو آوازیں دیں اور انہیں تلاش کرنے لگا۔ وہاں کوئی زندہ ہوتا تو جواب دیتا۔ اس نے میزھیوں پر پڑی ہوئی اپنے بچے کی لاش اور اس کمرے میں چٹکے سے لٹکی ہوئی اپنی بیوی کی لاش دیکھی تو تڑپ کر رہ گیا۔ یہ سب دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ نیچے اترا، کمرے میں گیا اور اپنی سرکاری پستول سے خود کو ختم کر لیا۔ یوں بیک وقت اس دن یہاں سے تین جنازے اٹھے۔

کہتے ہیں جو لوگ اس طرح غیر طبعی انداز میں مرتے ہیں ان کی رو میں اس دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں اور وہ ایک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔“ یہ واقعات سنا کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔

”لیکن یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں پیش آیا حالانکہ یہ ایک آبا و علاقہ ہے۔“

”ہوسکتا ہے ان روحوں نے دوسروں کو بھی یہ سب بتانے کی کوشش کی ہو اور وہ خوف زدہ ہو گئے ہوں یا انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔ آپ ایک نڈر اور دلیر انسان ہیں، حافظ قرآن ہیں۔ آپ ان روحوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



جیسے ہی اس شخص نے یہ پہلے ادا کیے، میں بڑی طرح چونک گیا۔ اسے کیسے بچا چکا کہ میں حافظہ قرآن ہوں۔ میری رینجہ کی بذی میں سروسی لبر دوزنی۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور کہا۔

”آئیے میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔ میں جیسے کسی زائس میں آیا ہوا اس کے پیچھے پیچھے نہ اترنے لگا۔ پتیل کا دیا ابھی تک میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ مکان کا بیرونی دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے لمحے بھر کے لیے پٹ کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

یہ دیکھتے ہی میرے منہ سے بذیانی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں ر کے بغیر مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے جسم سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بدروحیں میرے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر بھاگتا رہا اور کتنے راستوں سے گزر کر گھر پہنچا۔ اس وقت میری حالت بہت ابتر تھی۔ میرے حواس گم تھے۔ میں نے دروازہ زہر سے بھجایا تو نعمان نے دروازہ کھولا۔ نعمان میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور اسے دیکھ کر میری جان میں جان آگئی تھی لیکن میری ہمت اب جواب دے گئی تھی۔ میرا ذہن جیسے تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا جہاں تمام وقت ڈاکٹر بٹھے یہ یقین دلاتے رہے کہ وہ سب میرا اہم تھا اور انسانی فوٹن کی کارستانی تھی۔ میں نے بھی اسے اپنا وہم سمجھ کر بھلا دیا۔ تو ڈکوشن کی۔ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اسپتال۔ یہ پھنسی کے بعد میں خمر پہنچا تو دوسرے دن امی نے میری وہ پیٹ جو میں نے اس واقعے کے روز پہلی ہوئی تھی دکھاتے ہوئے پوچھا تھا کہ اس کا پانچویں سے پہنچا تھا اور پیٹ کی جیب سے یہ پتیل کا دیا بھی ماہ ہے۔ یہ ایسے نگوں ثبوت تھے جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ میرے ساتھ پیش آنے والے وہ واقعات

حقیقت تھے کوئی دواہمہ یا ذہنی اختراع نہیں تھے۔

”لیکن سفیان بھائی مالک مکان کے گھر کے برابر میں تو ایک خالی پلاٹ ہے۔ پلاٹ کے ساتھ جو مکان ہے اسے خریدنا چاہتے تھے۔“ نعمان نے جھنجھکی سے بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں کوئی خالہ قطعہ اراضی نہیں ہے۔ مالک مکان کے گھر کے برابر میں ہی وہ قدیم مکان موجود تھا۔ اگر تہجج کہہ رہے ہو تو کل صبح ہم تینوں وہاں چلیں گے۔ میں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ سفیان بھائی نے پرسوج انداز میں کہا۔

☆.....☆

دوسرے دن صبح سویرے ہم وہاں پہنچے تو مالک مکان کے گھر سے ملحق خالی قطعہ اراضی ہمارا منہ چڑا رہا تھا جہاں بقول سفیان بھائی کے وہ پراسرار مکان اس رات انہوں نے دیکھا تھا۔

بعد میں وہاں رہنے والے بزرگوں کے ذریعے ہمیں پتا چلا تھا کہ اس قطعہ اراضی پر کسی زمانے میں ایک مکان ہوا کرتا تھا جو آجیب زدہ مشہور تھا۔ اس مکان کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ وہ مکان کشنر کی صورت اختیار کر گیا تھا بعد میں اس پاس کے رہنے والے امینس وغیرہ بھی اٹھا کر لے گئے۔ اب وہ قطعہ اراضی خالی پڑا تھا۔

کچھ عرصے بعد میں بھی کراچی کو خیر باد کہہ کر اپنے گاہوں واپس آ گیا تھا۔ سفیان بھائی بیرون ملک چلے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے بھائی اور امی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ کافی عرصہ میرا ان سے رابطہ رہا پھر رفتہ رفتہ ہم اپنی مصروف زندگی میں کھو جاتے چلے گئے اور رابطہ برقرار نہ رہ سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سفیان بھائی جب کبھی یہ کہانی پڑائیں گے اس کی تصدیق ضرور کریں گے کیونکہ اس کہانی کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور اس کا ثبوت وہ پتیل کا دیا ہے جو سفیان بھائی کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔

☆.....☆

Downloaded From
Paksociety.com

پراسرار خیر کی آٹھویں خاص کہانی

بے چین الارواح

فرح انیس

اُس گورکن کی دل خراش داستان جسے ایک بے چین ماں کی روح کو آزاد کرنا پڑ گیا تھا



Downloaded From
Paksociety.com

”موحد یاد کوئی پاران بناؤ نہیں کہو منے کا۔ اب
تو تمہارے دادا کی طبیعت بھی ٹھیک ہو گئی ہے۔“
سجاد اپنے دوست موحد سے بولے۔ وہ دونوں اس
وقت ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

95 WPA1(SOCIETY.COM

"ہاں یار میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہیں چلا جائے۔ دادا کی خراب طبیعت کی وجہ سے ہر وقت دماغ دادا کی طرف لگا رہتا تھا۔ اب ان کی طبیعت جب سے بہتر ہوئی ہے تو سکون ہوا ہے۔" موحّد مسکرا کر سجاد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "سیل فون کی بپ پر موحّد سیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی ای کی کال آرہی تھی۔"

"ہیلو جی ای!"

"بیٹا تمہارے دادا کا انتقال ہو گیا۔" دوسری جانب موحّد کی ای ردتے ہوئے بولیں۔ اس خبر نے موحّد کے حواس معطل کر دیے۔

☆.....☆

"قبرستان میں دادا کو دفنانے کے بعد موحّد اور اس کا تایا زاد سعد افسردہ سے کھڑے تھے۔ دونوں ہی اپنے دادا سے بہت قریب تھے۔

"بیٹا موحّد بات سنو۔"

"جی تایا!" وہ تایا کے ہانسنے پر ان کے پاس چلا آیا۔

"بیٹا میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اشرف مکنیک کے پاس گیا ہے گاڑی لے کر۔ بول رہا ہے نام لگے گا۔" وہ ڈرائیور کا نام لیتے ہوئے بولے۔

"تم اور سعد اس کے ساتھ گھر آ جانا گاڑی ٹھیک کروا کر۔ میری ایسی طبیعت نہیں کے میں زیادہ دیر یہاں رکوں۔" تایا مذہال لہجے میں بولے۔

"نہیں تایا آپ گھر جائیں بالکل بے فکری سے، ہمیں دیر بھی ہوگئی تو کوئی بات نہیں۔" موحّد کے تایا دل کے مریض تھے اور باپ کی موت نے ان کو مذہال کر دیا تھا۔ وہ اپنے تایا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"او کے بیٹا جی! تم دونوں اپنا خیال رکھنا۔"

وہ سعد اور موحّد کو دیکھتے ہوئے بولے جو وہیں چلا آیا تھا۔

☆.....☆

"یار سعد تو اس وقت گھر پر تھا جب دادا کا

انتقال ہوا تھا۔ کیا ہوا تھا یار اتنا اچانک یہ سب... دادا تو ٹھیک تھے۔" موحّد افسردگی سے سعد سے پوچھنے لگا۔

"بتائیں یار بس اچانک ہی دادا کی طبیعت خراب ہوئی۔ سعد دکھ سے بولا۔

"یار مغرب ہونے کو ہے یہ اشرف ابھی تک نہیں آیا۔" سعد قبرستان میں بڑھتے اندھیرے کو دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔

"رکو میں کال کرتا ہوں۔" موحّد کال پر اشرف سے پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا کیا کہہ رہا ہے اشرف۔"

"یار کہہ رہا ہے گاڑی میں کوئی بڑا فالٹ ہے۔ نام لگے گا۔" سعد کے پوچھنے پر موحّد بتانے لگا۔

"یار موحّد اتنی دیر ہم یہاں کیا کریں گے۔ دیکھ تو یار کوئی بھی ہمیں دور تک دکھائی نہیں رہا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" سعد نے اپنے اطراف میں خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا تم گھبراؤ نہیں میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" موحّد سعد کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ سعد فطرنہ ڈر پوک بھی بہت تھا۔

"یار پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے میرا موحّد۔"

"یار پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے کیا کریں۔" موحّد کی سوچتی نگاہیں قبرستان کے چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔

"سعد دیکھو وہاں مجھے لگتا ہے کوئی رہتا ہے۔"

ہاتھ کے اشارے سے وہ اس کو کسی رہائش کے آثار دکھانے لگا۔ دور سے نظر آتی کوٹھری میں جلتی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔

"چلو دہیں چلتے ہیں۔" دونوں اس کوٹھری کی جانب بڑھ گئے۔ بوسیدہ سادہ دروازہ بجانے پر اندر سے بوڑھے کی کھانسی آواز سنائی دی۔

"کون سے باہر۔"

"دروازہ کھولیں ہمیں پانی پینا ہے۔" موحّد کے کہنے پر اس شخص نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے

ہی ایک بوڑھا کھڑا تھا جب مشکوک نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے کیا ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکتے ہیں۔“

”آ جاؤ اندر۔“ موحد کے بتانے پر وہ بوڑھا ان دونوں کو اندر آنے کے لیے جگہ دیتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں پرانی سی چارپائی، ایک چھوٹا سا صندوق اور منکا رکھا تھا۔ وہ دونوں اس چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا دروازہ بند کر کے دروازے کی کنڈی پر کافی سارے دھاگے تیزی سے لپیٹ رہا تھا۔ موحد اور سعد بوڑھے کی اس حرکت پر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔

”کرنا پڑتا ہے یہ سب بیٹا! اگر یہ دھاگے بند لپیٹوں تو روٹیں پوری رات مجھے تنگ کیے رہتی ہیں۔“ بوڑھا ان کی طرف آتا ہوا بولا۔ بوڑھے کی اس بات پر دونوں خوفزدہ سے ہو کر بوڑھے کو دیکھنے لگے۔

☆.....☆

”پیشے کے لحاظ سے میں ایک گورکن ہوں پچھلے تیس سال سے میں اس قبرستان میں کام کر رہا ہوں۔ مردوں میں رہ کر میرا ذر خوف بالکل ختم ہو چکا ہے۔ میں عرصہ دراز سے اس کوٹھری میں مقیم ہوں۔ مجھے مردوں سے زیادہ باہر کی دنیا کے انسانوں سے خوف آتا ہے۔ میرے نزدیک مردہ بے ضرر ہوتا ہے۔ جب کے انسان خطرناک ہے۔“

”دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردیاں اپنے عروج پر تھیں۔ سردیوں میں ویسے بھی رات جلدی ہو جایا کرتی ہے۔ یہ واقعہ تو برس قبل ماہ دسمبر کا ہے۔ میں شام کو اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ کوئی رات کے دس بجے ہوں گے میں اپنی چارپائی پر لیٹا تھا کہ دروازہ زور زور سے کوئی بجانے لگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔

”ہمارے ساتھ چلو ہمیں تم سے ضروری کام

ہے۔“ ان کے کہنے پر میں ان کے ساتھ چل دیا۔ قبرستان سے تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میرے ذہن میں خدشات آنے لگے کہ میں مجھے اغوانہ کرنا ہو یا میرا یہ لوگ قتل نہ کر دیں۔

”بے فکر رہو تم کو ہم کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“ ان میں سے ایک مرد میرے رکنے پر بولا شاید اس نے میرے چہرے پر خدشات کے سائے دیکھ لیے تھے۔ ان کے کہنے پر میں گاڑی تک آ گیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ڈیگی کھولی میں آگے بڑھ کر دیکھنے لگا تو ایک دم جھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک عورت کی لاش تھی جس کے منہ کو چادر سے تنج سے ڈھکا ہوا نہیں تھا۔

”اس لاش کو دفنانا ہے۔ کہیں بھی ٹھکانے لگا دو۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتا۔“ میں انھیں سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”پانچ لاکھ دیں گے ہم تمہیں۔“ پیچھے سے آواز پر لکھ بھر کو میرے قدم رکے پھر تیز تیز چلتا ہوا اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ مجھے ہار بازار اپنی بجلی کا خیال آ رہا تھا۔ جس کی شادی ہونے والی تھی اور بڑے بھائی کو پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔

”افضل دولت خود چل کر تیرے در پر آئی ہے ناشکری نہ کر۔“ میں اپنی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ دروازہ پھر سے بجنا شروع ہو گیا دروازہ کھولا تو وہی دو آدمی سامنے کھڑے تھے۔

”لے آؤ لاش۔“ میرے کہنے پر دونوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جلدی جلدی کر کے میں نے لاش کو اس چادر سمیت دفنایا اور پانچ لاکھ لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ دوسرا دن کام میں مصروف ہی گزرا، رات ہوئی تو میں سوچنے لگا یہ پیسے لے کر کل ہی گاؤں کے لیے نکل جاتا ہوں۔ بھائی کو پیسے بھی دے دوں گا۔ اور شادی میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

دروازہ بصرہ دھڑانے کی آواز پر چونک کر میری آنکھ کھلی۔ میرے ذہن میں وہی دہرنا آگئے۔ کیا بتان کے دل میں بے ایمانی آگئی ہو اور وہ مجھ سے پیسے چھین کر مجھے مار کر بھاگ جائیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ پینے کی رفتار میں شدت آگئی تھی۔

”کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”دروازہ کھولو۔“ نسواں آواز پر میں اچھل گیا رات دو بجے کسی عورت کا قبرستان میں کیا کام۔ کیا پتا اس بے چاری پر کوئی افتاد آگئی ہو اور مجھ سے مدد طلب کرنے آئی ہو۔ میں اپنی ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

دروازہ کھولو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ اس عورت کی آواز پر میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ایک عورت چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ جو چیز اس کے چہرے پر چونکا دینے والی تھی وہ تھیں اس کی بے حد ویران آنکھیں۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس چہرے کو میں نے نہیں دیکھا ہے۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ وہ عورت تھی جس کو میں نے کل ہی دفتاریا تھا۔ خوفزدہ ہو کر میں نے تیزی سے دروازہ بند کیا۔ پوری رات وہ عورت دروازہ بجاتی رہی اور میں خوف سے لحاف میں دبکا کا پتا رہا۔

☆.....☆

”مجھے اپنے کمرے میں مقید ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس عورت کے خوف و ڈر کی وجہ سے میں باہر بھی نکلنا تھا۔ پتا نہیں وہ عورت مجھ سے کیا چاہتی ہے میں اپنی سوچوں میں غلطیاں تھا کہ دروازہ بجنا شروع ہو گیا۔ میں ڈر کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ آج دروازہ بجانے میں اتنی شدت تھی کہ لگتا تھا وہ عورت دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گی۔“ مجھے انتقام لینا ہے۔ میری بے چین روح کو سکون چاہیے۔“ اس روح کی کھڑکھڑائی آواز میرے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ پوری

رات اس کی یہی آواز آتی رہی۔ میں کانوں میں اڑھکیاں ٹھونسے صبح ہونے کی دعا کرتا رہا۔ فجر ہوتے ہی وہ دستک اور اس کی آوازیں آنا بند ہو گئی۔ صبح تک مجھے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ شام میں پیاس کی شدت سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ منکے میں پانی ختم ہو گیا تھا مجبوراً مجھے اٹھ کر پانی لینے باہر جانا پڑا۔ پانی لے کر جونہی میں کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے پلٹا تو خوف سے میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ وہ عورت میری چار پائی پر بیٹھی تھی۔

”رک کیوں گئے! آؤ۔“ اس کی سرد آواز سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سینساہٹ سی دوز گئی۔ میری اس وقت کیا کیفیت تھی یہ بیان سے باہر ہے۔ ایک مردہ آپ کے کمرے میں بیٹھا ہو تو انسان کے خوف سے اوسان ہی خطا ہوں گے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی سنے بغیر چار نہیں۔

☆.....☆

”میرا نام شہلا ہے۔ میرے شوہر کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے۔ میرے شوہر کا بیٹا مالدار تھے۔ ان کی موت کے بعد سب کچھ میرا ہی تھا کیونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ میرے ساس، سسر کا بھی انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ میسے میں بس ایک بہن تھی وہ بھی دوسرے شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھی۔ اس کے مالی حالات شروع سے اچھے نہ تھے۔ میں اس کی ہر طرح سے مالی مدد کرتی تھی۔ وہ مجھے منع کرتی رہ جاتی پر مجھے اپنی بہن سے بہت محبت تھی اور میں چاہتی تھی کہ وہ خوشحال رہے۔ میرے شوہر کے دو چچا زاد بھائیوں کا ہمارے گھر کا بیٹا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ شروع میں، میں کافی ڈر گئی تھی۔ وہ میرے بچوں کو کہیں باہر لے جانا بھی چاہتے تو میں ان کو جانے نہیں دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان دونوں نے مجھ پر اپنا اعتبار قائم کیا۔ اب میرے دونوں بیٹے ان کی آمد پر بہت خوش ہوتے تھے۔ میں بھی مطمئن تھی کہ میرے بچے

کے بچے کھڑے تھے۔ آج اس روح کے چہرے پر سکون تھا

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی ہوں۔ تم نے میری بہت مدد کی اب میں اور میرے بچے پر سکون ہیں۔ تمہیں تمہارا تحفہ کل مل جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ روح غائب ہو گئی۔ اگلے دن میں اس روح کی تحفے والی بات کو سوچے جا رہا تھا کہ شام میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس نے اپنا نام مہوش بتایا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ شہلا کی بہن ہے۔ اور میری امانت دینے آئی ہے۔ میں نے پوچھا کون سی امانت تو اس نے بتایا شہلا نے آپ سے بھی پانچ لاکھ اودھار لیے تھے اور وہ بار بار میرے خواب میں آکر کہتی ہے کہ وہ پانچ لاکھ میں آپ کو لوٹا دوں۔ اس عورت کی بات پر میں حیران ہوتا ہوا سوچنے لگا شاید یہی وہ تحفہ ہے جس کی کل شہلا نے بات کی تھی۔ شہلا نے پھر بھی میرے دروازے پر دستک نہیں دی۔ اس کی بے چین روح کو سکون مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بہت سی بے چین روحیں مجھے تنگ کرنے لگی تھیں، جس کی وجہ سے میں نے ایک روحانی بزرگ سے یہ پڑھنے ہوئے وہاں کے لیے اور ان کو اب میں اپنے دروازے کی کنڈی پر لپیٹ کر رکھتا ہوں تاکہ یہ روحیں مجھے تنگ نہ کریں۔“

یہ کہہ کر وہ گورکن چپ ہو گیا۔ سیل پر اشرف کی کال آرہی تھی۔ وہ قبرستان کے باہر گاڑی میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں اور سعد اس گورکن کو خدا حافظ کہہ کر اس کی کونٹری سے باہر نکل گئے۔

ہم تیز تیز چلتے ہوئے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ اندھیرا قبرستان کی ہولناکیوں میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ موحد نے اس گورکن کی کونٹری کی طرف دیکھا سعد کی کانپتی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عورت سفید لباس میں بال کھولے اس گورکن کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اور سعد خوفزدہ ہو کر باہر گاڑی کی جانب سرپٹ دوڑے تھے۔

☆☆☆

خوش ہیں۔ مگر ایک دن میں نے ان دونوں بھائیوں کو باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ وہ میرے اور میرے بچوں کے قتل کے منصوبے بنا کر میری ساری جائیداد پر قبضہ جمالینا چاہتے تھے۔ میں جو دروازے کی جھری میں سے سب سن رہی تھی۔ ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں ڈر کر تیزی سے بھاگنے کے لیے مڑی مگر وہ دونوں مجھ تک پہنچ گئے تھے فوراً انہوں نے مجھے قابو میں کر لیا تھا۔ میری چیخ سن کر میرے دونوں بچے آگئے تھے اور وہ مجھے بچانے کے لیے ان دونوں کو مارنے لگے پر ان ظالموں نے میرے بچوں کو میرے سامنے مار ڈالا، لان میں فٹن کر دیا اور مجھے مار کر یہاں لے آئے۔“ کمرے میں اس عورت کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”انصاف چاہتی ہوں، تم ان دونوں بھائیوں سمیل اور ارشد کو گرفتار کرواؤ گے اور میرے بچوں کی لاش کو میرے گھر کے لان سے نکلاؤ اور میری لاش کو بھی نکلاؤ۔ اور ہمارے کفن و دفن کا انتظام کرو۔ میری ساری دولت کی حقدار میری بہن ہے۔“

اس کے بعد میں پولیس اسٹیشن گیا۔ پہلے تو پولیس میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہوئی کیونکہ پولیس کو لگ رہا تھا یہ روح والی بات ایک مذاق ہے۔ مگر بعد میں لان کی کھدائی کروائی تو وہاں دو بچوں کی لاشیں ملی۔ ارشد اور سمیل کو گرفتار کیا تو انہوں نے بعد میں خود ہی اعتراف کر لیا۔ اس عورت اور اس کے بچوں کی تدفین کرو دی گئی۔ میں نے وہ پانچ لاکھ بھی اس عورت کی بہن کے حوالے کر دیے۔

دوسری رات پھر دروازے پر دستک شروع ہوئی۔ میں ڈر گیا کہ اب وہ عورت یہاں کیوں آئی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو وہ عورت کھڑی تھی اور اس کے دائیں بائیں اس



سیران میری نوین خاص کہانی

مختصر سیران میری نوین خاص کہانی

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

تقسیم کے وقت کی یہ اسرار کھانہ اسرار میری دانہ صاحب کو کہا ملی کہ

اک جا ہی تے زندگی ہی اجیرن کر ڈالی

"وہ کیسے؟"

"ہم کانپور کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے لکھنؤ

کے قریب۔"

"ہاں یاں جانتی ہوں بلکہ دیکھا ہے۔ اناؤ میں

ہماری زمینیں تھیں۔ (اب بھی چن)"

"خیر بہن صاحب یہ بات بتاتے ہوئے میرے

رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"پھر تو میں ضرور سنوں گی۔" دادی اناں نے

جواب دیا۔ اب میری بھی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔

"ارے بھائی کیا بتائیں۔ کوئی سر نہ پیر اب تو

خود؟ یہاں کسی کو نہ بتائیے گا۔"

"بے فکر ہیں۔"

"ان کے والد تھے حکیم کے باپ۔ ان کے بیٹے

نے عبدالحکیم کا نام لیا۔" اور لہجے میں پراسراریت پیدا

کی۔

"ہاں ڈیوٹی سے آرہے تھے۔ راستے میں ایک

مکان گرا پڑا تھا۔ کڑا کے کی سرونی تھی۔ بارش بھی مچ سے

ہوئے چلی جا رہی تھی پھر؟ بجلی چمکی انہیں مٹی میں دبی

یہ میرے بچپن کی بات ہے۔ آسمان پر جنگ کے
بادل چھائے ہوئے تھے۔ ملک تقسیم ہو رہا تھا اور پھر بنگلہ
دلش بن گیا۔ ہمارے پڑوس میں ایک بزرگ خاتون
رہتی تھیں۔ وہ میری دادی حضور کی سہیلی تھیں۔ اکثر شام کو
اپنے گھر سے فارغ ہو کر ہمارے گھر آ جاتیں۔ دادی
حضور کے پاس بیٹھ جاتیں اور قصے کہانیاں شروع ہو
جاتے۔ ان کی نواہی میری سہیلی تھی۔ ہم اپنی گڑیاں کھیل
رہے ہوتے اور بچے بھی آ جاتے۔

میرے کان نانی اماں کی طرف ہی لگے رہتے تھے
اور دوسرے بچوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ میں بظاہر ان کے
ساتھ کھیل رہی ہوتی لیکن میرے کان ان کی کہانی سن
رہے ہوتے۔ موضوع زیادہ تر تقسیم ہی ہوتا پھر بہتیں۔

"اے بہن یہاں بھی وہی حالات ہوتے جا رہے
ہیں۔" لیکن یہ موضوع نیا تھا۔ اس لیے توجہ بھی زیادہ
ہوئی۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ پاکستان کیسے
آئیں؟"

"ارے بہن ہماری کہانی سب سے الگ ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

100

ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ اس وقت بجلی دوبارہ چمکی اور انہوں نے جھک کر اسے اٹھا لیا وہ کچھ مٹی میں دبئی تھی کچھ بارش سے باہر آ گئی۔

انہوں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ گھر آئے بچے سو رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ”دیکھو یہ کیا چیز ملی ہے۔“ میں نے لائین کی لو اوپننگی کی۔ ”یہ تو بڑی خوب صورت سرے دانی ہے۔“

ہم میاں بیوی باورچی خانے میں آ گئے اور اچھی طرح اسے دیکھنے لگے۔ بالشت بھرست کچھ کم تھی۔

تھی خیر نہیں کھانا دیا ہم کمرے میں آ گئے۔ سنگھار کے لیے ایک میز تھی۔ اسی میں آئینہ لگا تھا۔ وہیں اسے رکھ دیا اور ہم سو گئے۔ رات بھر میں خواب میں دیکھتی رہی کہ یہ رقص کر رہی ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتے پانی میں دماغ سے نکل گیا۔ دوپہر جب صفائی کر رہی تھی تو یہ اپنی جگہ سے کافی دور تھی کسی بچے نے دیکھی ہوگی مجھے کچھ ڈر سا لگا۔

کمرہ ایک ہی تھا لیکن کافی بڑا تھا۔ تین بیٹے ایک بیٹی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے بیٹی کی شادی کر دی تھی چھوٹی عمر میں۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ ہم لڑکے سب اسی کمرے



میں سوتے تھے۔ رات جب سب سونے کے لیے لیٹ گئے میں اسی کو دیکھ رہی تھی، نیند پتا نہیں آئی کہ نہیں مجھے لگا وہ اپنی جگہ سے ہل رہی ہے۔ پھر لگا کہ وہ ناچ رہی ہے۔ سب کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو رہے تھے۔ میرا ڈر کے مارے برا حال۔ اتنے میں کمرے کا وہ دروازہ جو باہر کھتا تھا چر کر کے کھلا اور ایک آدمی دھوتی پہنے اوپر سے ننگا تمام سر منڈا ہوا اور یہ موٹی چوٹی ہمارے کمرے میں گھس آیا۔ ”اُف میرے خدا!“ میری نڈر واوی حضور بھی سہم گئیں۔ ان کی نوا سی ان کی گود میں آ گئی۔ باہر کے بچے

”چاندی کی معلوم ہوتی ہے۔“ میں بولی۔
”یہ چاندی ہی کی ہے۔“ وہ بولے۔ ”تم لے لو سنبھال کے رکھ لو استعمال کر لینا۔“
”ہمارے بڑوں نے زمین پر پڑی چیز اٹھانے سے منع کیا ہے۔ عالم کہتے ہیں کہ اس طرح چیز کو مالک تک پہنچانا واجب ہو جاتا ہے۔“ داوی اماں نے شریعت بتائی۔

”ارے بہن صاحبہ! میں تو کسی مولوی ملا کی بیٹی تھی نہیں لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی

اپنے گھروں کو؟ اور میں خود بھی اپنی دادی حضور کی بغل میں بیٹھ گئی۔

"پھر نانی اماں۔"

"اس کے ہاتھ میں مسندی تھی۔ اس نے اسے زمین پر بچھالیا۔ پھر سرے والی کو اٹھا کر چوما پھر درمیان سے کھولا۔ درمیان میں سچ تھے۔ ارے بہن صاحبہ اس میں اتنی خوب صورت مورتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اس آوی نے مسند زمین پر بچھائی اور ایک چمکیلا سا کپڑا ہماری تپائی پر بچھا کر مورتی رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میں بے ہوش ہو گئی یا سو گئی۔ صبح اُنھی تو سب کچھ اسی طرح تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اسے وہیں چھوڑ آئیں جہاں سے لائے تھے۔ کہنے لگے۔ "کیوں؟" میں نے سب بتا دیا۔ انہوں نے خوب مذاق اڑایا۔ "تمہارا پیٹ خراب ہو گیا ہے برے خواب نظر آرہے ہیں۔"

ہمارے گھر کے ساتھ ایک احاطہ تھا۔ وہ ہماری ملکیت تھا۔ اس میں ہمارے مولیشی تھے۔ وہاں سے اس وقت لڑکا آیا۔

"چاچا آپ کی دودھ دینے والی بکری مر گئی۔"

دو دن بعد بھینس مر گئی اور نقصان پر نقصان ہونے لگے۔ "آپ اسے پھینک دیں نہیں آتے؟"

"میں جمعے کے خطبے میں گیا تھا مولوی کہہ رہے تھے دوسرے کے مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے حضور کا فرمان ہے۔ پتا نہیں وہاں کن ہاتھوں میں پڑے۔ میں چھٹی کے دن کسی پنڈت سے مل کر یہ اس کے حوالے کر دوں گا۔"

پاکستان بن چکا تھا۔ ہم لوگوں کا اداہ وہیں رہنے کا تھا۔ وہاں ہمارا گھر یا رہا تھا۔

لیکن اس رات جب سب بے خبر سو رہے تھے بہت سے بلوائی کھس آئے جنے بجرنگ ملی کے نعرے سے آنکھ کھلی۔ پھر لگا کہ کوئی دروازہ تو زور رہا ہے۔ ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔

"دروازہ کھول دو جان سے نہیں ماریں گے۔"

سامان لوٹ کر چلے جائیں گے۔"

تینوں جوان بیٹے اور ہم۔ ان کے باپ نے اندر سے کہا۔ "اپنی بات سے پھر دھکے تو نہیں۔"

اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ پانچ سات بلوائی اندر گھس آئے۔

"آپ کو یقین نہیں آئے گا؟"

"کیسے نہیں آئے گا۔ آپ کہیے۔"

"ارے بہن! وہ سرے والی ملی اور اس میں سے دھوئیں کی کیرنگلی اور سیدی ان کی آنکھوں میں؟"

"ہائیں! حیرت سے دادی حضور کا منہ کھل گیا۔ وہ بہت غصے والی خاتون تھیں اور بہت لمبے دیئے رہتی تھیں۔ انہیں حیرت زدہ دیکھ کر میری بھی سمجھ میں یہی آیا کہ بہت حیرت کی بات ہے۔ شاید یعنی ان کی نو اسی خوفزدہ ہو کر ان کی گود میں سو چکی تھی۔ میں دادی حضور سے چسکی بیٹھی کہانی ختم ہونے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا؟" دادی کے ساتھ میں بھی بول پڑی۔

"بھئی ان کی آنکھیں دھوئیں سے لگتا تھا مر چیں ملی ہیں چندھیا گئیں۔"

جب یہ دیکھ کر دھواں سرے والی سے نکل رہا ہے تو ایسا بھاگے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر وہ جو کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے ہمیں بھی نیند آ گئی۔ رات ان کے باپ نے بھی وہی منظر دیکھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس میں اضافہ یہ ہوا کہ مورتی نے ان کا نام لے کر کہا کہ ہم نے تمہاری مدد اس لیے کی ہے کہ تم ہمیں بارش سے بچا کر لائے تھے۔

صبح انہوں نے مجھے بتایا۔ "میں آج ہر حال میں پنڈت ڈھونڈتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ بلوے ہو رہے ہیں۔ میں اس تک کیسے پہنچوں کہیں کوئی مار نہ دے۔"

دن میں چہل پہل ہو گئی۔ ایک دوست تھے رام چندر۔ ان سے ملے پھر پنڈت جی تک پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ آپ شوق سے ہمارے بھگوان ہمارے حوالے کر دیں۔"

”ہم تم سے ایک سودا کرنے آئے ہیں۔“ خوف سے گھٹی بندھی ہوئی تھی۔ اشارے سے پوچھا۔ ”کیا؟“ ”تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا سیوک بن جا، اپنے خاندان کے ساتھ۔“ یہ کوئی مذہبی نہ تھے پھر بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”اچھا ہے کہ تو ہماری بات مان لے، ہم تجھے مال کر دیں گے۔“

اب ذرا کچھ کم ہو گیا تھا۔ لہذا سختی سے منع کر دیا۔ ”اچھا پھر اس مکان کو ہمارے حوالے کر دے۔ یہ ہمارے پرکھوں کی جاگیر ہے۔ ہم تجھے اس کی قیمت دے دیں گے۔“

اس پر یہ خاموش ہو گئے۔ صبح مجھے بتایا۔ ”بولو کیا کریں۔ سب محلے والے رشتے دار پاکستان جا رہے ہیں ویسے بھی ہم اکیلے رہ جائیں گے۔“ وہ یوں ہی کھوئے کھوئے اٹھے جا کر مورقی کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ”بھگوان جی! ہم مکان چھوڑنے پر تیار ہیں۔“

پھر میرے پاس دالان میں آ گئے اور اسی وقت گلی والے دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ باہر گئے ایک آدمی تھا اس نے رد مال میں بندھی رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”یہ مکان کی قیمت ہے مگر حقدار کا حق ضرور دینا۔“ یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

بچے گلی میں چلے گئے تھے۔ ہم میاں بیوی نے رقم گنتی۔ پورے دس ہزار تھے۔ مکان خوب بڑا ڈبل منزل بچتہ و مضبوط بنا ہوا تھا ہمارے ساس سسر کے زمانے کا۔ ان کے تین بھائی اور بھی تھے ایک بہن بھی تھی۔ ہماری مند لڑا کا تھی۔ خیر انہوں نے سب کو حصہ دیا۔ ایک قافلہ پاکستان جا رہا تھا۔ ہم بھی اس کے ساتھ آ گئے۔ اچھا میں چلوں کیا بیچ گیا گیارو۔“ دادی حضور نے کہا۔

”یہ بتائیں وہ پھر کبھی نظر آئے۔“ ”نہیں خدا کا شکر۔“ ساری رات ہم دادی پوتی خواب میں مجھ کو قص سرے دانی دیکھتے رہے۔

☆☆☆

”صبح انشاء اللہ اس لیے کہ ابھی رات ہے گھر جا کر آنا مشکل ہے۔ کل میں انہیں کپڑے میں لپیٹ کر لے آؤں گا۔ گھر آ گئے سب سو گئے۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ یہ حکیم ایسی چیخ مار کر اٹھا کہ ہم لوگ دہل گئے۔ ابا یہ سرے دانی میں سے مورتی نکلی۔ یہ میرا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اتنی بڑی ہو گئی تھی میں نے گھبرا کے پلٹ کر جو دیکھا بہن صاحبہ واقعی وہ مورتی اتنی بڑی کہ اس کا سر چھت سے لگ رہا تھا۔ میرا گلا گھونٹ رہی تھی۔ مارے خوف کے میرا پیشاب خطا ہو گیا اور یہ حکیم بے ہوش۔ کسی لحاظ کے بغیر میں ان سے لپٹ گئی۔ پھر شاید ہم سب بے ہوش تھے۔ آواز آئی خبردار ہمیں کسی کے حوالے نہ کرنا۔ دو جعلی پنڈت ہے۔ وہ ہمارا چاندی کا گھر اور ہمارا سونے کا وجود بیچ ڈالے گا۔“

صبح آنکھ کھلی۔ گھر کے ہر فرد کو سب یاد تھا ان کے باپ بڑے غمزدار تھے۔ ان کا بھی منہ اتر ا ہوا تھا۔ کیا کریں حالات اتنے خراب کہ کر فیولگا ہوا تھا۔ ورنہ کسی مولانا کے پاس جاتے۔ رات کو سب ڈر کے مارے دالان میں سوئے۔ کڑا کے کی سردی تھی۔ بستر چار پائیوں پر دونوں بھائی ایک میرے پاس ایک چار پائی پر۔ دعائیں دم کر کے سو رہے۔ رات کو ان کے باپ نے دیکھا کہ اس طرح سرے دانی رقص کر رہی ہے جیسے پہلے دیکھا۔ وہی آدمی سڑک کی طرف سے آیا جو پوچھا پاٹ کیا کرتا تھا۔ وہی ہے اس نے سرے دانی کو کھولا بھگوان برآمد ہوئے پھر اس نے ان کے آگے ہاتھ باندھے اور کچھ ان کو دیا یہ ایک لباس تھا جو انہوں نے پہنا۔ آج سیوک کے ہاتھ میں مسند نہیں تھی۔ ان کے ابا نے بتایا تھا کہ ڈر پوری زندگی میں اس طرح کبھی نہ لگا تھا۔

”پھر کیا ہوا۔“ اب تو دادی حضور اپنا پان تبا کو تک بھول چکی تھیں۔

”سیوک ہاتھ باندھے ساتھ تھا۔“ وہ لوگ دالان میں آ گئے۔ سیوک نے ان کے ابا کے پلنگ کے پاس کرسی لا کر رکھی اور مورقی اس پر بیٹھ گئی۔ اب یہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔



خونی خزانہ



ملک این اے کاوش

اکہنہ اسرا خزانے کی دور داستان حشر جزا وہ حاصل کرنے والے تینوں دوستوں کو کھانا گیا

فائدہ نہ اٹھایا تو ممکن ہے کوئی اور ہی مستفید ہو جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔

عثمان نے مجبوراً حامی تو بھری لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔ اس کے من میں خوف کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں لیکن دوستوں کے سامنے انکار کر کے وہ خود کو بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے مسمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا۔

☆.....☆.....☆

تین گھنٹے مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک چکے تھے۔ گاڑی سے اترتے ساتھ ہی انہوں نے پہلے ایک ہوٹل سے جا کر ڈسٹر کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ویٹر سے چوک محل کا راستہ پوچھا تو اس نے حیرت سے انہیں گھورا۔ ”وہاں کیا کرنے جا رہے ہو تم لوگ؟“ ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا راستہ بتا سکتے ہو؟“ حیدر نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ ویٹر بولا۔ ”لیکن مشورہ دوں

گا یہیں سے واپس لوٹ جاؤ۔ جو بھی اس طرف

تینوں دوست نقشہ سامنے میز پر رکھے سر جوڑے مضطرب براجمان تھے۔ علی اور حیدر بضد تھے کہ نقشہ کی تلاش میں لٹکنا چاہیے جبکہ عثمان متواتر انہیں سمجھا رہا تھا کہ نقشے تک پہنچنے سے قبل ہی اجل ایک لے جائے گی لیکن دونوں دوستوں کی صدا اپنی جگہ برقرار تھی۔

”میں نے خود پتہ لگوا دیا ہے۔ یہ خزانہ جس غار کے اندر ہے اس سے پہلے ایک گھنٹے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے۔“ عثمان نے انہیں بتایا۔ ”اس جنگل کی طرف جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا۔“

”لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔“ حیدر بولا۔ ”ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں۔ اس دنیا میں سب سے طاقتور انسان ہے۔ چاہے تو ہر چیز کو اپنا بندی بنالے۔“

”وہ لوگ اور ہیں۔“ عثمان بے چارگی سے بولا۔ ”ہم لوگ اپنی قسمت نہیں بدل پارہے ہر چیز کو اپنا بندی کیسے بنائیں گے؟“

”قسمت بدلنے کا وقت اب آچکا ہے میرے بھائی۔“ علی نے لقمہ دیا۔ ”اگر اس موقع سے ہم نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جواباً عثمان نے چپ سادھ لی۔ جلد ہی وہ ایک گھنے جنگل کے سامنے پہنچ گئے۔ جنگل دور سے ہی بڑا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر تینوں کے جسموں میں سرایت کر گئی۔ لیکن تینوں نے اپنی کنڈیشن ایک دوسرے پر واضح نہ ہونے دی۔ جنگل کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حالانکہ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں جنگل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہیں۔ تینوں کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

”ہماری منزل ہم سے کچھ فاصلے پر ہے۔“ عثمان گویا ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔ ”یہاں کھڑے ہو کر سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ دونوں دوستوں نے اس کی بات کی تصحیح کی اور تینوں جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔ دیو قامت اور گھنے درختوں نے جنگل کے اندر گھپ اندھیرا پیدا کیا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بچھائی نہ

مگیا کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔“ ”کیا راستہ بنا سکتے ہو؟“ حیدر نے دوبارہ اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا تو دیٹر نے انہیں راستہ سمجھا دیا۔

بل ادا کر کے تینوں دوست ہوٹل سے باہر نکلے۔ علی اور حیدر جانتے تھے کہ عثمان بہت کچھ ان سے کہنا چاہتا ہے لیکن بادل جو دوستی کے وہ چپ ہے۔ ”زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی اگر ہم لوگ کامیاب لوٹے تو؟“ حیدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اگر لوٹے تو؟“ عثمان بالآخر بول پڑا اور اس کی بات سن کر دونوں نے اسے کھا جانے والے انداز سے گھورا۔

”یار کیا منہ لڑکایا ہوا ہے؟“ علی پیچ دتا بکھا کر بولا۔ ”اس سے تو بہتر ہے تم نہ ہی ہمارا ساتھ دو۔ بجائے ہماری ڈھارس بندھانے کے ہمیں الٹا ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔“



Downloaded From
PakSociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑا تھا۔ تھوڑی دیر تک تینوں دوست کھڑے رہے لیکن جلد ہی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو تینوں آگے بڑھے۔

ابھی انہوں نے بمشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ یکدم انہیں یوں لگا جیسے ان کے پیچھے کوئی چیز گری ہو۔ تینوں نے سرعت سے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر تینوں کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ ان کے سامنے ایک عجیب و غریب شکل کا جانور کھڑا نہیں گھور رہا تھا۔ اس جانور کا منہ کتے کی مانند تھا لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی وہ بھی اس کے ماتھے کے اوپر۔ اس کی آنکھ عام جانوروں کی آنکھ سے دو گنا بڑی تھی۔

اس کی زبان کتے کی مانند منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس سے رال ٹپک رہی تھی۔ وہ جانور کھا جانے والی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ تینوں دوستوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔ بدحواسی کے عالم میں تینوں نے پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا۔ علی اور حیدر کو پہلی بار اپنی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔ عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن انہوں نے ضد کر کے اپنی جان مصیبت میں ڈال دی تھی۔

”بھاگو۔“ یکدم عثمان چلایا۔ جس کا منہ جس طرف لگا اس نے سر پٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

اس عفریت نے کھا جانے والی آنکھوں سے تینوں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے علی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ علی اس بات سے انجان دوڑے جا رہا تھا کہ یکدم اسے رکنا پڑ گیا۔ کیونکہ جس طرف وہ دوڑ رہا تھا۔ سامنے ہی وہ عفریت تھی۔ علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ عفریت نے لپک کر علی کو پکڑا اور ہوا میں اچھالا ایک سماعت شکن چیخ علی کے حلق سے برآمد ہوئی اور جنگل کے سکوت زدہ ماحول کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ علی جیسے

ہی ہوا میں فلا بازیاں کھاتا ہوا نیچے آیا۔ اس عفریت نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا لٹکالیا دوسرے ہی لمحے اس عفریت نے علی کے دونوں پیروں کو پکڑ کر اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ علی کے حلق سے آخری سماعت شکن درو میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔ اس عفریت نے اس کے جسم کے دونوں حصوں کو دائیں بائیں اچھال دیا اور ایک بار پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف عثمان مسلسل دوڑ رہا تھا کہ یکدم کسی سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا۔ گرتے ہوئے مدھم مدھم چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ گرتے ساتھ ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے سانس میں کچھ سانس آئی۔ اس سے ٹکرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ حیدر تھا۔ قبل اس کے کہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے علی کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

”بھاگو۔“ عثمان نے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

”علی۔“ حیدر نے بھاگتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

”اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک گئیں کھیت۔“ عثمان دوڑتے ہوئے بولا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے آگے پیچھے سرعت سے دوڑ رہے تھے۔ کافی دیر دوڑنے کے بعد جب عثمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے حواس باختہ رہ گئے کیونکہ حیدر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر گئیں۔ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نیچے جا گرے۔ ایک بار پھر اس نے رہی سہی ہمت یکجا کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ جلد ہی اسے روشنی دکھائی دینے لگ گئی۔ حتیٰ کہ اس خونی جنگل سے وہ باہر نکل آیا اور ایک چٹان پر بیٹھ کر تیز تیز سانس لینے لگا۔

اس کا سانس پھول چکا تھا۔ کافی دیر چٹان پر بیٹھ کر اس نے سانس بحال کیا اور جب کچھ سانس لینے میں بہتری آئی تو اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن

اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت ہویدار رہ گئی۔ وہ اس غار کے وہانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ جس کے اندر نقشے کے مطابق خزانہ تھا۔ جہاں اسے دوستوں کے چھپنے جانے کا ملال تھا۔ وہیں اسے خزانہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔

عثمان سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کی اور بڑھا۔ غار کے اندر سورج کی کرنیں جانے کی وجہ سے کافی اجالا تھا۔ عثمان آگے بڑھ رہا تھا۔ بھی اس کی نظر ایک طرف بڑے بڑے لکڑی کے صندوقوں پر پڑی۔ عثمان خوشی سے پھولے نہ سہا رہا تھا۔ بھی عثمان کی نگاہ ایک صندوق پر براجمان ایک ناگ پر پڑی۔ جس نے اپنا پھن پھیلا یا ہوا تھا۔ عثمان کو اپنے جسم میں ووڑتا ہوا منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانا نہ تھا جب اس نے سانپ کو باہر کی طرف نکلتے ہوئے دیکھا۔ جب ناگ غار سے باہر نکل گیا تو عثمان جلدی سے ان صندوقوں کی طرف بڑھا جیسے جیسے وہ صندوقوں کے ڈھکنے اتار کے دیکھ رہا تھا ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ سارے صندوق لبالب ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ عثمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے صندوق لے کر چلتا ہے۔

اس نے ایک صندوق کا آخر انتخاب کیا۔ اس کے اندر ہیرے جواہرات کا انبار لگا ہوا تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ اتنا خزانہ تھا کہ اس کی درجنوں نسلیں پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لا دیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ خوابوں کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سینے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

عثمان نے ایک ٹھنڈا مگر لمبا سانس خارج کیا اور سر پر لاوا ہوا صندوق بڑی مشکل سے اتار کر زمین

شہاب ثاقب زمین پر کیوں گرتے ہیں؟

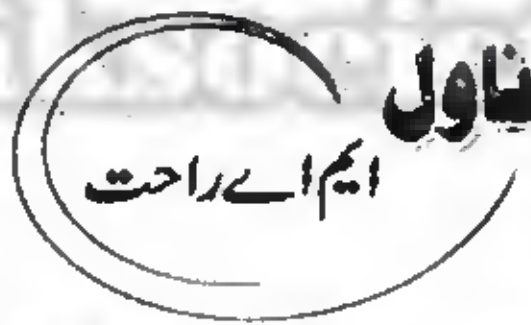
رات کے وقت آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اچانک آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور روشنی کی ایک سفید لکیر بناتا ہوا زمین کے نزدیک آ کر فطروں سے اوجھل ہو گیا۔ درحقیقت یہ آسمان سے ٹوٹا ہوا کوئی ستارہ نہیں ہوتا بلکہ شہاب ثاقب ہوتا ہے۔ ستارے بہت عظیم اجسام ہوتے ہیں۔ ان کا اس طرح ٹوٹے رہنا ممکن نہیں۔ پھر ستاروں کا زمین سے فاصلہ بھی کروڑوں اربوں کلومیٹر ہوتا ہے۔ چونکہ کائنات میں گھست وریخت کا عمل بھی جاری ہے۔ اس لیے جب زمین اپنی کشش ثقل کے تحت خلاء میں آوارہ گھومتے ہوئے اجسام کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے تو وہ آوارہ اجسام زمین کے کرۂ ہوائی میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی رفتار بھی انتہائی بڑھ جاتی ہے۔ یہ چند سیکنڈ میں کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔ جب یہ زمین کی حدود سے دور ہوتے ہیں تو بجھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا درجہ حرارت بھی کم ہوتا ہے لیکن کرۂ ہوائی میں داخل ہونے کے چند لمحوں ہی میں یہ ہوا اور فضائی ذرات کی رگڑ سے جل جاتے ہیں اور زمین تک پہنچنے پہنچنے پر اکھ بن جاتے ہیں۔

حسن انتخاب: رقیہ یوسف۔ سیالکوٹ

پر رکھا۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے سامنے منظر ہی اتنا بھیاںک تھا کہ اسے اپنی بھیاںک موت مترشح دکھائی دے رہی تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھن پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ سانپ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

عثمان نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں اتھرو آ گئے۔

”کو میرے دوستوں مجھے بھی ساتھ لیتے جانا۔“ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عثمان بولا اور پھر وہ خود کو موت کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔



زرد لوتھری

قسط: 08

انعام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا
درمختصر کے نامور قلم کار انعام کے قلم سے ایک نیا سرگد لاؤا سلسلہ

”آؤ۔“ اس نے بڑی شرافت سے کہا۔ ابھی میں اس کی شرافت پر غور کر رہی تھی کہ اس نے بڑی
بسی چھلانگ لگائی۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں اس پر گولی چلا سکتی تھی لیکن پھر مجھے اسنیر تک کون



Downloaded From
Paksociety.com

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لے جاتا۔ مجھے وہ زندہ دیکھ کر تھا۔
 اس وقت میں واقعی بے بس ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کجنت وائٹک صاف نکل گیا تھا۔
 یہ مایوس لمحے میرے لیے بڑے افسوسناک تھے۔ فی الحال میں ٹیل ہو گئی تھی۔

”آؤ۔“ میں نے سرو لہجے میں کہا اور ڈاکٹر کی بیوی بچے کو لے کر خود ہی ساحل کی طرف چل پڑی۔
 سمندر میں مدوجز تھا۔ لہریں اچھل اچھل کر ساحل کی طرف آرہی تھیں۔ جان بچانے والے فوجی اب بالکل غائب ہو گئے تھے اور ایک طرح کا سناٹا چھا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اس پاس وہ چھوٹی کشتیاں بھی نہیں تھیں جو میں نے پہلے دیکھی تھیں۔ ہاں کچھ نوٹی کشتیوں کے ڈھانچے کچھ فاصلے پر انبار نظر آ رہے تھے۔

معا میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے ان میں کوئی ٹوٹی کشتی اس حد تک سالم نکل آئے کہ میں ان دونوں کو لے کر اس جزیرے سے دور نکل جاؤں۔ ڈاکٹر ہمیں جانے کا خیال تو اب ترک کرنا پڑا تھا۔ اس کے لیے نئے سرے سے کام کرنا ہوگا۔ ساری محنت اکارت چلی گئی تھی جس کا مجھے دلی افسوس تھا۔
 ٹوٹی کشتیوں کے ڈھیر کے پاس پہنچ کر میں رکی اور نظریں دوڑانے لگی کہ کوئی ایسی سالم کشتی نظر آجائے جو میرے کام آ سکے۔

اچانک ڈاکٹر ہیر کے لڑکے کے حلق سے ایک خوف بھری چیخ نکلی۔ اور میں اچھل پڑی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا اور سنائے میں رہ گئی۔ وہ وائٹک تھا جس نے ڈاکٹر کے لڑکے کو دبوچ لیا تھا اور اب ایک جی فائو پستول کی نال اس کی کپٹی سے لگا رکھی تھی۔ وہ کمینہ شاید ٹوٹی کشتیوں کے ڈھیر میں چھپا ہوا تھا۔

”چھوڑ دو اسے، چھوڑ دو۔ ڈاکٹر کی بیوی روتی ہوئی اس پر چھینی اور اس نے اپنے بیٹے کو اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی لیکن وائٹک نے وزنی پستول اس کے سر پر مارا اور وہ ایک دروناک چیخ کے ساتھ دور جاگری، میں بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔
 ”کیا خیال ہے میڈم، تمہاری ساری چالاکی ختم ہو گئی۔ اب کیا کہتی ہو۔“
 میرے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تو وہ دوبارہ بولا۔

”باتی اور جو کچھ بھی ہے۔ میں جن کاموں میں مصروف تھا لیکن جب بھی میری نگاہ تم پر پڑی۔ ایک حسرت ضرور میرے دل میں بیدار ہو گئی۔ تمہارے حصول کی حسرت۔ بعض چہرے اور بدن اس قدر حسین ہوتے ہیں کہ انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بے اختیار کروینے والوں میں سے ہو۔“

میرے ذہن نے فوراً قلابازی کھائی اور میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدل لیے۔ میں نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”چلو پھر ہم سودا کر لیں۔“
 ”کیسا سودا؟“

”ڈاکٹر کو میرے حوالے کر دیا پھر میرے لیے یہاں بندوبست کر دو۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس چھوڑ دو۔ میں پوری وفاداری سے کام کروں گی اور..... خود کو پوری طرح تمہارے حوالے کر دوں گی۔“
 اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ اٹھی۔ اس نے کہا۔ ”میں کیسے یقین کر لوں۔“
 ”جیسے چاہو۔“ میں نے ایک اداسے کہا۔
 ”اور اگر ڈاکٹر تمہیں ساتھ رکھنے پر راضی نہ ہوا؟“

”وہ ضرور ہو جائے گا۔“
”اتنے بھروسے سے کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔“
”وجہ؟“

”یہ تم اس سے پوچھتے لیکن تم نے مجھ سے سچ نہیں بولا۔“
”کس بارے میں۔“

”یہی کہ ڈاکٹر آس پاس کسی اسٹیر میں موجود ہے۔“
”نہیں، میں نے سچ بولا ہے۔ وہ مدھم روشنی دیکھ رہی ہو وہ اسٹیر ہے نا۔“
”ہاں۔“

”ڈاکٹر اس پر ہے۔“
”میں کیسے یقین کر لوں؟“

”میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر کے بیوی بچے کو بھی۔“ اور پھر وہ مسکراتے لگا اور میں نے اپنے بدن کی کچھ جنبشوں سے اس کی دیوانگی میں اور اضافہ کیا۔
”تو پھر سو واسطے؟“

”ہاں۔“

”او کے۔“ اس نے کہا اور پھر ٹوٹی کشتیوں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے آواز لگائی۔
”اونیو۔“ اور کوئی وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس نام کو سن کر میں چونکی تھی لیکن جب وہ سامنے آیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہی منحوس شکل خرگوش کی اولاد تھا جس کے دو دانت نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے تھے۔

میں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وانگ نے کہا۔ ”یہ میرا بہترین وفادار اونیو ہے۔ درحقیقت اس وقت اس نے پانسہ پلٹا ہے۔ ورنہ تم نے تو چالاک لومڑی میرا کام ہی تمام کر دیا تھا۔ اونیو نے مجھے سہارا دیا ہے۔ تھینک یو اونیو، کیا تمہیں وہ کشتی مل گئی؟“
”یس سر! میں اسی سے آیا ہوں۔ وہ جیٹی پر کھڑی ہے۔“

”ہماری قابل احترام دوست۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ایک آنکھ وادی۔
”اوہ سمجھ گیا۔“ اونیو بھی اوباشی سے مسکرا دیا۔

”یہ تمہارا کتا کہاں سے آگیا اس وقت؟“
”وفادار کتا ہے۔“ وانگ ہنس پڑا۔

”تم ڈاکٹر لیونسکی سے ملنا چاہتی ہو میڈم۔“ منحوس شکل اونیو چبکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر کہا۔ ”ہم تمہیں اس سے ملنے کے لیے لے جا رہے ہیں اور یہ ڈاکٹر کی بیوی اور بچے۔ یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔“
”اونیو تم؟“ وانگ نے کہا تو اونیو نے ہاتھ اٹھا دیا۔

”یہ ضروری ہے سر۔“

”او کے او کے۔ جو کرنا ہے جلدی کرو۔“

”چلیے سر۔“ اونیو بولا۔ پھر جلدی سے کہا۔ ”یہ ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیجیے سر۔“ اس نے میری

طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اوہ ہاں۔ ٹھیک یو او نیو۔“

میرا بس نہیں چلا تھا ورنہ ریوالور جو میں نے واگنگ کے ہولسنر سے نکالا تھا پورے کا پورا او نیو پر خالی کر دیتی۔ واگنگ اس قدر چالاک نہیں تھا جتنا یہ کہینہ او نیو تھا۔

”ٹھیک ہے او نیو، تیرے بدن میں درجن بھر خون اگلنے سوراخ نہ بنائے تو میرا نام بھی ایسی پارک نہیں۔ میں سمجھ گئی تھی کہ او نیو کی نیت ڈاکٹر کی بیوی پر خراب ہو گئی ہے جو بہر حال جوان ہی تھی۔ اسی لیے وہ اسے اسینر پر لے جانے کی جلدی کر رہا تھا لیکن یہ بڑی دردناک بات تھی جو میں زندگی کی قیمت سے بھی نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ یہ شخص۔“

میں نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا اور وہ اپنے خرگوش نما وائٹوں کو نکال کر مسکرا دیا جیسے میرے دل کی بات سمجھ گیا ہو۔

ریوالور واگنگ کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور اس نے اس سے اشارہ کر کے ہمیں آگے چلنے کے لیے کہا اور میں چل پڑی۔ ڈاکٹر ہیر کی بیوی اور بیٹا ساتھ تھے۔ میں اس وقت خطرناک ترین لمحات سے گزر رہی تھی۔ واگنگ جیسے گدھے سے مجھے اور تو کوئی خطرہ نہیں تھا بس میں سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر کو ان کے چنگل سے نکال کر میں کہاں لے جاؤں گی۔

جینی پر ایک چھوٹی مونریوٹ کھڑی تھی جس میں ہم تینوں کو اتارا گیا۔ واگنگ بھی میرے پاس آکھڑا ہوا اور او نیو نے بوٹ کا اسٹیرنگ سنبھا لیا۔ بوٹ اشارت ہو کر چل پڑی۔

”صرف یہی نہیں ڈاکٹر اگر تمہیں قبول نہیں کرتا تو میں تمہیں اپنے حکمے میں ایڈجسٹ کر لوں گا۔ عیش کرو گی۔“ واگنگ مجھے طرح طرح کے لالچ دے رہا تھا۔ میری نظریں اس بڑے کونسل پر جمی ہوئی تھیں جو سمندر میں لنگر انداز تھا۔ ایک چھوٹا انگریز کونسل، جو دور سے دیکھنے پر ہی خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر اس پر موجو تھا۔

تھوڑی دیر میں مونریوٹ کونسل کے پاس پہنچ گئی۔ او نیو بندر کی طرح پھرتیلا تھا۔ وہ چھلاٹک لگا کر لنگر کی زنجیر پر چڑھ گیا اور برق رفتاری سے اوپر پہنچ گیا اور پھر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ جوانی کی بات تھی کہ کونسل شب پر کوئی اور موجود نہیں تھا کیونکہ او نیو نے ہی میز می نیچے گرائی تھی۔“ واگنگ کے اشارے پر پہلے ڈاکٹر کی بیوی اوپر چڑھی اس نے اپنے آگے اپنے بیٹے کو رکھا تھا پھر میں اور آخر میں واگنگ اوپر آ گیا۔

واگنگ کی آنکھوں میں نفسانی خواہش کا خمار اتر ا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

”آؤ میں تمہیں اپنا خوب صورت کیمین دکھاؤں۔“

”دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”ارے کیوں۔“ واگنگ حیرت سے بولا۔

”ڈاکٹر کہاں ہے۔“ میں غرائی۔

”اوہ غصہ مت کرو، ٹھیک ہے ڈاکٹر کی بیوی اور بیٹے کو اس کے کیمین میں بھیج دیتے ہیں۔“ ابھی اس

نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ سامنے والے کیمین کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ہیر لیونسکی وہاں سے نمودار ہوا۔ وہ تو ایک لمبے اپنی بیوی اور بیٹے کو نہیں پہچانتا تھا لیکن اس کے بیٹے نے ایک چیخ ماری۔

”پاپا!“ اور اس چیخ نے میرا کام بنا دیا۔ یہ چیخ سن کر فطری طور پر واگنگ بھی اس طرف متوجہ ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں نے پوری مہارت سے اس پر چھلانگ لگائی اور اس کا خطرناک ریوالور پھر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ ڈاکٹر کا بیٹا بھاگ کر باپ سے لپٹ گیا لیکن واٹک کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کی طرف لپکا نتیجے میں مجھے گولی چلائی پڑی۔ اب یہ واٹک کی بد قسمتی تھی کہ گولی سیدھی اس کی پیشانی میں جا گھسی اور اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے لیکن مجھے اس سے زیادہ خطرہ اس منحوس چالاک اونیو سے تھا جو واٹک سے زیادہ خطرناک تھا۔ حالانکہ بے مقصد خونریزی مجھے پسند نہیں تھی لیکن ایک تو مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت تھی۔

دوسرے میں جانتی تھی کہ اگر وہ زندہ رہا تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ چنانچہ میں نے لگاتار دو قاتر اس پر جھونک دیئے۔ میری زندگی بھر کا ریکارڈ تھا کہ میرا نشانہ کبھی خالی نہیں گیا تھا۔ یہ دونوں قاتر میں نے اس کی پیشانی اور دل کا نشانہ لے کر کیے تھے۔ اس نے دوبارہ ہلکی سی جنبش کی تھی اور دونوں گولیوں نے جہاز کی دیواروں میں سوراخ کر دیئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اس جگہ جا کر کھڑا ہوا جہاں پیچھے کسی کے نشانہ بننے کا خطرہ نہیں تھا۔

دوسری طرف مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا نشانہ خالی گیا ہے۔ میں نے دوبارہ اس کا نشانہ لیا اور قاتر جھونک مارا۔ پھر ر کے بغیر گولیاں چلاتی رہی۔ لیکن ایک بھی گولی نشانے پر نہیں لگی۔ وہ سینترے بدل بدل کر میرا ہر قاتر خالی کر رہا تھا۔

یہ جادوگری تھی جو کبھی دیکھی نہیں۔ حالانکہ صرف بارہ فٹ کے فاصلے سے صحیح نشانے لے کر گولیاں چلاتی جا رہی تھیں لیکن اس کے بدن کی پھرتی سے کام لے کر سارے نشانے خالی ہونے لگے۔ ریوالور سے نکلی گولی پر نگاہ جمانا، اس کے راستے کا تعین کرنا اور نشانے کی جگہ کو خالی کر دینا انسانی عمل نہیں تھا جب کہ ریوالور سے سینکڑوں کے حساب سے قاتر ہوتے ہیں۔ مجھے خیال نہ رہا کہ میں نے کتنے قاتر کیے یہاں تک کہ ریوالور خالی ہو گیا۔

مجھے یقین آ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے میرے سامنے کوئی انسان نہیں بدروح ہے۔ یہ کام کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کے دیکھا۔ وہ مجھے بھول کر پہلے واٹک پھر ڈاکٹر بیکر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں ڈاکٹر۔“

”ہاں یہ..... یہ مر گیا۔“ ڈاکٹر بیکر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں اسے مرنا ہی چاہیے تھا۔ آپ میرے ساتھ انجن روم تک آنا پسند کریں گے۔“

”ضرور۔“ بیکر لیونسکی نے کہا۔ پھر بولا۔ ”ادھر سے کوئی نہیں آیا؟“

”میں نے منع کر دیا ہے۔ آئیے اور میڈم آپ ان دونوں کے ساتھ رہیں۔ یہ دوسرا پستول رکھ لیں۔“

اس نے ایک اور خطرناک پستول اپنے لباس سے نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ جسے میں نے کچھ کر لیا۔ وہ لا پرواہی سے ایک طرف مڑ گیا۔ لیونسکی نے کہا۔

”تم ایسی کے ساتھ رہو۔ ہم ابھی دوبارہ تم سے ملیں گے۔“ اور پھر وہ بھی اونیو کے ساتھ آ گئے

بڑھ گیا۔

میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اونیو اور ڈاکٹر بیکر کے درمیان کافی اندراستینڈم معلوم ہو رہی تھی۔ جب کہ اونیو مقامی آدمی تھا اور بہت سے موقعوں پر وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرتا نظر آیا تھا۔

اس وقت وہ بھرپور طریقے سے واٹک کا ساتھی تھا اور اب.....

لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس عمل کے سامنے جب وہ میرے فائرنگ کام بنا رہا تھا۔ میں نے پورے ہوش و حواس اور پوری مہارت سے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ پورا پستول اس پر خالی کر دیا تھا لیکن ایک بھی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر میرے نشانے خالی کر رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر دوسری بات ڈاکٹر کے مشکوک جملے۔ ”ادھر سے کوئی نہیں آیا؟“ یہ جملہ ناقابل فہم تھا۔ ”کدھر سے؟“

تھوڑی دیر کے بعد اس چھوٹے سے کونسل میں جنبش ہوئی۔ انجن روم سے مشینی عمل کر کے جہاز کے نگر اٹھائے جا رہے تھے اور وہ جنبش کر رہا تھا۔

میں تو ایک طرح سے مختل ہو گئی تھی۔ اس وقت حقیقی معنوں میں ساری کمان اونیو کے ہاتھ میں تھی۔ اونیو، ایک ماورائی انسان، اف میرے خدا، میں تو خود کو دنیا کا سب سے بڑا اور ماہر نشانہ باز سمجھتی تھی لیکن میں نے اس پر تاک تاک کر نشانے لگائے تھے اور اس نے رقص کر کے ہر نشانہ ناکام بنا دیا تھا۔

کونسل اب باقاعدگی سے آگے بڑھ رہا تھا اور میں نہیں جانتی تھی وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں پریسلا اور اس کے بیٹے کے ساتھ تھی اور بڑی شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ اگر پریسلا مجھ سے اور سوالات کر بیٹھے اس بارے میں تو میں کیا جواب دوں گی۔ لیکن شکر ہے اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

چھوٹے کونسل کا سفر کوئی پینتالیس منٹ جاری رہا۔ پھر اس کی رفتار سست پڑ گئی اور آخر میں وہ رک گیا۔ اس کے انجن بند ہو گئے۔ خاموشی چھا گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد باہر سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے پاس آنے والے کئی افراد تھے۔ جن میں دو لائی چن کے باشندے صاف نظر آتے تھے۔ دو شائیکن تھے ایک اونیو تھا اور دوسرا ڈاکٹر ہیمر۔ جواب پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

دونوں شائیکن بڑے تپاک سے ڈاکٹر ہیمر سے ملے اور انہوں نے اپنا تعارف شائیکا کے محکمہ خاص کے افسران کی حیثیت سے کرایا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

”حکومت شائیکا کی طرف سے ہم آپ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں مس اینی پارک کہ آپ نے ہمارے ایک قیمتی سرمائے کو ہمیں واپس کیا۔ درحقیقت آپ نے کوئی معمولی کام نہیں کیا۔ دنیا بھر میں ایسی بے شمار تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو سازشی عناصر کے سرمائے پر انحصار کر کے ساری دنیا کے امن کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم نے شائیکا سے ڈاکٹر ہیمر کو اغواء کر کے یہ تاثر دیا کہ انہیں لائی چن نے اغوا کیا ہے جب کہ حکومت لائی چن اس سے بالکل بے خبر تھی۔ الغرض شائیکا نے زرو لومڑی طلب کی اور زرو لومڑی نے ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کر دیا۔ افسر نے متحیر لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر ہیمر حیرانی سے یہ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”کیا کہا آپ نے مسٹر دان ہوپ“ زرو لومڑی۔“

”ہاں دنیا کے لیے ایک عظیم سرمایہ، دنیا کا سب سے حیرت انگیز ادارہ جس کا سربراہ کارل ڈی سا ترے ہے جس نے دنیا کے امن کو خطرے سے بچانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ہیمر نے کہا۔

”ابھی ہم لوگ ایک بڑی اسفیر سے چلیں گے کھلے سمندر میں شائیکا کا بحری بیڑہ کھڑا ہوا ہے جس کا

ایک شب ہمیں نے کرشائیکا چل پڑنے کا۔ راستے میں آپ کو مکمل تفصیل بتا دی جائے گی۔“
 ”لیکن کچھ باتوں کی وضاحت تو کرویں۔“ ڈاکٹر نے کیا۔

”ہاں ضرور۔“

”ابھی آپ نے کچھ نام لیے۔“

”جی کون سے؟“

”اپنی پارک، زرد لومڑی۔“ اور اشارہ میری سیکرٹری ایلیسی کی طرف کیا۔

”اوہ جی۔ یہ مس ایلیسی نہیں ہیں۔“

”ایس..... پھر.....!“ ڈاکٹر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

”مس اپنی پارک، مسز کارمیل سترے کی کارکن۔“ افسر نے کہا۔ اسی وقت ایک اور شخص نے آکر

اطلاع دی کہ سارا کام مکمل ہے۔“

یہ میٹنگ ختم ہو گئی۔ ہمیں اسٹینر پر منتقل کر دیا گیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی دوسروں کے لیے میری شخصیت حیران کن تھی لیکن میرے لیے یہ بدروح، جس کے دو دانت اس کی شخصیت کو مکروہ بنائے ہوئے تھے ورنہ وہ.....

بڑا اسٹینر ہمیں لے کر چل پڑا۔ اونیوان افسروں کے ساتھ تھا جب کہ ڈاکٹر ہمیں، اس کی بیوی اور بچہ اسٹینر میں میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر نے اسٹینر کے سفر کے دوران بھی پوچھا تھا۔

”تم واقعی ایلیسی نہیں ہو۔“

”نہیں ڈاکٹر۔“

”جو تمہارے چہرے پر اس کا میک اپ پایا تم قدرتی طور پر اس کی ہم شکل ہو۔“

”میک اپ ہے سر۔“

”اوہ کمال ہے۔ اس رات بھی تم ہی مجھ سے ملی تھیں جب میں ان کا قیدی تھا۔“

”جی ڈاکٹر۔“ میں نے کہا اور ڈاکٹر گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

اسٹینر کا سفر کھلے سمندر میں کھڑے بہت بڑے شب پر ہوا تھا جو ایک بیڑے میں شامل تھا لیکن یہی جہاز ہمیں شائیکا لے جانے والا تھا۔ ہمیں کیبنوں میں منتقل کروایا گیا اور جہاز نے لنگر اٹھا دیئے۔ اونیوان اس کے بعد میرے پاس نہیں آیا تھا۔

آخر دوران سفر میں نے اسی افسر اعلیٰ سے پوچھ لیا۔

”اونیوانی جہاز سے سفر کر رہا ہے؟“

”نہیں میڈم! اونیوان تو وہیں رک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آپ کے حکم کے مطابق وہیں کچھ کام کرے گا۔“

تاکہ آپ اس مہم کی رپورٹ تیار کر سکیں۔“

”کیا؟“ میری حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ ”تو کیا؟“

”جی بتائیے۔“

”وہ حکومت شائیکا کا ایجنٹ نہیں تھا۔“

”بالکل نہیں۔“

”اوہ تو لائی جن حکومت نے.....“

”نہیں میڈم! آپ شاید مذاق کر رہی ہیں۔“

”کیوں؟“

”اس کا کہنا تھا کہ وہ آپ کا اسٹنٹ ہے۔“ افسر نے کہا اور میرے بدن میں سناٹا دوڑ گیا۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن میرا ذہن بری طرح الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ افسر نے کہا۔ ”اور ہاں۔ وہ ایک پکٹ آپ کے لیے دے گئے تھے۔“

”پکٹ!“

”جی، میں ابھی بھجواتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خوب صورت پکٹ میرے پاس پہنچا دیا گیا اور پھر میں نے بے چینی سے اسے کھول کر دیکھا۔ پھر میں اسے دیکھتی رہی مگر اس نامعلوم میٹرل کی میک اپ ماسک تھی جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ایک نام گونجا۔ ”الہ دین۔“ وہ ایشیائی چھلادہ جس نے میری زندگی بھر کی محنت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ میں جو خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتی تھی۔ میں جو خود کو دنیا کی سب سے ذہین، سب سے چالاک ایجنٹ سمجھتی تھی لیکن اس شخص نے مجھے مچا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنے ہر مشن میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے ایسے ایسے خطرناک مواقع پر میری مدد کی تھی جب میں بے بسی کا شکار ہو گئی تھی۔

اس مہم میں بھی یہی ہوا تھا۔ جونہی میں نے ہانگ کانگ میں قدم رکھا تھا وہ ایک کردہ شکل میں میرے سامنے آیا تھا۔ اومائی گاڈ ایوں لگتا تھا جیسے وہ میرا سایہ ہے۔ میرا ہمزاد ہو۔ اب بھی اگر غور کرتی تو میری اس کامیابی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور پھر اس کا گولیوں سے بچنے کا فن۔ الہ دین..... الہ دین۔ کس قدر ستم ظریف ہے کمینہ۔ میں نے اس کے اس منحوس میک اپ سے کس قدر نفرت کی تھی اور اس کے یہ دو خرگوش جیسے دانت مجھے زہر لگتے تھے لیکن یہ سب کچھ نقلی تھا۔ اس کا اصل چہرہ کچھ اور تھا۔ نہ جانے کیسا ہوگا۔

غرض یہ کہ ادنیٰ، الہ دین یا وہ جو کوئی بھی ہے برسوں کی گہرائیوں کا سفر کر رہا تھا۔ وہ میرے دل میں ایک خواہش بن چکا تھا۔ کاش میں اس کا اصل چہرہ دیکھ سکوں۔ کیسا ہوگا۔ اس کا جسم بے حد خوب صورت درزشی اور سڈول تھا۔ میری پسند کے عین مطابق۔

شاریکا تک کے سفر کے دوران وہ میرے خیالوں میں بسا رہا۔ میرا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ الہ دین ہی تھا اور الہ دین بھی بس ایک سامنے آ جانے والا نام تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ اصل نام کیا ہے لیکن کمال کی شخصیت تھی۔ اومائی گاڈ۔ اتنا پھریتلا تو کوئی جانور بھی نہیں ہوتا۔

☆.....☆

شاریکا کے دارالحکومت میں ہمارا بہترین استقبال کیا گیا تھا۔ ایک شاندار فوجی میننگ میں جس میں اہم ترین سویلین حکام بھی شامل ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ہیر کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا اور مجھے بڑا اعزاز دیا گیا تھا۔

میں اس میننگ میں اپنی اصلی شکل میں شریک ہوئی تھی اور مجھے وہ کردار بھی ملے تھے جو کورڈیل کیس میں مجھ سے متعلق رہے تھے۔

”یوں لگتا ہے جیسے مسز سارترے نے ایک ردیو لڑکی بنائی ہو جو دنیا بھر کے کام کر سکتی ہے۔“

ایک اعلیٰ شخصیت نے کہا۔

”مسز سارترے کو اس کی سخت حفاظت کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نہ جانے کس کس کے لیے خطرہ ہے اور

کون اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔

”وہ اپنا تحفظ کرنا جانتی ہے۔“

میرے بارے میں طرح طرح کے کمٹس ہوتے رہے۔ اس میٹنگ میں میری بات پا پا سے کروائی گئی۔

”ہیلو پا پا۔“ میں نے کہا۔

”اس بار پورے کیس کے درمیان تم سے بات نہیں ہوئی۔“

”ضرورت ہی نہیں پیش آئی پا پا۔“

”او کے! واپس آؤ۔ میں تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔“

میری واپسی کے انتظامات ہو گئے۔ خاص طور سے ڈاکٹر ہیر نے کہا۔ ”پیاری بچی، مجھے نئی زندگی دینے والی تم ہو۔ کبھی میری ضرورت پیش آئے تو مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔“

☆.....☆

بہت سی سٹائش اور رول میں خلش لے کر میں اپنے وطن واپس پہنچ گئی۔ جہاں پا پا میرے منتظر تھے۔ میرے پا پا، میرے سب کچھ۔ انکل وانجی بھی میرے لیے باپ سے کم نہیں تھے۔ میں دونوں کی محبت سے سرشار تھی۔ مجھے آرام کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے چوبیس گھنٹے آرام کی ہدایت کی گئی اور میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ پھر مجھے ریکارڈ ہال میں طلب کر لیا گیا جہاں اس کیس میں میری یادداشتوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔

اور میں نے شروع سے لے کر آخر تک تفصیل بتادی۔ میں نے خصوصی طور پر او نیو کی انٹری کی تفصیل بتائی اور پھر اس کی دی ہوئی سوغات نکال کر سامنے رکھ دی۔

”یہ کیا ہے؟ ارے؟ تو میک اپ ماسک ہے اوہ بالکل پہلے جیسا جس کا کوئی کیمیاوی تجزیہ نہیں ہو سکا کہ اس کی تیاری میں کیا میٹریل استعمال کیا گیا ہے مگر ترموداوانجی نے اس بارے میں کچھ ذاتی معلومات کا اظہار کیا ہے۔“

”کیا انکل؟“

”میں نے کافی کاوش کی ہے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس ماسک کی تیاری میں کیا کیمیکل استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ معمولی سی کوشش سے اس کے خدو خال تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔“

”اوہ انکل! مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”کسی طرح اس شخص کے بارے میں کچھ اور معلوم ہو سکے۔“ وانجی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”اب میں ایک ایسی بات بتانا چاہتی ہوں جو آپ کو حیران کر دے گی۔“

”اوہو۔ اور بھی کوئی حیران کن بات ہے؟“

”جی انکل۔“ اور پھر میں نے انہیں ان لمحوں کی کہانی سنائی جب صرف بارہ فٹ کے فاصلے سے ہونے والی گولیوں کی برسات کو ایک پھر تیلے شخص نے پٹاخوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ پا پا نے بھی بڑی حیرانی سے اس بارے میں سنا تھا لیکن نہ جانے کیوں انکل ترموداوانجی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔

”کمال ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔“ پا پا نے حیرانی سے کہا۔ لیکن انکل نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ البتہ دوسرے دن ناشتے کی میز پر انہوں نے کہا۔

”ہاں ممکن ہے۔“

”اے!“ ہم دونوں چونک کر انگل کو دیکھنے لگے۔
 ”تم نے گولیوں سے نیچے کے آرٹ کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟“
 ”ہاں تو پھر؟“

”اسی کا جواب دے رہا ہوں۔“
 ”کیا؟“

”تم نے سرکس میں کام کرنے والے جمناسٹروں کی جاو و گری نہیں دیکھی۔“
 ”بہت سے سرکس دیکھے ہیں لیکن یہ فن کبھی نہیں دیکھا۔ نشانہ بازوں کے کمالات تو دیکھے ہیں لیکن نشانہ بازی سے نیچے کا یہ فن کبھی نہیں دیکھا۔“

”بے بی کیا وہ شخص کافی دراز قامت ہے۔ میرا مطلب ہے ضرورت سے زیادہ لمبا اور دبلا پتلا؟“
 ”نہیں انگل۔ وہ خوب صورت ورزشی بدن کا مالک ہے۔“

”کیا اس کے لمبے میں کوئی تبدیلی ہے؟“
 ”وہ اردو بھی بولتا ہے سو فیصدی ایشیائیوں کے انداز میں۔“
 ”تب وہ عمران ہے۔“

”کون عمران؟“
 ”ایک ایشیائی ملک کا باشندہ، انتہائی حیرت انگیز شخصیت کا مالک۔ میں نے رات بھر اس کی تلاش میں محنت کی ہے۔“

”انگل تفصیل بتائیے پلیز۔“ میرے سارے چہرے کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکر میں مارنے لگا۔ اس کے بارے میں انکشاف میرے لیے اتنا ہی پرکشش تھا۔
 ”وہ ایشیائی حیرت انگیز صفات کا مالک ہے۔ فی الحال اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ میں صرف عمران کے بارے میں بتاتا ہوں۔“
 ”جی انگل۔“

”محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر جنرل علی رحمن کا بیٹا ہے۔ آکسفورڈ سے ڈائریکٹر بیٹ کی ہے پھر اپنے ملک واپس آ گیا۔ اس کے بارے میں خفیہ رپورٹ ہے کہ اس نے براہ راست محکمہ داخلہ کی وساطت سے ہوم سیکرٹ سرڈس کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ حاصل کیا ہے اور ایک دوسری حیثیت سے اسے سنبھالے ہوئے ہے۔“

”دوسری حیثیت؟“

”ہاں، سیکرٹ سرڈس کے چیف کی حیثیت سے۔ جس کا اسپیشل کوڈ ”ایکس نو“ ہے۔ دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں اسے ایکس نو کے نام سے جانتی ہیں لیکن کہیں بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکا کہ عمران ہی ایکس نو ہے۔“

”ارے کیوں؟“

”اس نے ایسا ہی جال پھیلا رکھا ہے۔ اس کی خصوصی نشانی یہ ہے کہ وہ خود کو کبھی ذہین اور اس عہدے کا حامل نہیں ظاہر کرتا۔ اس کی فطرت میں خود نمائی نہیں ہے۔ اس کے شناسا یا اس سے شناسائی کے خواہش مند آخر میں یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ تو کسی دفتر میں معمولی کلر کی کے قابل بھی نہیں ہے۔“

”لیکن کیوں انگل؟“ میرے دل و دماغ میں عمران اتر رہا تھا۔ عمران، الہ دین اور نہ جانے کیا کیا۔

”یہ ایک اہم نکتہ ہے بے بی۔“ ترموداواچی نے کہا۔
”کیا اٹکل؟“

”عام طور سے انسان جو نہیں بھی ہوتا وہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو بڑا کہلوانے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہوتی ہے اور تم یہ کہہ سکتی ہو کہ شاید ہر شخص میں ہوتی ہے۔ یعنی اگر تم نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے تو تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ دنیا اسے جانے۔ اس کو جاننے ہوئے تمہارا احترام کرے۔ تمہیں برتری دے لیکن اگر کہیں تم اپنی اس فطرت کو چھپاؤ دو اپنے آپ کو اپنے منصب سے کم ظاہر کرنے کی کوشش کرو تو سائنسی اصطلاح میں اور سائیکالوجی میں اسے Ency کہا جاتا ہے اور اس طرح کے لوگ دنیا کے خطرناک ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی تعداد اٹھائیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ان کی زندگی میں کبھی ان کی یہ صفت ظاہر نہیں ہو سکی بس ان کی موت کے بعد ان کی زندگی کا تجزیہ کیا گیا تب وہ ظاہر ہوئے۔“

”اومائی گاڈ۔ لیکن عمران.....!“

”ہاں تو اس کے بارے میں کئی بار یہ شبہ کیا گیا کہ وہ سیکرٹ سروس کا پراسرار چیف ایکس ٹو ہے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا۔“
”کیوں اٹکل؟“

”بس وہ جینس ہے، خود کو چھپانا جانتا ہے۔“

”کمال ہے۔ لیکن ایک بات بتائیں۔“

”ہوں۔“

”کل جب میں اسی کے گولیوں سے بچنے والے فن کا تذکرہ کر رہی تھی تو آپ نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ کیا وہ زیادہ دراز قامت اور دبے پتلے بدن کا مالک ہے۔ کیا وہ صحیح انداز میں اردو نہیں بولتا۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں میں اسی طرف آ رہا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے یا لمبے فاصلے سے چلائی گئی گولیوں سے بچنے کا فن ”سنگ میں“ سے منسوب ہے۔“
”سنگ میں کون؟“

”چین کے قصبے وانگ ہو کے ایک کسان کا بیٹا۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی تھا۔ چینی عام طور پر پست قامت ہوتے ہیں لیکن سنگ میں کافی دراز قامت تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ دوغلا چینی تھا یعنی اس کی ماں منگول تھی اور باپ چینی۔ سنگ میں، بچپن ہی سے سرکش اور کسی حد تک مجرمانہ فطرت کا مالک تھا۔ وہ باپ کے ساتھ نہ رہ سکا اور بھٹکنے لگا۔ پھر وہ ایک سرکس میں نمودار ہوا جس میں وہ ایک ناقابل یقین فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ دس دس افراد چھریوں سے اس پر نشانہ لگاتے تھے اور وہ ان سے بیک وقت بھٹکی جانے والی چھریوں سے بچتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ چھریاں پستول سے چلائی گئی گولیوں میں بدل گئیں اور اس کے اس فن کو ”سنگ آرٹ“ کا نام دیا گیا۔“

پھر بہت سے جانبازوں نے اس فن کی مشق کرنے کی کوشش کی اور آرام سے جاں بحق ہو گئے۔ ادھر کچھ بین الاقوامی گروہ، سنگ کے شیدائی ہو گئے یوں سنگ میں ایک خوفناک مجرم بن گیا۔ اس کی ٹکر کا ایک بھی دوسرا شخص سامنے نہ آ سکا لیکن پھر ایک بار عمران ٹائی ایک نوجوان نے اسے گولیوں کا نشانہ بنایا اور سنگ نے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کیا۔ نوجوان نے سنگ کو بھڑکایا اور کہا کہ یہ صرف اتفاق ہے کہ سنگ گولیوں

سے بچ گیا۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ خود کو سزا ہے جانے کی خواہش ہر دل میں ہوتی ہے۔ سنگ بھی اس کا شکار ہو گیا اور اس نے نو جوان سے کہا کہ وہ اس پر دوبارہ قائر کرے۔ نو جوان اسے چڑھا تا رہا اور سنگ نے کئی بار اپنے اس فن کا مظاہرہ کیا۔ جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوا؟“ تر موواہ انچی نے کہا۔

”نو جوان نے لا پرواہی سے کہا کہ یہ تو معمولی سا کھیل ہے جو کوئی بھی کھیل سکتا ہے۔ سنگ کو اپنے اس آرٹ پر ناز تھا۔ وہ اس کی توہین برداشت نہیں کر سکا اور اس نے غصے کے عالم میں پستول نکال کر سارا پستول عمران پر خالی کر دیا۔ عمران نے اسی کے انداز میں اچھل کود کر کے سارے نشانے خالی کر دیے۔ سنگ نے بھی پوری مہارت سے اس پر کئی بار قائر کیے لیکن عمران اس سے بھی زیادہ شاندار پر قائر منس کا مظاہرہ کرتا رہا۔

سنگ نے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ کون چچا ہے کون بھتیجا۔ مجھے اس طرح سنگ اور عمران یاد آ گئے۔“

میں دنگ رہ گئی۔

☆.....☆

آرام کے دن میرے مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔ میں تو متحرک رہنے ہی کو زندگی قرار دیتی تھی۔ دل پھینک نو جوانوں کی تڑپ دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرا خوب صورت بدن اور خوب صورت چہرہ بہت سے ہنگاموں کا محرک تھا اور کبھی کبھی میں یہ کھیل بھی کھیل نہیں تھی۔ نو جوان مجھ پر سمجھ کر اپنی جیسی کوششیں کرتے اور میں انہیں کسی ویرانے میں لے جا کر ان کی سکائی کر دیتی تھی اس طرح ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی ورزش بھی ہو جاتی تھی۔

لیکن ان دنوں میری راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ مجھ پر ایک آسیب کا سایہ ہو گیا تھا جس کا نام عمران تھا۔ جس کا نام اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میں اسے دوسرے انداز میں سوچتی تھی۔ نہ جانے کیا کیا۔ تین دن کے بعد انکل وانچی نے کچھ اور انکشافات کیے۔

انکل وانچی بھی کمال کی شخصیت ہیں جس چیز کے پیچھے پڑ جائیں کر کے چھوڑتے ہیں انہوں نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”کورڈیل کی کائی بھیڑوں کی صفائی کے دوران وہ گارڈ جس نے تمہاری مدد کی تھی.....“

انکل وانچی کے اس آغاز پر میں چونکی۔ میرے کسی سوال سے پہلے انکل نے میرے الگ کیس کا حوالہ دیا۔ پھر بولے۔ ”اور آخر میں نہیں بلکہ تازہ ترین میر لیونسکی سازش کیس میں اونیو میں خصوصاً اونیو کا نام لے رہا ہوں کیونکہ اس وقت ہماری انجمن وہی ہے۔“

میری پوری توجہ انکل کی طرف تھی وہ بولے۔ ”وہ شخص ان تینوں کیسز میں تمہارے آس پاس رہا۔ اب میں تمہیں کچھ اور باتیں بتا رہا ہوں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی تبدیلیوں پر غور کیا گیا اور بہت سے عوامل سامنے آئے لیکن دنیا دوسری جنگ عظیم سے نہ بچ سکی اور دوسری جنگ عظیم بے شمار غم انگیز اور بھیانک یاویں چھوڑ گئی۔ اقوام متحدہ کا وجود کبھی فعال نہیں رہا اور بین الاقوامی مسائل میں وہ صرف لکڑی کا گھوڑا ثابت ہوئی۔ دنیا اس لیے گریز نہیں کر سکی اور وہ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم

ہے لیکن اسے صرف لنگڑا گھوڑا سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی ملک کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سیاستدانوں نے بہت کچھ کیا لیکن پھر بین الاقوامی سرمایہ داروں نے سر جوڑ کر غور کیا اور کورڈیل وجود میں آئی۔ لیکن کورڈیل یہودی لابی کے لیے ناپسندیدہ ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح بین الاقوامی تجارت اس میں وہ ایک کے چار نہیں ایک کے دس، بلکہ بیس بنا رہے تھے متاثر ہوئی اور انہیں مہنگائی کو آسمان تک پہنچانے کی کوششوں میں رکاوٹ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ملکوں کے ذمے دار خرید کر انہیں کورڈیل میں داخل کر دیا اور اس ادارے میں بھی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔

چنانچہ یہ شعبہ بھی کافی حد تک فیل ہو گیا۔ دنیا بھر میں امن کے دشمن جو جنگیں کرا کے اپنے حق میں ہیں بلیوں ڈالر خرچ کر کے بین الاقوامی امن تباہ کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے لاتعداد سازشی ادارے کام کر رہے ہیں اور دنیا کے امن جھن، جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور مہنگائی کے فروغ کے لیے نت نئے منصوبے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ دنیا میں امن نہ ہو اور ان کا کام جاری رہے چاہے دنیا تیسری جنگ کی لپیٹ میں کیوں نہ آ جائے۔

اس صورت حال کو محسوس کر کے دوسرے اہم لوگوں نے اپنے فرض کی ادائیگی کا آغاز کیا۔ یہ بہت بڑے بڑے سائنسدان اور فوجی سربراہ ہیں اور انہوں نے ساری پابندیوں سے بٹ کر اپنے طرز پر ایک ادارہ بنایا جسے انہوں نے ”پی فورس“ کا نام دیا۔ پی فورس کا کام یہ ہے کہ وہ ان سازشوں کو ناکام بنائیں جو بین الاقوامی امن کے لیے تباہ کن ہیں۔

اس بارے میں بڑی چھان بین کے بعد پی فورس کے عہدیداران کا انتخاب کیا گیا اور تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اس فورس کا سربراہ ایکس ٹو ہے جسے اس کی کارکردگی کی بنا پر اس فورس کا جس میں اس وقت تیرہ ممالک کے نمائندے شامل ہیں، بنایا گیا ہے۔

چنانچہ مائی ڈیئر! اپنی پارک وہ شخص جیسا کہ تم نے بتایا کورڈیل کیس میں تمہاری مدد اس کے فرائض میں شامل تھی وہ بھی ان کالی بھیڑوں کو منظر عام پر لا کر ان کی پول کھولنا چاہتا تھا۔ یہی کیفیت ہیریونسکی کیس کی ہے۔ جرائم پیشہ تنظیم ہیریونسکی کو اغوا کر کے لائی چن لے گئی اور شوکیا کہ ہر کارروائی لائی چن کی ہے تاکہ لائی چن اور شاریکا کے درمیان بدترین چپقلش پیدا ہو جائے۔ انہوں نے اس کے بیوی بچے کو بھی اغواء کر کے ان کی جگہ نقلی بیوی اور بچہ فروکش کر دیا۔

اگر وہ ایکس ٹو ہی ہے جس نے اس کیس میں بھی تمہاری مدد کی ہے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پی فورس نے ہیریونسکی کے اغواء کا فوری نوٹس لیا اور وہ تم سے پہلے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔“

نہ جانے کیوں میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ عمران، گارڈ، ادنیو، یا کوئی بھی وہ یہ سب میرے لیے نہیں کرتا تھا بلکہ وہ صرف اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ صرف اپنی ڈیوٹی۔ تاہم میں نے کہا۔

”مجھے اس کے بارے میں مزید تفصیلات درکار ہیں انکل۔ کسی وقت میرا اس سے تصادم بھی ہو سکتا ہے اس لیے مجھے اس کے پورے کوائف معلوم ہونا ضروری ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ انکل ترموداواچی نے کہا۔

(اپنی پارک..... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تھلکہ چائے گی۔
اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)



عشق و زلزلہ

حنا بشری

اس جن کا قصہ جو ایک آدم زادی سے عشق کا مرتکب ہو گیا تھا



لیں۔ میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔
وہ انتہائی عاجزی سے بولا۔

”اپنے بڑوں سے اجازت لے کر آئے ہو؟“
بابا جان گھر پر سوچ انداز میں بولے۔

”جی بالکل ان ہی کی اجازت سے آیا ہوں۔
ان ہی کا حکم ہے کہ آپ سے تعلیم حاصل کروں!“

وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

”نہیں حلوہ تیار کرواؤ نئے شادگر کیلئے۔“ بابا
جان نے حجرے سے آواز لگائی۔

اپنا حلوہ تیار کر رہی تھیں۔ میں ان کے پاس
جا کر بیٹھ گئی۔

”اپنا نیا شادگر اس قدر خوبصورت ہے کہ کیا
بتاؤں۔ اس کی آنکھیں اتنی سیاہ اور چمکدار ہیں کہ

کوئی شخص زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ ہی نہیں
سکتا۔ اتنا خوش شکل نوجوان میں نے آج تک نہیں

دیکھا۔ اپنا آپ اسے دیکھ لیں تا تو بے ہوش ہو کر گر
جائیں!“ میں نے تفصیل سے انہیں ہر بات بتائی۔

”تم تو ہر شادگر کے بارے میں ایسا ہی کہتی ہو
اور میرا بھی بے ہوش ہونے کا کوئی ادارہ نہیں ہے

آج ایسا بہت عرصے بعد پرسکون نیند سوئی
تھیں۔ کتنی تکلیف وہ آزمائش سے ان کو گزر رہا تھا۔

آزمائش تو نظام کائنات کا دستور ہے۔ جو انسان بھی
اس دنیا میں آیا ہے اس کو آزمائش کی بجٹی سے گزرنا ہی

ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم میں واضح انداز میں فرمایا
گیا ہے کہ ”میں تمہیں جان، مال، رزق اور خوف سے

آزماؤں گا۔“ اور صرف صابریں کو کامیابی کی بشارت
دی گئی ہے۔ آج اپنا کی تکلیف کا جہاں انجام ہوا

وہاں عبدالرحمن کی تکلیف کا آغاز ہو گیا۔
ہمارے بابا جان مولوی جلیل مسجد کے امام تھے۔

بہت سے علوم پر دسترس حاصل تھے۔ لوگ دور وراز
سے اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے ان کے پاس پھوڑ جایا

کرتے تھے۔ کچھ طالب علم دن رات بابا جان کے
پاس ہی رہتے یہ مسجد ہی ان کا مستقل ٹھکانہ

ہوتی۔ حجرے سے کسی نوجوان کی آواز آرہی تھی، میں
نے مکمل رازداری سے پردے سے جھانکا 18 سالہ

انتہائی خوش شکل نوجوان بابا جان کے قدموں کے
پاس بیٹھا تھا۔

”مولوی صاحب مجھے اپنی شاگری میں لے

نظر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ بے حد حسین تھا۔ میں حلوہ دے کر آگئی مگر پردے سے جھانک کر ان کی باتیں سننے لگی، بابا جان نے تلاوت شروع کی۔

”ارے یہ کیا؟“ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ بابا جان تو ہمیشہ سورۃ مدثر یا منزل کی تلاوت کرتے تھے مگر آج وہ سورۃ جن کی تلاوت کر رہے تھے۔ تلاوت مکمل ہوئی تو وہ اسے لکھتیں کرنے لگے۔

”عبدالرحمن زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ شیطان کے مکر و فریب سے بچو گے اور یاد رکھنا میں کسی قسم کی سرکشی برداشت نہیں کروں گا!“ بابا جان سنجیدگی سے بولے۔

”میں پوری کوشش کروں گا!“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ بابا جان نے اس کو اپنے ہاتھ سے حلوہ کھلایا اور پلیٹ اسے تھما دی۔

کیوں کہ میں نے حلوہ تیار کر کے اندر بھجوانا ہے۔“ وہ مستکراتی ہوئی بولیں۔

”زیب یہ اندر لے جاؤ!“ انہوں نے حلوے کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں پلیٹ سے تھوڑا سا حلوہ کھانے لگی تھی کہ ایپا نے گرم گرم چچ میرے ہاتھ پر مارا۔

”منع کیا ہے بابا جان نے کہ شاگرد سے پہلے اس میں سے کوئی نہ کھایا کرے!“ ایپا نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

”اپا کیا ہوا اگر ایک لقمہ لے لیتی تو میرے مبارک ہاتھوں سے حلوہ اور بابرکت ہو جاتا، حلوے کو دیکھ کر میرے منہ پانی آرہا تھا!“ میں نے چڑتے ہوئے جواب دیا۔ میں حلوہ لے کر اندر گئی ایک نظر چپکے سے عبدالرحمن پر ڈالی وہ باادب طریقے سے



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”مولوی صاحب! منی کی ہنڈیا بٹے گی!“ وہ بولا۔

”نہیں بھائی کو ہنڈیا لا کر دو!“ بابا جان نفاہت سے بولا۔ میں نے ہنڈیا لا کر دی۔ پھر اس نے ماچس مانگی میں بھاگی بھاگی لے کر آئی مگر توازن قائم نہ رہا اور میں گر پڑی اور ماچس بھی جا کر پانی میں گر گئی۔

”اوہ! اب کیا ہوگا اور تو کوئی ماچس نہیں ہے!“ میں گھبراتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم جاؤ میں کچھ کرتا ہوں!“ عبدالرحمن معروف انداز میں بولا۔ میں چلی تو گئی مگر حسبِ عادت چپکے سے جھانکنے لگی پھر جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ عبدالرحمن نے اطمینان سے لکڑیوں پر ہاتھ رکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی آگ بھڑک اٹھی میرا دل خوف سے کانپ اٹھا عبدالرحمن یوں کھڑا تھا جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔ بابا جان کو دوا تیار کر کے دی گئی وہ یوں تندرست ہو گئے جیسے کبھی بیمار ہی نہ تھے۔ اپنا کو تمام واقعہ بتایا تو وہ فوراً چل گئیں۔

”نہیں کیا بات ہے تم ہر وقت اسی پر کیوں غور کرتی ہو۔ بابا جان کو خبر ہوئی تو سخت خفا ہوں گیا۔“ اپنا تو سو گئیں مگر میں عبدالرحمن کی عجیب و غریب شخصیت پر غور کرتی رہی۔

☆.....☆

اب وہ رفتہ رفتہ بابا جان کے منظور نظر شاگرد بن گئے۔ بابا جان ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاقے کے کچھ مالدار لوگ مسجد کے لیمکواں کھدوانا چاہتے تھے مگر کام نہیں ہو پارہا تھا۔ بہت سے مزدور لگے تھے مگر ناجانے کیا مسئلہ تھا بابا جان کہتے۔

”اگر عبدالرحمن ہوتا تو کبھی اتنی دیر نہ ہوتی!“

”اتنے لوگ مل کر کچھ نہ کر سکے تو دیا سلائی کیا کرے گی!“ میں نے عبدالرحمن کا مذاق اڑایا۔

کانی دنوں بعد عبدالرحمن واپس آیا تو بابا جان نے درپیش مسئلہ بیان کیا۔ عبدالرحمن نے فوراً کام شروع کروا دیا۔ مگر کھدائی کے دوران کوئی بھی نظر

”پیٹو نہ ہو تو ذرا سا بھی نہیں بچایا!“ میں نے ای اپنا کئے سامنے بھڑاس نکالی۔

”اوہو کیوں بے چارے کے نوالے گن رہی ہو۔ پتا نہیں کتنی دور سے آیا ہوگا اور کتنا بھوکا ہوگا!“ ای نے مجھے گھورتے گھورتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

”بابا جان ایک بات پوچھوں!“ بابا جان آئے تو میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”یاں پوچھو!“ بابا جان بیٹھتے ہوئے بولے۔

”بابا جان! جب بھی نیا شاگرد آتا ہے آپ سورۃ مزمل یا سورۃ مدثر کی تلاوت کرتے ہیں مگر آج آپ نے سورۃ جن کی تلاوت کیوں کی؟“ میں تجسس سے بولی۔

”بہت بدتمیز ہو تم خبردار آئندہ کبھی یوں اندر جھانکا!“ بابا جان اچھے خاصے غصے میں آ گئے۔

مگر میں نے ہمیشہ کی طرح ان کے غصے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ مجھے اصل بے چینی تو اپنے سوال کی تھی جس کا جواب نہ ملنے پر میں اور بے چین ہو گئی۔

☆.....☆

عبدالرحمن بہت ہی تابعدار شاگرد تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرتا۔ مسجد میں پانی بھرتا، نماز کے لیے صفیں بچھاتا، اکثر جماعت کرواتا، بابا جان کی طبیعت ناساز ہوتی تو صبح سویرے اذان دیتا۔ اس کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ بابا جان کو اپنے ہاتھوں سے جوتے پہناتا۔

ایک مرتبہ بابا جان سخت بیمار ہو گئے، کسی دوا سے افاقہ نہ ہو رہا تھا، اور اس پر یہ مصیبت کہ عبدالرحمن بتائے بغیر نا جانے کہاں غائب تھا۔

”اپنا دلچسپ بہت ہی خود غرض اور مطلبی ہیں عبدالرحمن بھائی۔ بابا جان اتنے بیمار ہیں اور وہ غائب ہیں!“ میں نے اندر کا زہرا گھلا۔

”بھئی بے چارے کو کوئی مجبوری ہوگی!“ اپنا نے اس کی حمایت کی۔

پھر اچانک ہی عبدالرحمن پھر سے واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جڑی بوٹیاں تھیں۔

نہیں آتا تھا۔
 ”ارے یہاں تو کوئی بھی کام کرتا نظر نہیں
 آ رہا!“ اپنا نے میرے ساتھ کھڑکی میں سے دیکھتے
 ہوئے کہا۔

دیکھا میں کہتی تھی تاکہ عبدالرحمن بھائی بہت
 عجیب و غریب انسان ہیں!“ میں فوراً بولی۔
 عبدالرحمن کی شخصیت دن بدن عجیب تر ہوتی
 جا رہی تھی۔

عبدالرحمن کی ذیوبی بابا جان نے کھانا لانے کی
 لگائی تھی، دوپہر کو وہ ان کا کھانا لے کر جاتے تھے۔
 اپنا ان سے مکمل پردہ کرتی تھیں۔

ایک دن اپنا عبدالرحمن کو کھانا پکڑا رہی تھیں کہ
 اس دوران درمیان میں لگی چٹ کر گئی اپنا بغیر حجاب
 کے تھیں عبدالرحمن کی ان پر نظر پڑی..... وہ اپنی جگہ
 ساکت رہ گیا۔ اپنا بے حد محسین تھیں۔ عبدالرحمن بھی
 ان کے حسن بے مثال کی تاب نہ لا سکا۔ اپنا گھبرا کر
 واپس چلی مگر عبدالرحمن ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

”عبدالرحمن! کیا ہو گیا ہے۔ بجائے کہ اٹھا کر چٹ
 لگاؤ تم بت بنے کھڑے ہو!“ اپنا نے اسے جھڑکا۔
 اس دن کے بعد عبدالرحمن کم صبر رہنے لگا تھا۔
 نا جانے کون سا غم اس کے دل کو چٹ گیا تھا۔

☆.....☆

آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ میں بھی
 ضد کر کے اپنا کو ساتھ لیے چھت پر آگئی ٹھنڈی ہوا
 دل و دماغ کو سکون دے رہی تھی۔ میری نظر مسجد کی
 چھت پر پڑی جہاں عبدالرحمن لڑکوں کے ساتھ کھڑا
 کام کروا رہا تھا۔ اس کی نظر بھی اچانک اپنا پر پڑی تو
 وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں
 نے چورنگا ہوں سے اپنا کو دیکھا، وہ اس کی موجودگی
 سے بے خبر تھیں۔ میں اپنا سے باتیں کر رہی تھی کی
 اچانک تیز بگولہ ہماری طرف آیا۔ آنکھوں میں منی
 پڑنے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے دیا تھا۔ کچھ دیر
 بعد جب طوفان تھما تو ہم دیکھنے کے قابل ہوئے تو
 عبدالرحمن ہمارے قریب کھڑا تھا۔

”ارے عبدالرحمن بھائی آپ؟“ میں انہیں

اچانک قریب دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اپنا نے دوپے
 سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور رخ موڑ لیا عبدالرحمن صرف
 اپنا کی طرف متوجہ تھا۔

☆.....☆

”شہر بانو! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!“
 وہ اپنا کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ میں اس کی جرأت
 پر حیران رہ گئی۔

میں اور اپنا چراغ جلا رہے تھے۔ بہت سخت
 اندھیرا ہو رہا تھا یہ کام عبدالرحمن ہی کرتا تھا مگر آج
 مصروفیت کی بنا پر وہ آ نہ سکا تو میں اپنا کے ساتھ آگئی
 اپنا چہرہ حجاب میں چھپائے چراغ روشن کر رہی تھیں۔
 نا جانے کیسے وہاں عبدالرحمن بھی پہنچ گیا وہ ذرا قاصدے
 پر تھا جہاں کچھ اندھیرا سا تھا مگر میں باخبر تھی۔ اس کی
 محویت نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا کہ اپنا
 کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ اپنا پر سے نظر نہیں
 ہٹا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا ستاروں کی طرح چمک
 رہی تھیں۔ اسی اثنا میں جانے کب ایک چراغ پر اپنا
 کا دوپے گر اور آگ لگ گئی۔ میری توجہ نکل گئی اپنا
 بھی سخت گھبرا گئیں۔ عبدالرحمن تیزی سے ان کی
 طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھا دی۔ اپنا
 روئے جا رہی تھیں۔

”عبدالرحمن بھائی! آگ نے تو آپ کے
 ہاتھوں کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا!“ میں حیران
 ہوئی۔

”ارے آگ، آگ کو کیا نقصان پہنچائے گی!“
 وہ یوں ہاتھ جھاڑ رہے تھے جیسے مٹی جھاڑ رہے ہوں۔
 ان کی بات پر بابا جان کے چہرے پر شدید ناگواری
 آگئی۔ ابھی تو وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ
 رہے تھے۔ اب انہیں گھورنے لگے۔ عبدالرحمن نے
 فوراً بھاگ کر ان کے پیر پکڑ لیے۔

”مولوی صاحب! معاف کرویں غلطی سے منہ
 سے نکل گیا تھا!“ عبدالرحمن پشیمانی سے بولا۔

”کہا تھا نا کہ ہر دنیا کے اپنے اصول ہوتے ہیں
 مگر تم بھولتے جا رہے ہو۔ آئندہ غلطی ہوئی تو تمہیں
 تمہاری دنیا کی طرف روانہ کروں گا!“ بابا جان غصے

سے بولے۔
یہ دیکھ کر میرا ذہن الجھ سا گیا تھا۔ مگر کوئی سرا
ہاتھ نہ آیا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ کوئی ایسی بات تھی
جو ہم سے پوشیدہ تھی مگر بابا جان واقف تھے۔

☆.....☆

جعرات کا دن تھا۔ عبدالرحمن کھانا لینے آیا تو
مجھے پکارا۔
”نائب میرا ایک کام کر دو گی!“ عبدالرحمن
عاجزی سے بولا۔

”کون سا کام!“ میں بولی۔

”یہ پھول شہر بانو کو دے دو!“ انتہائی
خوبصورت سفید رنگ کے پھول انہوں نے مجھے
پکڑاتے ہوئے کہا۔

ہائے کتنے خوبصورت پھول ہے۔ یہ تو کسی
خاص جگہ کے لگ رہے ہیں!“ میں نے کہتے ہوئے
سوچنا چاہا۔

”ٹھہر دو! یہ تمہارے لیے نہیں ہیں!“
عبدالرحمن کے لہجے میں سختی سی تھی۔
”اچھا بابا! اپنا کوئی دوسرا گیٹو کیا سوچنے پر بھی
پابندی ہے!“ میں نے مصنوعی خشکی سے پوچھا۔
”بس یہی سمجھ لو!“ وہ بولا۔

میں نے پھول دوپٹے میں چھپائے اور اندر
آگئی مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اپنا کی بربادی کا
سامان میں ہاتھوں میں اٹھا کر لائی ہوں۔

”اپنا! یہ پھول عبدالرحمن بھائی نے بھجوائے
ہیں!“ میں نے پھول دیتے ہوئے شوخی سے چھیڑا۔
”لیکن کیوں؟“ اپنا حیرت سے بولی۔

”پتا نہیں مجھے تو انہوں نے کہا کہ خاص جگہ کی
سوغات ہے اور خاص لوگوں کے لیے
ہے۔“ شرارت سے بولی۔

”کس قدر عمدہ خوشبو ہے!“ اپنا نے کہتے
ہوئے ایک لڑی اپنے بالوں میں لگالی۔ پھولوں نے
ان کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ میں نے نظر پچا
کر ایک پھول بالوں میں لگالیا۔ پھول لگاتے ہی میرا
سر بری طرح سے چکرانے لگا میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ

گئی۔ دل ڈوبنے لگا شدید غنودگی سی ہونے لگی تھی۔
یوں لگا جیسے کسی نے کندھوں پر پیاز جتنا وزن رکھ دیا
ہو۔ میں نے گھبرا کر پھول اتار تھیکے تو حالت سنبھلی۔
اپنا کودیکھا تو وہ گہری نیند سوچتی تھیں۔ مجھے بہت
حیرت ہوئی تھی کہ اپنا اچانک کیسے سو گئیں، میری
چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اپنا کو یہ پھول نہیں لگانے
چاہیے تھے۔ مگر اب تو تیرکمان سے نکل کر شکار کے
سینے میں پوسٹ ہو چکا تھا۔

”ارے یہ لڑکی مغرب کے وقت سو رہی ہے یہ تو
اس وقت نہیں سوتی!“ اماں نے حیرت کا اظہار کیا۔
”اور یہ پھول کیوں لگا رکھے ہیں!“ اماں
بولیں۔

میں چپ رہی جانتی تھی کہ سخت ڈانٹ پڑے
گی۔

☆.....☆

رات کے آخری پہر میری آنکھ کھلی تو اپنا اپنے
بستر پر نہیں تھیں، شاید پانی پینے گئی ہوں، میں نے
اپنے دل کو تسلی دی۔ کالی دیر انتظار کے بعد جب وہ
نہ آئیں تو میرے دل کو خوف لاحق ہوا میں باہر نکل
آئی، ہر جگہ خاموشی کا راج تھا۔ یکا یک باتوں کی
آواز پر میرے قدم تھم سے گئے، آوازیں چوتھے
کی سیڑھیوں کی طرف سے آرہی تھیں۔ اسی اثنا میں
اپنا کی مدھنسی گونجی خوف سے میرا خون جمنے لگا۔
میں ہمت کر کے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئی۔ وہ کسی
شخص سے محو گفتگو تھیں۔

رات کے اس پہر وہ کون تھا؟ اور اپنا یوں کسی
اجنبی سے باتیں کیوں کر رہی تھیں؟ میں آگے بڑھی
مگر تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میں
نے گھبرا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ روشنی کے
باعث میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں!“ اپنا کی خوابیدہ
آواز سنائی دی۔

”کل ملنے آؤ گی نا!“ وہ شخص بہت محبت بھرے
لہجے میں بولا۔

میں خوف سے بھاگتی ہوئی کمرے میں آ کر لیٹ

گنی۔ کون تھا وہ عبدالرحمن یا کوئی اور.....!

اپنا کمرے میں آئیں، پھول ابھی بھی بالوں میں لگے تھے۔ ان کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا کہ سب کو اٹھا دوں اور یہ ماجرا کہہ ڈالوں۔

☆.....☆

صبح عبدالرحمن خلیف معمول بہت خوش تھا۔ مجھے اس کی خوشی کھٹک رہی تھی۔
”بھائی بہت خوش ہیں کوئی بڑی خوشی مل گئی ہے!“ میں کڑواہٹ چھپا کر بولی۔

”ہاں کچھ ایسا ہی ہے!“ میں نے اسے کریدنے کیلئے پوچھا۔

”ایک بات پوچھوں!“

”ہاں..... ہاں پوچھو!“ وہ بولا۔

میں نے رات کا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”اچھا..... میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا!“ وہ گھڑبڑا کر بولا۔ اس کا لہجہ اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔

”اچھا..... تو ٹھیک ہے میں بابا جان سے پوچھ لوں گی!“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”نہیں..... نہیں مولوی صاحب سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود سارے معاملے کی نوعیت معلوم کرتا ہوں۔ اب نماز کو دیر ہو رہی ہے میں مسجد جا رہا ہوں!“ وہ نظریں چرا کر بولتا باہر نکل گیا۔

☆.....☆

راتوں کو غائب ہونا اپنا کام معمول بن گیا تھا۔ گھر والوں سے لا تعلق سی رہیں مغرب کے وقت ہی سو جاتیں ہر وقت ہر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوارتیں اور اکیلے میں ہسکراتی رہتیں۔ اماں بھی سب دیکھ رہی تھیں۔

اگلی جمعرات کو عبدالرحمن نے ایک بچے کے ہاتھ پھول بھجوائے جو اماں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس رات اپنا بے خبر سوتی رہیں مگر ساری رات دروازے

پر دستک ہوئی رہی۔ میں اٹھ کر باہر دیکھتی تو کچھ نہ ہوتا۔ وقفے وقفے سے دستک جاری رہی، میں چھپ کر کھڑی ہو گئی تاکہ بجانے والے کو فوراً پکڑ لوں مگر وہ بھی کمال کا پھرتیلا تھا، نا جانے کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ ساری رات یہ آنکھ پھولی جاری رہی۔ صبح جاتے رہنے کی وجہ سے سردرو سے پھٹ رہا تھا۔ صبح عبدالرحمن کا موڈ بہت خراب تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر رہا تھا۔ ہر بات پر بابا جان سے ڈانٹ کھا رہا تھا۔

”بھائی کیا بات ہے آج مزاج بہت مجزا ہوا معلوم ہوتا ہے!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اشرف المخلوقات کو ہماری خوشی برداشت کہاں ہوتی ہے!“ وہ جل بھن کر کہتا باہر نکل گیا۔

”اشرف المخلوقات..... ارے تو یہ خود کیا ہیں؟“ میں حیران ہوئی۔

☆.....☆

ایک رات کو اپنا پھر غائب تھیں۔ میں غصے کے عالم میں فوراً باہر گئی دل چاہ رہا تھا کہ اس انجان شخص کا خشر نشر کروں، اپنا سے چھپ چھپ کر ملتا ہے۔ میری ایسا کتنی باحیا اور ٹیک ہیں میں سوچتی وہاں گئی دیکھا تو روشنی کا مضبوط حصار موجود تھا، میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکی۔

”ہاں ہاں..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے ہی شادی کروں گی!“ اپنا ہنستے ہوئے وعدہ کر رہی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اپنا کسی انجان شخص سے شادی کا وعدہ کر رہی تھیں۔

بابا جان کو خبر ہوئی تو کس قدر خفا ہوں گے یا اللہ یہ کون شخص تھا جو اس وقت آتا۔ اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہوتی۔

”ایسا! آپ رات کو کس سے باتیں کر رہی تھیں!“ میں انتہائی غصے سے بولی۔

”میں..... پاگل..... میں تو سو رہی تھی!“ اپنا لاپرواہی سے ہنستے ہوئے بولیں۔

☆.....☆

اندر داخل ہوئے تو اسے دیکھ کر بھڑک اٹھے۔
 ”مولوی صاحب! میں شہر بانو کے بغیر زندہ نہیں
 رہ پاؤں گا!“ وہ گمز مزا یا۔

”نکل جا ذلیل یہاں سے!“ بابا جان نفرت
 سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”مولوی صاحب! آپ مجھے سرکشی پر مجبور
 کر رہے ہیں!“ وہ غصے میں آ گیا۔

”احسان فراموش، گھٹیا!“ بابا جان نے ایک
 زوردار تھپڑ اسے وے مارا اور اسی دھچکتے ہوئے باہر
 لے گئے۔

احسان فراموش!“ وہ اسے صلواتیں ستارہ
 تھے۔

”بابا جان! آخر عبدالرحمن میں کیا کی ہے جو
 آپ ایسا سلوک کر رہے ہیں!“ میں اچانک بولی۔

”نسب! تمہارا معاملات سے دور رہو۔ انکار
 کی وجہ نہیں بتا سکتا میں۔ آج کے بعد کوئی عبدالرحمن
 کا نام نہ لے!“ بابا جان نے فیصلہ سنایا۔ میں
 بابا جان کے جواب پر چپ ہو گئی مگر تجسس ابھی باقی
 تھا۔

اس واقعے کے بعد اپنا گم صم ہو گئیں کھانا پینا
 چھوڑ دیا ہر وقت کمرے میں پڑی رہتیں چند دنوں
 میں برسوں کی بیمار لگنے لگیں سب بہت پریشان تھے۔

☆.....☆

ایک رات اپنا بہت بے چین تھیں۔ بار بار ٹہلنے
 لگتیں جیسے کسی کا انتظار ہو۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے
 سب دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر میں دور کہیں سے جلی کی
 آواز آتی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی پھر وہ آواز
 بالکل دروازے کے قریب سے آنے لگی اور جلی
 دروازہ کھرنے لگی۔ اپنا تو گویا منتظر تھیں۔ تڑپ کر
 اٹھیں اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بڑا کھڑا تھا
 اپنا اسے گود میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ وہ دونوں
 ایک دوسرے سے بہت مانوس لگ رہے تھے۔

میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتی تھی۔ اذانوں کی
 آوازیں سنائی دیں تو بڑا چلا گیا اور اپنا اطمینان سے
 سو گئیں اور پھر یہ معمول بن گیا۔

اگلی جمعرات کو عبدالرحمن نے پھر پھول بھجوائے
 جو اتفاقاً بابا جان کے ہاتھ لگ گئے۔ وہ انتہائی جلال
 کی حالت میں عبدالرحمن کو آوازیں دیتے ہوئے
 حجرے میں چلے گئے۔

میں نے چپکے سے جھانکا..... عبدالرحمن بابا جان
 کے پاؤں پکڑ کر رو رہا تھا۔

”مولوی صاحب! معاف کر دیں میں بہت
 مجبور ہو گیا ہوں۔ محبت کے جذبے سے لڑ نہیں پایا!“
 وہ ہاتھ جوڑتے بولا۔

”تو تجھے میرا ہی گھر ملا تھا خبیثکے لیے!“
 بابا جان گرجے۔

”میں شہر بانو سے شادی کرنا چاہتا ہوں!“ وہ
 روتے ہوئے بولا۔

”بند کر اپنی بکواس کبھی تو نے غور کیا ہے کہ یہ
 شادی ممکن ہے!“ بابا جان غضب ناک انداز میں
 بولے۔

مولوی صاحب! میرے بڑوں نے بھی ایسی
 شادیاں کی ہیں!“ وہ منت کر رہا تھا۔

”میرے اندر حوصلہ نہیں کہ میں اپنے جگر کا کھڑا
 تیرے حوالے کر دوں!“ بابا جان غصے سے گھورتے
 باہر نکل گئے۔

عبدالرحمن وہیں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اوہ! تو
 عبدالرحمن اپنا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور ان کا رشتہ
 مانگ رہا ہے، بابا جان اگر مان جائیں تو کم از کم اس
 کمینے انسان سے تو جان چھوٹے گی، جو اپنا کو ورغلا
 رہا تھا۔ شادی کے وعدے لے رہا تھا۔ نا جانے
 بابا جان کے انکار کی وجہ کیا ہے!“ میں سوچتی رہی۔

”بی بی صاحبہ! آپ ہی میری مدد کریں۔ میں
 شہر بانو سے شادی کرنا چاہتا ہوں!“ وہ اماں جان
 کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

”دیکھو عبدالرحمن! میں اس سلسلے میں تمہاری
 کوئی مدد نہیں کر سکتی!“ اماں نرمی سے بولیں۔ وہ خود
 حیران تھیں کہ آخر انکار کی کیا وجہ ہے عبدالرحمن تو گھر
 کا بچہ ہے انتہائی فرماں بردار اور شریف۔

یہ خبیث ابھی تک یہاں بیٹھا ہے!“ بابا جان

امریکہ کی دریافت

شروع میں دنیا میں تصورے ہی ملک تھے لوگ جیسے اس چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پندرہویں صدی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کا تصور نہیں، وہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ غلطی ہے۔ امریکہ دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی، یعنی امریکہ دریافت کیا۔ بہر حال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی اس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔

(ابن انشاء کی 'اردو کی پہلی کتاب' سے راتہ عدن۔ بحرین کا انتخاب)

کرنے لگے۔

ان کی بے خبری میں ایسا نے ان پر چھری سے حملہ کر دیا۔ اسی ہاتھ کو زخمی کیا جس سے بے لگہ مارا تھا۔ بابا جان کو گہرا زخم آیا تھا۔ میری اور اماں کی بری حالت تھی فرط جذبات میں آکر اماں جان نے اپنا کو ایک تھپڑ لگایا تو وہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔

اس بے چاری کو کیوں مار رہی ہو وہ اپنے بس میں کہاں ہے! بابا جان تکلیف سے نڈھال ہو کر بولے۔

صبح میں نے بابا جان سے پوچھا۔

بابا جان! آپ نے بے کواتنی بے رحمی سے کیوں مارا؟ مجھے بہت دکھ تھا۔

بیٹا وہ دراصل بلا نہیں ہوئی مخلوق تھی جو بے کے روپ میں تھی! بابا جان بولے ان جواب پر میں دنگ رہ گئی۔ ایک بات جو مجھے بے چین کیے جا رہی تھی کہ عبدالرحمن یا وہ اجنبی شخص یا پھر وہ پراسرار بلا تینوں کا اپنا سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ نجانے کیا راز تھا؟

☆.....☆

کافی دن سکون سے گزر گئے وہ بلا پھر نہ آیا تھا۔ بابا جان باقاعدگی سے گھر کا حصار کرتے تھے شاید مصیبت ٹل گئی تھی۔ اس نادیدہ مخلوق نے اپنا کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ میں سوچتے سوچتے سو گئی۔ خواب میں میں نے عبدالرحمن کو دیکھا وہ ہمارے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم زخمی تھا۔ گہرا ہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں چپکے سے

”یا اللہ یہ کون سی تھی مصیبت آگئی ہے!“ میں کوفت سے سوچنے لگتی میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ مجھے یہ بات بابا جان اور اماں جان کو بتا دینی چاہیے۔

میں نے ان دونوں سے ذکر کیا تو اماں جان رونے لگیں البتہ بابا جان کے چہرے پر فکڑ کے گہرے بادل چھا گئے۔

”ٹھیک ہے آج رات میں خود جاؤں گا اور دیکھوں گا کیا ماجرا ہے!“ بابا جان بولے۔

سرشام ہی بارش ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ طوفان بھی ایسا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مگر میرے خیال کے برعکس بلا آج بھی موجود تھا۔ بارش میں بھیکتا ہوا۔ اس کی آواز سن کر اپنا بے قراری سے دروازے کی طرف پھٹیں۔

”اچھا تو یہ تیری حرکت ہے۔ اب تجس روپ

بھی اختیار کرنے لگا ہے!“ بابا جان بولے۔ بابا جان کی خونخوار نگاہوں کے مقابلے میں بلا بھی اپنی جگہ ڈنا تھا۔ وہ یوں دیکھ رہا کہ جیسے ہر بات سمجھ رہا ہو بلا بھی شعلہ بارنگاہوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ بابا جان نے اسے لاشی سے مارنا شروع کر دیا اتنا بے دردی سے کہ میری اور اماں کی چٹخیں نکل گئیں۔ کہاں بلی کے ساتھ شفقت کی احادیث سنانے والے بابا جان جو خود اسے اس قدر مار رہے تھے۔ وہ نڈھال سا زمین پر گر گیا بلے کو مار پڑتی دیکھ کر اپنا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ بابا جان نے نیم مردہ بلے کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا اور تمام گھر کا حصار

انھی اور دروازہ کھول کر دیکھا تو حیرت کا شدید جھکا لگا۔ واقعی عبدالرحمن رو رہا تھا۔

”نسب! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے ایک نظر شہر بانو کو دیکھنے دو۔ مولوی صاحب کے سخت دھماکے کی وجہ سے میں اندر نہیں آ سکتا۔ اگر تم اجازت دو گی تو میں اندر آ جاؤں گا۔ کتنے دن ہو گئے ہیں میں اس کی جھٹک نہیں دیکھ پایا ہوں!“

عبدالرحمن بے حد مذہال تھا میرا دل اس کی حالت پر بھرا آیا۔

”ٹھیک ہے بھائی اندر آ جائیں مگر جلدی چلے جائیے گا۔ بابا جان کو خبر ہوئی تو قیامت آ جائے گی!“

میں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ میری اجازت پر وہ کھل اٹھا۔ ایسا بے خبر سو رہی تھیں۔ عبدالرحمن نے انہیں وارفتہ نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔

”بھائی! آپ اتنے زخمی کیوں ہیں!“ میں درومندی سے بولی۔

”دراصل..... مولوی صاحب نے بہت مارا ہے!“ عبدالرحمن آہستگی سے بولا۔

”بھائی آپ ایسا کو بھول کیوں نہیں جاتے۔ مت اپنی جان گنوا میں!“ میں وکھ سے بولی۔

”یہ میرے اختیار میں کہاں ہے نسب!“

عبدالرحمن کا لہجہ بھیگ گیا۔

”اچھا اب آپ جائیں۔ بابا جان نہ آ جائیں!“ میں ایک دم گھبرائی۔

اس نے ایک نظر ڈالی اور میرا شکریہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ میرا دل غم سے بھر گیا تھا۔ میں ان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

☆.....☆

”رات کو یہاں کوئی آیا تھا؟“ بابا جان نے آنکھیں بند کر کے کچھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں تو!“ اماں جان بولیں۔ میری جان نکل گئی مگر میں خاموش رہی تھی۔

”نہیں رات کو نا دیدہ مخلوق گھر میں کسی روپ میں داخل ہوئی تھی!“ بابا جان پر یقین لہجے میں بولے۔

”خیر میں دھماکا مزید سخت کر دیتا ہوں لیکن یاد رکھنا تم دونوں ہوشیار رہنا۔ جب تک تم چاہو گی نہیں کوئی مخلوق بلا اجازت اندر داخل نہیں ہوگی!“ وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولے۔

دھماکا سخت ہوتے ہی بلے کی دل خراش آوازیں دوبارہ آنے لگیں آوازیں کراپیا کی حالت بے حد جنونی ہو جاتی۔ انہیں دورے پڑنے لگتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں بار بار دروازہ کھولنے کی کوشش کرتیں۔ ساری رات ہم پہرہ دیتے بلے کی آواز اس قدر بھیا تک ہوتی کہ لگتا کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ نا دیدہ مخلوق اب انتقامی کارروائیوں پر اتر آئی تھی کبھی گھر کے کسی حصے میں آگ بھڑک اٹھتی، کبھی مسجد کا کوئی حصہ گر جاتا۔ اذان کے وقت لاؤڈ سپیکر میں کرنٹ آ جاتا۔ بار بار بابا جان اس کی زد میں آتے۔ مغرب کے بعد گھر میں پتھر برسنا شروع ہو جاتے۔ وہ اس قدر برا بے ہوتے کہ بابا جان اکثر زخمی ہو جاتے۔

”فرشتے کو شیطان بننے میں بس پل بھر کی دیر لگتی ہے!“ وہ بڑبڑاتے۔

اپنا ان کی تکلیف پر مسکرا رہی ہوتیں۔ ہم بے حد حیران ہوتے مگر ان انتقامی کارروائیوں سے ہم محفوظ رہے تھے۔ یہ بھی ایک راز تھا۔

ایک شام اپنا بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھیں۔

”اپنا کہیں جانا ہے کیا!“ میں حیرت سے بولی۔

”ہاں!“ وہ مسکرائیں۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ رات کو میں جاگنا چاہتی تھی مگر نیند غالب آ گئی تھی۔ رات کو آنکھ کھلی تو اپنا غائب تھیں۔ دھماکے کی وجہ سے کوئی مخلوق اندر تو داخل نہیں ہو سکتی تھی مگر شاید اس نے اپنا کو باہر بلا لیا تھا مجھے خود پر بے حد غصہ آ رہا تھا کہ کیوں سوئی تھی۔

بابا جان کو خبر کی اسارے گھر میں تلاش کیا مگر اپنا نہ ملیں۔ ہم باہر میدان میں آ گئے جہاں کناں تھا۔ وہاں جو منظر دیکھا میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ رنگ و نور کا سماں تھا۔ تمام فضا خوشبو سے معطر

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

تھی۔ کنوئیں پر بے شمار دیے روشن تھے، اپنا کے لیے اس قدر اہتمام تھا کہ کرنے والے کی محبت ظاہر ہو رہی تھی۔ ہم کنوئیں کے قریب پہنچ گئے مگر ہم کچھ خاص دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ کوئی مضبوط سا حصار تھا جو ہمیں روک رہا تھا۔

میں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ باباجان انتہائی طیش کے عالم میں کچھ بڑبڑھنے لگے ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ ایک مردانہ آواز گونجی اور تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ اپنا کنوئیں کے قریب بے ہوش پڑی تھیں۔ میں بھاگتی ہوئی ان کے قریب گئی۔ ان کی حالت پر دل تڑپ رہا تھا، باباجان کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔

☆.....☆

نماز فجر کے بعد باباجان نے ضروری سامان لیا اور باہر جانے لگے۔

”کیا ہوا کہیں جا رہے ہیں؟“ اماں نے پوچھا۔
”ہاں گجرات اپنے پیر و مرشد شاہ عثمانی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ اب اس خبیث کا کچھ کرنا پڑے گا!“ وہ باہر نکل گئے۔ میرے دل کو اطمینان ہوا کہ اب اپنا ضرور ٹھیک ہو جائیں گی وہ پھر پہلے جیسی ہو جائیں گی۔

عشاء کے بعد باباجان واپس لوٹے۔ ان کے کپڑے کچھڑ میں لت پت تھے۔ جگہ جگہ پر خون کے دھبے بھی تھے۔ وہ بہت غمگین لگ رہے تھے۔

”باباجان خیریت کیا ہوا، آپ کے پیر و مرشد نہیں آئے؟“ میں نے ایک ساتھ کلی سوال کر ڈالے۔ باباجان نے اس کے جواب میں جو قصہ سنایا وہ سن کر میں اور اماں جان خوفزدہ ہو گئے۔

”میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ اللہ اللہ کر کے بس پہنچی مگر بس نے کوئی سات چکر لگائے مگر ہر بار مجھے ایک ہی سڑک پر اتار جاتی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس الجھن میں کھڑا تھا کہ طوفانی بارش شروع ہو گئی حیرت انگیز طور پر بارش کا رنگ سرخ تھا۔ میں گھبرا کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بارش آہستہ آہستہ

لگی تو میں نے دوبارہ استمہج کی۔ اسی اثنا میں دو تین چھوٹے بچے نظر آئے ان کے کان چانوروں کے کانوں کی طرح لمبے لمبے تھے۔ رنگت سیاہ اور آنکھیں بالکل سرخ۔

”دیکھو ان پر نظر رکھنا یہ گجرات اپنے پیر و مرشد کے پاس نہ جانے پائیں۔“ دو تینوں سرگوشیاں کرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ان کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے یہاں سے جند از جند نکلنے کا ارادہ باندھا تو کچھ مرد اور عورتیں نظر آئے۔ مرد و حصول بجا رہے تھے۔ عورتوں کے ہاتھوں میں مہندی کے تھال تھے۔ اس دیرانے میں یہ لوگ میری سمجھ سے باہر تھا۔ شاید شادی میں جا رہے ہوں، میں نے دل کو تسلی دی۔

”بھائی! آپ لوگ بھی گجرات جا رہے ہیں؟“ میں نے ایک شخص کو مخاطب کیا اس نے میری بابت کا کوئی جواب نہیں دیا، میں سمجھا شاید ساعت سے محروم ہے میں نے ایک لڑکی سے بھی وہی سوال کیا تو وہ ہنسنے لگی۔

”ارے مولوی صاحب! ہم گجرات نہیں ہم تو ”شہر بانو“ کی شادی میں جا رہے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی شادی ہے اور آپ یہاں ہیں؟“ یہ کہہ کر وہ سب قہقہے لگانے لگے اور دیکھتے دیکھتے دھواں سن کر غائب ہو گئے۔

اس دیرانے میں اپنی لاڈلی بیٹی کا نام اجنبی لوگوں کے منہ سے سن کر میرا دل ڈوبنے لگا، سوچا پر لگیں اور اڑ کر چلا جاؤں۔ اپنی شہر بانو کو دیکھ لوں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔ باباجان یہ کہہ کر رونے لگے۔ میری اور اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں۔ یہ مجھے ہرگز شاہ عثمانی صاحب سے ملنے نہیں دیں گے!“ باباجان دوبارہ گویا ہوئے۔ میں تھک ہار کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو ایک ستر سالہ شخص آتا دکھائی دیا۔ اس کی کمر جھکی تھی اور ہاتھ میں لٹاخمی پکڑے وہ میری طرف آ رہا تھا۔ میں اس کو شیطانی مخلوق سمجھ رہا تھا، مگر اس کا

نورانی چہرہ فل کو تسلی دے رہا تھا۔

”پریشان ہو بیٹی کے لیے؟“ انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ میں بے حد حیران ہوا کہ وہ بغیر کہے میری دل کی بات جان گئے تھے۔

”اس کے اوپر بہت سخت چیز کا قبضہ ہے۔ اس کو قابو کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے، یہ لو پکڑو۔“ انہوں نے ایک تعویذ میری طرف بڑھا۔

”اس کے گھٹے میں ڈال دینا بالکل ٹھیک ہو جائے گی!“ وہ بزرگ یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ بابا جان اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

”نسب! یہ شہر بانو کے گھٹے میں ڈال دو!“ بابا جان مذہب حال لہجے میں بولے۔

تعویذ پسنے کے بعد وہ ون تک اپنا بالکل ٹھیک رہیں، اب ہم سمجھے مصیبت ٹل گئی مگر یہ ہماری غلط فہمی تھی۔

اپنا دوبارہ راتوں کو غائب ہونے لگی تھیں۔ اس نادریدہ مخلوق نے کچھ طرح چکر چلا، اتھا کہ اپنا بہت بے چین رہے لگی تھیں۔ اس تعویذ کا اپنا کو تو کوئی

فائدہ نہ ہوا مگر وہ نادریدہ مخلوق خوب فائدے اٹھا رہی تھی، یہ بھی ایک اہم بات تھی۔ اب سارے علاقے

میں یہ بات پھیل گئی کہ مولوی جنیل کی بیٹی پر ہوائی حقوق کا قبضہ ہے۔ وہ ہر صبح کو کنوئیں کے قریب بے

ہوش پڑی ملتی ہے۔ بابا جان نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ ہر دم روتے رہتے ان کے رونے میں

ایک بے بسی سی کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو بچا نہیں پارہے تھے۔ وہ جہدوں میں گزارتے رہتے اور عبدالرحمن کو

خوب کوستے بدعنائیں دیتے رہتے۔

”مولوی صاحب! ایک تو ہماری بیٹی مصیبت میں ہے اور آپ اس غریب کو بدعنائیں دیتے رہتے

ہیں۔ آپ اگر مان جاتے تو آج ہماری بیٹی اپنے گھر میں خوش و خرم ہوتی۔ اچھا بھلا لڑکا تھا

عبدالرحمن! مجھے تو لگتا ہے ہمیں اس کی آہ لگ گئی ہے۔ آپ نے کس قدر بے عزت کر کے اسے نکالا

تھا!“ اماں جان بیٹی کی تکلیف پر پھٹ پڑیں۔ بابا جان جواب میں بالکل خاموش رہے تھے مجھے لگا

شاید وہ بھی پچھت رہے ہیں۔

☆.....☆

چاند کی آخری تار ٹھیک چل رہی تھیں۔ اپنا بالکل ہی ہوش سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ ایک صبح میری

آنکھ کھلی تو کمرے میں انتہائی وافر مہک رچی بسی تھی۔ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ کمرے کی مدھم سی روشنی

میں مجھے اندازہ ہوا رہا تھا کہ اپنا گہری نیند سو رہی ہیں۔ میں ان کے قریب گئی خوشبو اپنا کے وجود سے

آ رہی تھی۔ میں بھاگ کر ان کے قریب گئی۔ تو دیکھا اپنا کے ہاتھوں پیروں پہ اس قدر خوبصورت مہندی

لگی تھی۔ نقش و نگار بے حد وید و زیب تھے۔ اس کی خوشبو اور رنگ عام مہندی سے بالکل الگ تھا، ایسا

کے وودھیا ہاتھوں میں مہندی بے حد جگ رہی تھی۔

”ایسا! یہ مہندی کیوں لگائی ہے؟“ میں نے انہیں جگانے کی کوشش کی مگر بڑی گہری نیند میں

تھیں۔ میں اماں کو بلا کر لائی تو گھبرا کر رونے لگیں۔ بابا جان بھی گھبراتے ہوئے چلے آئے۔

”شہر بانو یہ مہندی کس نے لگائی ہے؟“ وہ بہت محبت سے پوچھ رہے تھے۔ کافی دیر بعد اپنا نے

آنکھیں کھولیں۔ اپنے ہاتھوں پیروں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

”بابا جان رات کو کچھ لڑکیاں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے مہندی لگائی اور کہا کہ اس چاند کی پہلی تاریخ

کو میری شادی ہے!“ اپنا مدھمکی میں بولیں۔

یہ سن کر ہم دنگ رہ گئے۔ وہ نادریدہ مخلوق کتنے آرام سے ہماری اپنا کو ہم سے دور کر رہی تھی اور ہم بے بس تھے۔

”بابا جان! اپنا کو بچالیں!“ میں روتے ہوئے ان کے سینے سے لگ گئی۔

بابا جان اس واقعے کے بعد بالکل گم صم ہو گئے تھے۔ راتوں کو بھی جاگتے رہتے بے بسی سے صحن میں

کھڑے ہو کر چاند کو تکتے رہتے۔ چاند کے مکمل ہونے میں دو دن رہ گئے تھے۔ بابا جان کی بے چینی

عروج پر تھی۔ انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی اور جلدی گھر آ گئے۔

باروچی خانے میں انہیں دیکھ کر میں بھی ان کے

جیسے شیر دھاڑ رہا ہو۔ بے کی آواز پر اپنا کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ شاہ صاحب پڑھائی کرتے کرتے رک گئے۔ وہ کچھ غدھا ل دکھائی دے رہے تھے، تکلیف ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

''کیا ہوا شاہ صاحب؟'' بابا جان گھبرا گئے۔
''جلیل! کوئی رکاوٹ درپیش ہے۔ بات نہیں بن رہی!'' ان کی بات سن کر بابا جان افسردہ ہو گئے۔ ''اچھا میں ایک نظر نیچی کو دیکھنا چاہتا ہوں!'' شاہ صاحب سنجیدگی سے بولے ان کا لہجہ پر سوچ تھا۔ بابا جان انہیں اندر لے آئے، شاہ صاحب کی آمد پر اپنا کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔
''اچھا نہیں کر رہے تم!'' اپنا مردانہ آواز میں بولیں۔

''اچھا تو یہ بھی اس خبیث کی چال ہے!'' شاہ صاحب نے کہتے ہوئے اپنا کے گلے کا تعویذ اتارنا چاہا تو ایسا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو اپنا کی گرفت کمزور پڑی۔ شاہ صاحب نے تعویذ سامنے رکھ کر پڑھائی شروع کی۔ چند لمحوں میں تعویذ کو آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نا جانے کہاں سے بلا آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خوانخور نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھتا ہوا سامنے آ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہے۔

اس کے یہ تیور دیکھ کر شاہ صاحب جلال میں آ گئے۔ پاس پڑی لوہے کی سلاخ پر پچھ پڑھ کر پھونکا اور اس کی کمر پر دو تین بار اس زور سے ماری کہ وہ تکلیف سے بلبل اٹھا اور دردناک آوازیں منہ سے نکالتا ہوا بے دم ہو کر گر گیا۔

''اصلی شکل میں آجھے بات کرتی ہے تجھ سے!'' شاہ صاحب نے سلاخ سے اسے مارتے ہوئے کہا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلا عبدالرحمن کی شکل اختیار کر گیا خوف سے میری اور امی کی آنکھیں پٹھنی کی پٹھنی رو گئیں۔

''کتنے روپ دھاڑے گا۔ اصلیت تو نہیں بدل

پیچھے گئی وہ کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں چھری تھی۔ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنا کے کمرے کی طرف چل پڑے میں سمجھی کہ وہ شاید وہ کوئی عمل کر رہے ہیں۔ میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی۔

''یا اللہ! مجھے معاف فرما دینا!'' وہ چھت کی طرف دیکھ کر بولے۔

میں چپ چاپ کھڑی ایک باپ کی بے بسی دیکھ رہی تھی، انہوں نے کندھے پر پڑے رد مال سے اپنے آنسو صاف کیے اور اپنا کے قریب پہنچ گئے۔ اپنا بے خبر سو رہی تھی۔ بابا جان نے ان کی پیشانی چومی اور گردن پر چھری چلانے لگے تھے کہ میں نے بھاگ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''بابا جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں!'' میں نے روتے ہوئے ان کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔

''پھر کیا کروں؟ میرے لیے بیٹی کو قبر میں اتارنا آسان ہے مگر اس بد بخت کے حوالے کیسے کر دوں!'' وہ کہہ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ ان کی بے بسی پر میرا دل کٹ رہا تھا۔

اسی اثنا میں اماں جان اندر آئیں۔

''مولوی صاحب مسجد سے بچہ آیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ پیر و مرشد عثمانی صاحب تشریف لائے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں!'' اماں جان نے گویا تن مردہ میں جان ڈال دی۔ بابا جان مسجد کی طرف دوڑے۔ بابا جان گھر آئے تو شاہ صاحب ان کے ہمراہ تھے۔

''دیکھو جلیل! گھبراؤ نہیں۔ ہر تکلیف کے بعد راحت بھی آتی ہے۔ وہ قادر موجود ہے نا وہی ہماری مدد کرے گا!'' انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ صحن میں بیٹھ کر پڑھائی کرنے لگے۔ اپنا جو بے خبر سو رہی تھیں خونخوار انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی حالت جنونی ہو رہی تھی۔ ہم انہیں مشکل سے قابو کر رہے تھے شاہ صاحب مسلسل پڑھائی کر رہے تھے۔ کچھ دیر گزری تو بے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا

سکے گا!" شاہ صاحب بولے۔ عبدالرحمن تکلیف کی شدت نے کراہ رہا تھا۔ اس کی کمر سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر آنکھوں سے ڈھنکی جھٹک رہی تھی۔ میں حیرت کے عالم میں اسے نکلے جا رہی تھی۔

اتنے روپ دھارنے والا عبدالرحمن کون تھا؟
"احسان فراموش، شرم نہیں آئی تجھے اپنے استاد کو تکلیف دیتے ہوئے!" شاہ صاحب غضبناک ہو کر بولے۔

"محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے ورنہ انہیں تکلیف نہ دیتا!" وہ تکلیف سے بولا۔

"یہ محبت ہے تیری، کیا حال کر دیا ہے اس بچی کا۔ اندازہ ہے تجھے اس کی تکلیف کا۔ یہ محبت تو نہیں ہے خود غرضی ہے، خود غرضی، جس نے تجھے اتنا سرکش بنا دیا ہے!" وہ بولے۔

"میں بھی تکلیف میں ہوں۔ یہ میری شادی نہیں ہونے دیتے اس سے نہ ملنے دیتے ہیں۔ اب جو مجھے ٹھیک لگا میں نے کیا اور محبت اور جنگ میں سب کچھ جارت ہے!" وہ انتہائی سرکشی بولا۔ شاہ صاحب خاموشی سے اسے گھور رہے تھے۔

"انسان ہمیشہ ہم سے پیار لے کر ہمیں ہماری محبت چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں اس لڑکی نے بھی مجھ سے وعدہ کیا ہے شادی کا اور ہماری قوم اتنی آسانی سے کسی کو وعدے سے پھرنے نہیں دیتی!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو بتا دو کہ تم کون ہو۔ اگر تمہارا اصل جاننے کے بعد بھی وہ راضی ہوتی ہے شادی کرنے پر تو میں سب کی موجودگی میں تمہارا نکاح اس سے پڑھوا دوں گا!" شاہ صاحب نے کہا۔

"اصل!" عبدالرحمن یہ سن کر سکتے میں آ گیا تھا۔

"لیکن وہ تو محبت میری اسی صورت سے کرتی ہے!" اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"گھبرا کیوں رہے ہو۔ اگر تمہاری محبت اتنی مضبوط اور سچی ہے تو دکھاؤ اپنا اصل روپ!" شاہ

صاحب نے جواب دیا۔
"شاہ صاحب! میں شہربانو کی نظروں میں اپنے لئے نفرت نہیں برداشت کر پاؤں گا۔ مجھے محبت کرنے کی اتنی کڑی سزا تو نہ دیں!" وہ شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔

"ہمیں ہم کچھ نہیں سنیں گے۔ اس لڑکی کو اپنا اصلی چہرہ دکھاؤ ورنہ اس کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے دور چلے جاؤ!" وہ دو ٹوک انداز میں بولے۔ سب اسے بے بسی سے آنسو بہاتا ہوا دیکھ رہے تھے، وہ رو رہا تھا تڑپ رہا تھا۔ مجھے لمحے بھر کے لئے اس پر بہت ترس آیا کہ ایسا کو اس کے حوالے کر دوں۔

شاہ صاحب کے حکم پر میں اور اماں جا کر ایسا کو پکڑ کر لے آئے اور عبدالرحمن کے سامنے بٹھا دیا۔ عبدالرحمن ایسا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا ایسا کو کھنڈو دینے کی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"دکھاتے کیوں نہیں اپنا اصل چہرہ۔ بتاؤ اسے کہ تم انسان نہیں ایک جن زاوے ہو!" شاہ صاحب غصے سے دھاڑے۔

"جن زاوہ!" یہ الفاظ ایسا کی جماعت سے نکلے تو وہ بے ہوش ہو گئیں۔ میں نے اور اماں جان نے خوف سے اپنے چہروں پر ہاتھ رکھ لیے۔ عبدالرحمن بھائی جو ایسا سے محبت کرتے ہیں وہ انسان نہیں ہے۔

عبدالرحمن کی ہتکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے صدمے سے ایسا کے بے ہوش وجود پر نظر ڈالی وہ جس شہربانو سے محبت کرتا تھا وہ تو بے ہوش ہو چکی تھی مگر اصل شہربانو ہوش میں آ چکی تھی۔

عبدالرحمن محبت کی جنگ ہار چکا تھا۔ اس نے ایک غمزوہ نگاہ ایسا پر ڈالی اور غائب ہو گیا اور اس دن کے بعد سے بابا جان نے کسی کو بھی اپنا شاد نہ بنایا تھا۔ سچ ہے آگ واقعی آگ کو نہیں جلا سکتی مگر "آتش محبت" نے ایک جن زاوے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی جو اعتماد کا خون ہوا تھا اس کا کوئی مول نہ تھا۔

☆☆☆

Downloaded From
Paksociety.com

دھڑکی دھڑاک کہانی

ایک راز



مجید احمد جانی

ایک ایسی جتنی شادی کا اجرا جس کے بارے میں آج تک کسی کو کچھ بھی علم نہ ہو سکا مگر

دھڑکی دھڑاک کہانی

کلاس روم سے نکل کر ہم کینٹین پر جا بیٹھیں۔
بھی سہیلیاں اپنے اپنے شہزادوں کے قصے چھیڑ کر
بیٹھ گئیں۔ مجھے انسی نے ہنی ماری۔
”سناؤ انعم! تیرا کیا بنا۔ کہاں تک بات پہنچی۔“

Downloaded From
Paksociety.com

چلتی چلی جا رہی تھی۔ محبوب کو حاصل کرنے کے پلان ترتیب دیے رہی تھی۔ کئی پلان بننے، کئی ٹوٹنے، میں چلی جا رہی تھی۔

کہتے ہیں انسان جن سوچوں میں مگن ہو راستے بھی وہی دیکھتے ہیں۔ بے دھیانی میں مجھے ٹھوکر لگی اور میرے ہاتھوں سے کتابیں بھوٹ گئیں۔ کتابیں سڑک پہ پھری پڑی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر نظریں گھمائی اور جلدی جلدی کتابیں اٹھانے لگی۔ کتابیں اٹھائی تو ایک اشتہار نما پپر بھی میرے ہاتھ لگ گیا۔ جو شاید سڑک کنارے اڑتے اڑتے یہاں تک پہنچا تھا۔

میری نظریں اُس کاغذ پہ جم گئیں۔ کاغذ کیا تھا میری منزل تھی۔ خود کو محبوب کی بانہوں میں جھوٹا دیکھنے لگی۔ اُس پپر پہ تحریر ہی کچھ ایسی تھی۔ کسی عامل نے اپنے عمل کے دعوے کئے تھے۔ من پسند شادی، محبوب قدموں میں، شوہر غلام بنادوں گا۔ ناراضگیاں ختم، راستے کی رکاوٹیں ریت کی دیوار ثابت ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

مجھے کسی اور بات میں دل چسپی نہیں تھی۔ میں تو من پسند محبوب چاہتی تھی۔ جس کو چاہا تھا اُسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ اک نشہ سا سوار ہو گیا تھا۔ اشتہار پہ عامل بابا کا نمبر درج تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عامل بابا کا نمبر ملا دیا۔ تیسری گھنٹی پہ کال ریسیو ہو گئی۔ رُعب دار بھاری آواز میری سماعتوں سے نکرائی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ عامل بابا نے تسلی دیتے ہوئے آستانے پہ بلایا۔ میری آنکھوں میں نشے کی خماری تھی۔ میں اگلے روز کالج جانے کی بجائے عامل بابا کے پاس پہنچ گئی۔

☆.....☆

لوگوں کا کثیر ہجوم تھا۔ مرد و زن اپنی اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔ میں لوگوں کا اتارش دیکھ کر اُس کی گردیدہ ہوئی۔ عامل بابا حجرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے ایک فریادی اندر جاتا اور دوسرے راستے سے نکل جاتا تو پھر اور فریادی

اقصی میری ہم راز تھی۔ میرا عشق اُسی کا مرہون منت تھا۔ قصی، قصی کے بھائی کا مران کے ساتھ پڑھتا تھا اور وہ اکثر اکٹھے دیکھے جاتے۔ قصی کا قصی کے گھر آنا جانا تھا۔ میری پہلی ملاقات قصی سے اقصی کے گھر ہی ہوئی تھی۔

اُس دن اقصی کی سال گرہ تھی اور اقصی نے شاندار تقریب سجائی تھی۔ تمام سہیلیوں اور برادری کو مدعو کیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کیک کٹ چکا تھا۔ موج مستی میں، کولڈرنک کا گلاس ہاتھ میں پکڑے، میں ہجوم سے باہر نکلنے کے لئے پیچھے ہٹی تو قصی سے ٹکرائی۔ پھر کیا تھا۔ وقت ختم سا گیا۔ وہی اک بلبل تھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔ نظریں کیا ملیں، دل بھی مل گئے۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لئے بنے تھے۔ پہلی ملاقات، پیار کی پہلی میزھی ثابت ہوئی۔ میرا جتنا مرنا قصی کے لئے ہو گیا۔ ہر وقت اُسی کے خیالوں میں گم رہتی۔ پڑھنا کم ہو گیا۔ سوچنا زیادہ ہو گیا۔ میں نے پیار کے سببیکٹ جو رکھ لیے تھے۔ آگ دونوں طرف برابر لگی تھی۔ قصی کا دل بھی میرے لیے دھڑکتا تھا۔

ہماری لو اسٹوری کو کئی سال گزر گئے۔ ہم ایک ہو نا چاہتے تھے مگر وہی پرانی باتیں۔ ظالم سماج دیوار بن گیا۔ میرے گھر والے تو مان گئے لیکن قصی کے والدین نہیں مان رہے تھے۔ اُن کا اور ہمارا جوڑ نہیں تھا۔ ہم غریب لوگ تھے اور وہ کھاتے پیتے کروڑ پتی لوگ۔

کورٹ میرج کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں گھر سے فرار ہو سکتی تھی نہ قصی یہ قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ دونوں پر مکی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے اور سوچوں کی وادی میں غوطہ زن تھے۔ ابھی پچھلے ہفتے بھی یہی موضوع زیر بحث رہا تھا۔ اب بھی اقصی نے زخموں پہ نمک پاشی کی تھی۔ میرا موڈ آف ہو گیا اور ہوں، ہاں کرتے کینٹین سے یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”اقصی! تم چائے کے مزے لو میں کلاس روم سے ہو کر آئی ہوں۔“ کلاس روم کیا جانا تھا۔ کالج کا گیٹ ہی کراس کر آئی۔ چھٹی کو دیر تھی۔ گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ میں خیالوں کی دنیا میں مست سڑک کنارے

کر لئے کے لئے موت سے لڑنا تھا۔ مقابلہ سخت تھا اور
میں بھی جذبوں سے سرشار تھی۔

☆.....☆

پلان کے مطابق رات بارہ بجے مجھے قبرستان کی
طرف لٹکنا تھا۔ ڈر بھی تھا اور کام بھی ضروری تھا۔ کسی کو
شریک راز بھی نہیں بنا سکتی تھی۔ مہینے کے شروع کے
دن تھے اور چاند جلدی لٹکتا تھا۔ شروع کے دن مجھے
ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں محبوب کو پانے کے عملیات
کا میاب ہوتے ہیں۔ میں نے مطلوبہ سامان تیار کر
رکھا تھا۔ بس پلان کو پایہ تکمیل تک پہنچانا باقی تھا۔

جیسے ہی رات کے بارہ بجے میں چار پائی سے
اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں خالہ سمیت ان کے خاندان کو
نہایت چالاکی سے دودھ میں خیند آور گولیاں ملا کر پلا
چکی تھی۔ تاکہ میرے گھر سے نکلنے کی کسی کو خبر تک نہ
ہو۔ سبھی بے گلزی کی خیند سو رہے تھے۔ میں چار پائی
سے اٹھی۔ ایک چھوٹا سا کسولہ (چھوٹا پیچہ) اور ایک
چھڑی ساتھ لی اور دبے پاؤں گھر کی دہلیز پار کر گئی۔
باہر گلی میں ہوکا عالم تھا۔ اپنے قدموں کی آواز بھی
ایسے سناؤ دیتی تھی جیسے ذور کسی کی شادی میں ڈھول
پینا جا رہا ہو۔

چلتے چلتے گلی میں گرتے پڑتے آخر میں قبرستان
کے اندرونی دروازے تک پہنچ گئی اور نشانیوں کو دیکھتے
دیکھتے مطلوبہ قبر تک بھی پہنچ گئی۔ ہلکی سی ہوا چلتی تو
جھاڑیاں خوف ناک ارتعاش پیدا کرتی تھیں اور میں
سہم جاتی۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی کوئی جھاڑیوں سے
نکل کر مجھے دبوچ لے گا۔ ڈر سے میرا انداز حال
تھا۔ سارا قبرستان مردوں سے بھرا پڑا تھا اور میں زندہ
جان کے ساتھ اکیلی تنہا رات کی تاریکی میں وہاں
موجود تھی، جہاں دن کو بھی لوگ جاتے ہوئے گھبراتے
ہیں۔ اور میں میرے اعصاب مضبوط تھے۔ میں منزل
پانے کی لگن میں پرامید تھی۔

میں نے تمام تر توجہ اپنے پلان کی طرف مرکوز کی
اور کسولہ لے کر قبر کھودنے لگی۔ مجھے کم از کم دوفت
نیچے تعویذ دفن کرنا تھا۔ میں ارد گرد سے بے نیاز اپنے
کام میں مصروف تھی۔ ابھی ایک فٹ کی کھدائی کی ہو

جاتا۔ دروازے پہ ایک پہرے دار کھڑا تھا جو لوگوں کو
کنٹرول کر رہا تھا۔ آخر میری باری بھی آ ہی گئی۔

اب ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں اکیلی آئی تھی۔ جوان
تھی اور بلا کی خوبصورت بھی۔

عالم بابا کے پاس پہنچی تو اپنا حال بیان کیا۔ بابا
جی نے بھاری فیس کا مطالبہ کیا۔ کچھ تو میرے پاس
تھی۔ جو میری کل جمع پونجی تھی۔ میں نے جمع کروادی
اور باقی چند دنوں میں دینے کا وعدہ کیا۔

بابا جی نے دو تعویذ دیئے۔ ایک اپنی حفاظت کے
لئے بازو یا کمر پر باندھنا تھا اور دوسرا بڑے قبرستان
میں کسی پرانی قبر میں دفن کرنا تھا۔ اور یہ سارا عمل رات
کے وقت کرنا تھا۔ کام مشکل تھا اور میں ٹھہری عورت
ذات۔ مگر کہتے ہیں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا
ہے۔ میرے جذبے جوان تھے۔ اور میں ہر حال میں
محبوب کو پانا چاہتی تھی۔ اس کے بغیر زندگی بے کار
سمجھتی تھی۔ میں نے دونوں تعویذ لئے اور دوسرے
دروازے سے باہر نکل آئی۔

اب مجھے قبرستان میں جا کر پرانی قبر ڈھونڈنی
تھی۔ دو دن اسی کام میں لگ گئے اور پھر شہر کے بڑے
قبرستان میں پرانی قبر کا سراغ مل گیا۔ خوش قسمتی سے
میری خالہ شہر میں رہتی تھی اور قبرستان ان کے گھر کے
بالکل قریب پڑتا تھا۔ میں بہانے سے اپنی خالہ زاد صبا
کو لے کر قبرستان چلی گئی۔ میری نظریں پرانی قبر کو
ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر مجھے ایک پرانی قبر مل گئی۔ جس
کے ارد گرد جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ یہ چچی قبر
تھی۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ کبھی کسی شخص نے اس
طرف زرخ نہیں کیا۔ قبر پہ خشک گھاس پڑی تھی اور مٹی
میں جگہ جگہ مکوڑوں نے گھر بٹا رکھے تھے۔ قبر کے ارد گرد
جھاڑیاں میرے لئے حفاظت کا کام دے سکتی تھیں۔

میں نے ارد گرد کی نشانیاں نوٹ کرنی اور پھر ایک
گھنٹہ قبرستان میں بتانے کے بعد واپس خالہ کے گھر
آ گئیں۔ اب سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ پلان کو
کیسے پایہ انجام تک پہنچایا جائے۔ سوچوں کا سمندر
ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نظروں کے سامنے محبوب کا چہرہ تھا
اور پست پردہ موت ہی موت تھی۔ محبوب کو حاصل

بڑھ کر ایک حسین تھیں۔ اُن کی کہانیاں بھی مجھ سے ملتی
جھٹی تھیں۔ کالا دیو ہر کسی لڑکی سے شادی کا خواہش
مند تھا لیکن سبھی نے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے سبھی قیدی کی
صعوبتیں برداشت کر رہی تھیں۔

دیو کا کہنا تھا جس لڑکی نے مجھ سے شادی کی حای
بھری وہ زندہ سلامت رہے گی باقی تمام لڑکیوں کو شادی
والے دن موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ سبھی زندگی
سے مایوس ہو چکی تھیں اور موت کو سرہانے دیکھتی
تھیں۔ قیدی کی صعوبتیں جھیلنے جھیلنے حوصلے چھوڑ چکی تھیں
اور کوتر کی طرح موت کا انتظار کر رہی تھیں۔ کوتر بھی بی
کو دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے۔

دربان مجھے خاص مہمان سمجھ کر خدمت کر رہا
تھا۔ اُس نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ دربان
میرے والی پیرک پہ پہرا دیتا تھا۔ جس کے ذمے دیو کا کام
سونپ گیا تھا۔ کام کیا تھا مجھے پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں
چند اور دربان اُس کے پاس آکھٹے ہوئے اور گفتگو
کرنے لگے۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑے تھے اور اُن کی
الفاظ میں باآسانی سن سکتی تھی۔ ایک کہہ رہا تھا۔

”شکوف! تہہ خانے والی مورتیوں کو غسل دینا
ہے۔ سردار کا حکم ہے۔ اور اُن کی شادی کے بعد وہ
مورتیاں دیکھیں گے۔“

”کون سی مورتیاں۔ شورے!“

”یار وہ جو تہہ خانے میں سب سے آخری کمرے
میں ہیں۔ اُن میں جو سب سے بڑی مورتی ہے۔ اُسی
میں سردار کی جان ہے۔ مورتیوں کو پچاس سال
ہونے کو ہیں۔ پچاس سال بعد ہی ان کو غسل دیا جاتا
ہے۔ صبح سردار لڑکی سے شادی کر کے اُس مورتی کو
دیکھے گا اور پھر جشن منایا جائے گا۔“

”اچھا؟ اچھا چلیں کرتے ہیں صفائی ستھرائی۔“

میں اُن کی ساری گفتگو توجہ سے سن چکی تھی۔ اب
مجھے اُس مورتی تک پہنچنا تھا جس میں اُس کالے دیو
کی جان تھی۔ خود بھی آزاد ہوتی اور دوسری قیدی
لڑکیوں کو بھی آزاد کروا سکتی تھی۔ میں نے سبھی لڑکیوں
کو اپنے پلان میں شریک کر لیا۔ اُمید کی کرن پا کر سبھی
کے چہرے یہ خوشی کے تاثرات چھا گئے۔ میں نے

گی کہ کسی کے مضبوط ہاتھوں نے میری گردن دبوچ
لی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے تپتا ہوا لوہا میری گردن پہ
رکھ دیا ہو۔ میں نے سر اوپر کر کے گردن دبوچنے
والے کو دیکھنا چاہا۔ جونہی میں نے اوپر دیکھا، میرے
اعصاب کمزور پڑ گئے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ
گئیں۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور رواں
رواں کا پتہ لگا۔ میرے پیچھے قوی بریکل دیو کھڑا
تھا۔ مونے بھینسے جیسی جسامت، ہاتھ پاؤں بھاری
اور کالے بالوں سے اُٹے ہوئے۔ اُس کی آنکھوں
سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے مجھے پھولوں کی
طرح ہاتھوں سے اٹھالیا۔ میرا جسم بے جان سا ہو
گیا۔ میرے رگ و پے سے وحشت ٹپک رہی
تھی۔ میری زبان جھنجھکی اور آنکھیں باہر کو اُبلنے لگی
تھیں۔ میں مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ میں بے آب
مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور اچانک رات کی تاریکی
روشنیوں میں بدل گئی۔ ہر طرف سینکڑوں دیو قطاریں
بنائے کھڑے تھے۔ ایسے جیسے کسی دربار میں غلام سر
جھکائے کھڑے ہوں۔ وہ مسکرا رہے تھے جس کی وجہ
سے اُن کے سفید دانت نظر آ رہے تھے۔ وہاں جشن کا
سماں تھا۔ کئی دیو ناچنے کے انداز میں جھوم رہے تھے
کئی مستی میں سر دھن رہے تھے۔ کئی خوشی و مسرت کے
انداز میں ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ آپس
میں کچھ کہتے جا رہے تھے جو میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

کوئی خاص پارٹی تھی جس کا اہتمام کیا گیا
تھا۔ دیو نے مجھے قید خانے میں قید کروا دیا اور دربان کو
حکم دیا کہ وہ خاص ہے۔ اچھی طرح خیال رکھنا اور
میں کل جب واپس لوٹوں گا تو بڑی دھوم دھام سے
شادی کروں گا۔ یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ میں اس
پہرے مٹا ہوں۔ یہ دوسری لڑکیوں سے ہٹ کر ہے۔ یہ
میری ہم سفر بنے گی۔ اس لئے تمہیں اس کا خاص
خیال رکھنا ہو گا اور ہاں جو کام ذمہ لگایا ہے وہ میرے
آنے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔“

حکم صادر کرتے ہی وہ دیو دربار سے غائب ہو گیا
اور دربان میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ میری
طرح اور بھی کئی لڑکیاں وہاں قید تھیں۔ اور ایک سے

اپنے ساتھ تین لڑکیاں گروپ میں شامل کیں اور باقی کو بیرک میں رہنے کا کہہ دیا۔

شام کو کھانے کا وقت ہوا۔ سبھی کو کھانا دیا گیا۔ کھانے کے وقت بیرک کا گیٹ کھلا تھا۔ دربانوں کے اندر داخل ہوتے ہیں ہم نے بھرپور حملہ کر دیا۔ دربان اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہم انہیں ختم تو نہیں کر سکتی تھیں لیکن مار مار کر ادھ موا ضرور کر دیا تھا۔ اس حملے کے دوران ہم چاروں لڑکیاں وہاں سے نکل گئیں اور باقی لڑکیوں کو اُن کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کا حکم دیا تھا۔

تہہ خانے تک پہنچنے تک بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ڈنٹ کر مقابلہ کرتی گئیں۔ آخر ہم تہہ خانے تک پہنچ گئیں۔ بہت سی مورتیاں بھی ہوئی رکھی تھیں۔ اُن میں ایک مورتی سب سے بڑی تھی اور اُسے خوب سجایا گیا تھا۔ میں بڑی مورتی کی طرف بڑھی اور باقی تینوں سہلیاں چھوٹی مورتیوں کے ساتھ انصاف کرنے لگیں۔

چھوٹی مورتیوں میں دربانوں، اُس کے غلام کی جانیں قید تھیں اور جو نبی قینوں نے مورتیاں توڑنی شروع کیں۔ عجیب سا شور برپا ہوا۔ اتنے میں، میں بڑی مورتی تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے پتھر اُس کی طرف مارنا چاہا تھا کہ ایک بہت بڑا سائب نمودار ہوا۔ وہ وحشیانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ مجھے ڈنٹا چاہتا تھا لیکن کوئی چیز اُس کے درمیان حائل تھی جو اُسے روکتی تھی۔ تب تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو دو تعویذ تھے، ایک قبر میں دفن کرنا تھا دوسرا اپنے پاس رکھنا تھا۔ وہ حفاظت کے لئے تھا اور خوش قسمتی سے میں نے قبرستان میں آنے سے پہلے اُسے اپنے دائیں بازو پہ باندھ لیا تھا۔ شاید اُسی کی وجہ سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ ورنہ ایسے حالات میں تو کئی جان سے چلے جاتے ہیں۔

یونہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرے حفاظت اسی تعویذ کی وجہ سے ہو رہی ہے اور کوئی ناویدہ ہستی میری حفاظت کر رہی ہے۔ میرے اعصاب اور مضبوط ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے میں نے پتھر مورتی پہ دے مارا۔ بے در پے تین چار وار کئے تو مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے

۔ مورتی کے ٹکڑے ہوتے ہی بھونچال آ گیا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں۔ تڑتڑاہٹ جلنے کی بدبو اور پتھروں کے نوٹنے کی آوازیں پھر زور وار طوفان آیا۔ چھوٹی مورتیاں سب ٹوٹ چکی تھیں اور بیرک والی لڑکیاں ہمارے پاس پہنچ گئی تھیں۔ سارے دربان دھواں دھواں ہو گئے تھے۔ نہ اُن کی بقایا جات ملی، نہ کچھ۔ وہ تو جنات میں سے تھے اور جنات کی بقایا جات کہاں سے آئیں۔ ابھی وہ لڑکیاں خوش خبری سن رہی تھیں کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔

جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ہینڈ پہ پایا اور خالہ اور امی میرے سر ہانے بیٹھی سر کو دوبارہی تھیں۔ میرے ہوش میں آتے ہی رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگیں اور میرا ہاتھ چومنے لگیں۔

”تمہیں کیا ہوا تھا بیٹا؟“ امی نے مجھے ہوش میں پا کر تجسس سے سوال کیا۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ میں نے امی کا سوال دہرا دیا۔

”چھٹی رات تم کو قبرستان سے بے ہوش حالت میں گھر لائے ہیں۔ یہ تو بھلا ہوا اُس گورگن کا جس نے ہمیں آکر بتایا۔ تم جھاڑیوں کے قریب قبر پہ اوندھے منہ بے ہوش پڑی تھیں۔“

”اگر تمہیں کچھ ہو جاتا ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہتے۔“ ناں کے لہجے میں مایوسی عنود کرنے لگی۔

”کیا۔ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ مجھے تو کچھ پتا نہیں۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ ٹککنے لگیں اور میں ساری حقیقت سے واقف تھی۔

آج میں صمد کے گھر میں خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز رکھا ہے۔ میں کیا کرنے چلی تھی اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ صرف بھری یادیں ہیں۔ میرے علاوہ کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ میری شادی صمد کے ساتھ کیسے ہوئی۔ یہ ایک راز ہے اور راز ہر کسی پہ آشکار نہیں ہوتے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com



تیسری ہولناک کہانی

گاؤں والا مندر

نزہت جبین ضیاء

رشتوں کو دمنے والے اس چاچا کا قصہ جس نے اپنے بچے پر کالام کرنا شروع کر دیا تھے

”پتر بس جو فیصلہ میں نے اور تیرے بابا نے کر لیا وہی صحیح ہے ہاں تیرے بابا اور غفور کی آپس میں بات ہو گئی اور سنجیدہ بہت خوب صورت ہے بالکل چاند کے جیسی۔ بس تو سمیرا کو بھول جا آئی سمجھ۔“ اماں نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ برسوں سے سمیرا کو ہی اپنا ہمسفر سوچا تھا اور اب جب کہ شادی میں کچھ دن رو گئے تو اماں نے یہ خبر سنا دی۔ اس وقت چھٹی ملنا بھی مشکل تھا۔ اور اماں کی بات بھی ہمیشہ سے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔

”میں تو صیف احمد اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہم لوگ اندرون پنجاب کے چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ میرے بابا نے کھیتی باڑی کر کے مجھے مشکل سے میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ قسمت اچھی تھی کہ شہر میں مجھے ایک آفس میں معمولی جاب مل گئی۔ میری خالہ کی بیٹی سمیرا جو ہمارے گاؤں میں ہی رہتی تھی۔ اس سے بچپن سے میرا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ اماں، بابا کو میری شادی کا بڑا ارمان تھا اور اب میری شادی میں کچھ دن باقی تھے تو اماں نے یہ کیسی خبر سنا دی تھی۔ اگلے ہفتے تو مجھے چھٹی ملے گاؤں آنا تھا۔ شادی کے لیے

اماں کے فون نے مجھے ہلا کر رکھا تھا۔ اب جب کہ میری شادی ہونے والی تھی تب ہی اماں نے یہ کیا انکشاف کر دیا تھا کہ سمیرا پر آسیب کا سایا ہو گیا ہے۔ وہ بالکل بھی اپنے آپ میں نہیں۔ اس کے اندر کوئی طاقت داخل ہو چکی ہے جس نے اس کو اپنے بس میں کر رکھا ہے اور میں نے تمہارا اور میرا کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔“

”ارے اماں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ صبر کرتیں۔ کسی عامل کو بنوا کر ہم اس کا علاج کروائیں گے۔ سمیرا اور میں بچپن سے منسوب ہیں اور اس طرح سے اس سے رشتہ کر دینا اچھی بات نہیں۔ میں گاؤں آ رہا ہوں ہم مل کر اس کے لیے کچھ کریں گے۔“

”ناگل مت بن پتر! تو ہمارا کلا کلا پتر ہے اور میں اپنے پتر کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ ہاں تو پریشان نہ ہو میں نے تیرے لیے چاہے غفور کی بیٹی سنجیدہ کو پسند کر لیا ہے۔ تیری شادی وقت پر ہوگی پتر مگر..... میرا سے نہیں بلکہ سنجیدہ سے۔“

”ارے اماں! چاہے غفور سے تو بابا کا جھگڑا تھا سالوں سے اور..... اور..... میں نے سنجیدہ کو دیکھا بھی نہیں۔“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شادی کے لیے لیا ہوا مختصر سامان بیک میں ڈالا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ بس میں بیٹھا سارا راستہ میں سمیرا کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

جب میں سڑک پر اترا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ سرد ہوا میں اور گاؤں کی کھلی فضا کے ٹھنہرتے ماحول نے میرا استقبال کیا۔ بس سے اترتے ہی میری رگوں میں برف جیسی ٹھنڈک اتر گئی۔ گرم کمرے کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر میں نے بیک کاندھے پر ڈالا اور گھر کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر تیز تیز چلنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے احساس ہوا کہ واقعی میں نے اس وقت آنے کا فیصلہ کر کے غلطی کی ہے۔ میں اس اندھیری رات میں سنسان راستے پر چلنے لگا۔ گاؤں میں ویسے بھی رات جلد ہو جاتی ہے۔ اور سردیوں میں تو ویسے بھی لوگ سرشام گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ راستے اور گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ میں تیز تیز چل رہا تھا تب مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ ساتھ کوئی میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ انجانے قدموں کی چاپ محسوس کر کے میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا مگر اندھیری رات میں اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا کبھی کبھی چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلتا تو ہلکی سی روشنی ہو جاتی۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ دفعتاً مجھے لگا جیسے

اور..... اور..... یہ سب کچھ۔
”ایک طرف سمیرا کے بارے میں یہ سن کر دل بہت دکھی ہو رہا تھا تو دوسری طرف میں سنجیدہ کو لے کر پریشان تھا۔ جہاں تک میرے علم میں تھا میرے بابا نے میری چاچی ”غفور چاچا کی بیوی“ پر غلط نظر رکھی تھی جس پر بابا اور چاچا کو جھگڑا ہوا اور دونوں میں دشمنی ہوئی۔ غفور چاچا ہم لوگوں کا گاؤں چھوڑ کر پاس والے گاؤں میں چلا گیا اور کچھ عرصے بعد سنا کہ چاچی نے اپنی ایک سالہ بیٹی کو چھوڑ کر خودکشی کر لی مگر اس وقت بھی بابا اور اماں غفور چاچا سے نہیں ملے اور اتنے عرصے بعد آج غفور چاچا کی بیٹی سے میری شادی ہونے جا رہی تھی۔ یہ تو گھر جا کر پتا چلنا تھا کہ بابا اور غفور چاچا کیسے ملے؟“

”دسمبر کی وہ سرد ترین ننھرتی ہوئی رات تھی جس رات میں نے گاؤں کے لیے رخصت سفر باندھا۔ حالانکہ میرے دوستوں نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ گاؤں کا راستہ خطرناک ہے۔ رات کا سفر مشکل ثابت ہوگا۔ مگر نہ جانے میرے دل میں کیا سمایا کہ میں نے اس وقت سفر کا سوچا۔ شہر سے گاؤں تک آنے میں تین گھنٹے کا سفر تو تھا پھر میں راستے سے میرے گھر جانے میں بھی اچھا خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ درمیان میں قبرستان اور دور پرانا کھنڈر جیسا مندر بھی پڑتا تھا۔ میں نے شہر سے

میرے کانوں میں پھر جیسی جھنجھٹا ہٹ ہو رہی ہے میں نے سر پر اوٹی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ کانوں کی جانب گیا میں نے آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا قبرستان کے ساتھ ہی گورکن کا بنا چھوٹا سا مکان بھی مکمل اندھیرے کی لپیٹ میں تھا جب کہ دور مندر میں دیا جتنا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کبھی بھی اس مندر میں دیا جلتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ مندر کیا تھا نوٹا پھوٹا اور آسیب زدہ سا کھنڈر لگتا تھا۔ کبھی کبھی بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ اگر اس طرف آتا تو اماں سے بڑی مار کھاتا تھا۔ نوٹی ہوئی دیواروں اور بنا چھت کا یہ مندر اور اس میں جلتا زرد سا دیا عجیب سا ماحول بنا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میری رفتار مزید تیز ہو گئی۔ دفعتاً مجھے لگا میرے قدم زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ میں نے قدم بڑھانا چاہا مگر..... لاکھ کوشش کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تب میں نے دیکھا میرے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہے میں نے گھبرا کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی پہلے رنگ کے لمبے سے جسے میں مہوس کمزور اور ضعیف سا شخص تھا۔ جس کے گال چمکے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے پتے سیاہ اور لبوترے چہرے پر عجیب قسم کی وحشت تھی۔

"آپ..... آپ کون ہیں؟" میرے سوال پر وہ زور سے ہنسا۔

"مجھے نہیں پہچانا پتر میں تیرا چاچا غفور ہوں۔ تیرے باپ نے مجھے تجھ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔"

"غفور چاچا آپ....." میں اس بوڑھے سے لپٹ گیا مگر دوسرے لمحے میں نے اس کو خود سے الگ کر دیا۔ اس کے جسم سے عجیب قسم کی غلیظ بدبو آرہی تھی۔ قابل برداشت بدبو۔

"مگر میں تو اچانک آیا ہوں اور اس وقت باپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے سوال کیا۔

"بابا میں چھوڑ پتر جلدی جلدی چل تیری ماں اور بابا انتظار کر رہے ہیں۔" بوڑھے نے میری بات نظر انداز کی اور میرا ہاتھ تھام کر تیز تیز چلنے لگا۔ جیسے ہی اس

نے میرا ہاتھ تھاما مجھے لگا جیسے میا ہاتھ کسی ہستی شکنجے کی زد میں آگیا ہو۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ تو اس سے پہلے کہ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا میرے دوسرے ہاتھ کی طرف بھی مجھے کسی کا احساس ہوا دیکھا تو ایک خوب صورت سی لڑکی تھی۔ سفید اور کالے لباس میں، کالا دوپٹہ سر پر ڈالے ہوئے تھی۔ دوپٹے کے نیچے سے نظر آتے ہوئے لمبے لمبے بال جن میں چمک نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جو اندھیرے میں بھی واضح نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور میں..... میں اس کے سحر میں بے خود ہونے لگا تھا۔

چاچا یہ..... یہ کون ہے؟" میں نے پلٹ کر بوڑھے سے سوال کیا۔

"ارے بھئی! میری بیٹی ہے سنجیدہ دیکھ یہ بھی آگئی تجھے لینے۔ چل جلدی سے گھر چلتے ہیں۔"

"واو! اماں نے صحیح کہا تھا۔ سنجیدہ واقعی خوب صورت تھی۔ مگر اس وقت چاچا کو سنجیدہ کو لے کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں یہ سوچنے لگا تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہوں۔ میرا وجود ہوا میں معلق ہو گیا ہوا اور میں بالکل ہلکا سا ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر زمین کی طرف دیکھا تو خوف وحشت سے میری آنکھیں پھٹنے لگیں۔ ہلکی چاندنی میں مجھے زمین پر ریت جتنے بے شمار چھوٹے بڑے سانپ نظر آرہے تھے۔ میں اس وقت اکیلا تھا۔ نہ جانے غفور چاچا اور سنجیدہ کہاں چلے گئے تھے۔ وہ مندر پرانا ویران اور کھنڈر جیسا مندر جس کے پاس سے گزرتے ڈر محسوس ہوتا تھا میں اسی مندر کے اندر کھڑا تھا۔ بنا چھت اور ٹوٹی ہوئی بوسدہ دیواروں والے مندر میں میں کیسے پہنچا میرا دماغ ماؤف ہوئے لگا میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں، میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

"چاچا، چاچا میں نے آواز لگائی۔"

"بابا بابا" خوفناک قہقہے کی آواز پر گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا تو ایک عجیب و غریب منظر میرا منظر تھا۔ غفور چاچا کی جگہ ایک خوفناک شکل والا آدمی کھڑا تھا۔ کالا سیاہ لمبے لمبے چمکیلے دانت، بڑے بڑے ہاتھ اور لمبا

ترنگا جس کے وجود سے وہی غلیظ بدبو آ رہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے محسوس کی۔ دوسری جانب سنجیدہ کی جگہ..... اف خوف سے میری کھنکھاہٹ بندھنی اتنی خوفناک عورت۔ یقیناً وہ چڑیل تھی۔ قصے کہانیوں میں پڑھ کر اور سن کر جو دماغ میں چڑیل کا نقشہ تھا بالکل وہی لمبے لمبے بال خوفناک بڑا سا چہرہ لال انگارہ باہر کو نکلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، لمبے لمبے دانت آگے کو نکلی ہوئی غیر معمولی تھوڑی، لمبے لمبے ناخن اور منہ سے بہتا ہوا خون میری رگوں میں خوف منجمد ہو گیا۔ اتنی سرورات میں میرا سارا وجود پسے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے دل میں قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دیں۔

”آؤ بار اتیوں! دیکھو آج ہماری شادی ہے یہ دولہا ہے۔ منتر پڑھو۔“

وہ خوفناک چڑیل آگے بڑھی اور میرا ہاتھ اپنے سخت کمر درے اور غلیظ ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے قد کے بونوں جیسے انسان نکل آئے ویسے ہی خوفناک چہروں والے جنہوں نے آتے ہی عجیب و غریب آوازوں میں چیخنا شروع کر دیا ساتھ ہی رقص کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا بد شکل آدمی جو کونے میں بیٹھا تھا اس کے پاس بے شمار کھوپڑیاں رکھی تھیں لمبی داڑھی والا وہ خوفناک بوڑھا ہاتھ میں لمبا سا خنجر لیے زور زور سے کوئی عمل پڑھ رہا تھا اس کے چپکے خنجر سے خون ٹپک رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی کو قتل کیا ہو اس کے سامنے ہی تڑپتی ہوئی کھوپڑیاں نظر آئیں۔

”چلو ادھر آؤ“ وہ خوفناک چڑیل میرے مزید قریب آگئی اچانک ایسے لگا جیسے زلزلوں کے جھٹکے آرہے ہوں بوسیدہ دیواریں لرزنے لگیں خوفناک بونوں کی چیخوں میں مزید اضافہ ہو گیا پھر دیواروں سے خون بہنے لگا جیسے کہ پسینہ آتا ہو۔ ہر طرف خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ یہاں تک کہ میرے پیر بھی خون کے اندر بہنے لگے مجھے گھسیٹ کر وہ عورت خنجر والے بوڑھے کی طرف لانے لگی میں نے اپنی پوری قوت سے خود کو روکنے کی کوشش کی دفعتاً وہ بوڑھا جو غنور

آپے سے باہر ہو گیا میں چیخنے لگا۔

”تم لوگ کون ہو؟ کیوں مارا میرے اماں بابا کو؟“

آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”بابا بابا۔“ خنجر والے بوڑھے نے قبضہ لگا لیا ساتھ ہی دوسرا بوڑھا وہ چڑیل اور وہاں موجود بونے بھی قبضہ لگانے لگے۔ پورا عالم، دیواریں، زمین اور ہر طرف سے خوفناک اور موت کے کھیل میں جو کچھ دیکھ رہا تھا میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ پھر اچانک سب کچھ ساکت ہو گیا۔ قبضہ ختم گئے ماحول پر سکوت سا چھا گیا اور وہ چڑیل جو میرے سینے پر بیٹھی تھی مجھ پر جھکتی چلی گئی۔ اس کے نشتر جیسے ناخن میرے بازوؤں میں پھوست لگے اور اس کے لمبے لمبے دانت میری گردن کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سب بے سود۔ سب ناکام ہو چکی تھیں اس غیر انسانی وجود نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ بس میرے لب پر آیت الکرسی تھی اور میں بے بس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کانٹوں جیسے لمبے لمبے دانت میری گردن میں پھوست کر دیئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے آگ کے جلتے ہوئے انگارے میری گردن سے ہوتے ہوئے میرے پورے جسم کے اندر تک پھیلتے چلے گئے میں لاغر ہوتا گیا اور ساتھ ہی مجھے لگا جیسے میرا دم آخر آ پہنچا۔

☆.....☆

مجھے غور سے دیکھتے ہوئے اماں کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”نہیں نہیں بابا..... میں ٹھیک ہوں مجھے ابھی بتائیں کہ کیا ہوا تھا اور یہ غفور چاچا والی کیا بات ہے اور..... کیا ان کی موت ہوئی؟ اماں نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا۔“

”ہاں پتر ہم غلط تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ غفور کے دل میں ہم سب کے لیے اتنی نفرت ہے اور وہ اتنا گر جائے گا۔ وہ ہم سے ملا بھی تو اس کے پیچھے اس نے بہت خوفناک اور خطرناک منصوبہ بنا رکھا تھا اس نے برسوں پرانی دشمنی یوں نکالی کہ سمیرا پر پہلے غلط عمل کروا کر اس پر جنات کو قابض کروا دیا اور پھر تیرے لیے اپنی بیٹی کا پیغام دے دیا۔ سمیرا کی حالت اتنی خراب تھی کہ ہم نے رشتہ توڑ کر سنجیدہ سے تیری شادی طے کر دی۔ سمیرا کے باپ نے شہر سے کسی عامل کو بھرا کر عمل کروایا تو پتا یہ چلا کہ یہ کسی نے گندہ عمل کروایا ہے اور دو دن پہلے غفور پرانے مندر کے پاس بیٹھا اپنی بیٹی کے ساتھ آخری عملیات کر رہا تھا کہ وہ عامل صاحب وہاں پہنچ گئے۔ گاؤں کے اور لوگ بھی ساتھ تھے، میں بھی تھا۔ وہاں پر عامل صاحب اور غفور کا ٹکراؤ ہو گیا اور اس کا سارا عمل الٹا ہو گیا اور سب نے دیکھا کہ اس وقت غفور اور اس کی لڑکی سنجیدہ تڑپ تڑپ کر خون کی الٹیاں کر کے مر گئے۔ ہم نے سوچا تو آئے گا تب ہی تجھے سچائی بتائیں گے۔“

”اُف!“ میں نے سر ہٹا کر لیا۔ ”مطلب غفور چاچا اور سنجیدہ کی روح بھٹک رہی تھی۔ ان کو سکون نہیں ملا تھا اور مٹا بھی کیسے ایسے لوگوں کا تو انجام ہی یہی ہونا چاہیے۔“

میں نے سوچ لیا کہ شادی کے بعد اماں، بابا اور سمیرا کو نے کر شہر ہی چلا جاؤں گا۔ اصل بات میں جان بوجھ کر چھپا گیا تھا۔ کیونکہ اماں نے کہا تھا کہ آج پھر شہر سے وہ بزرگ آئیں گے اور ہم سب کے لیے حفاظت کے تعویذ لائیں گے۔ مجھے تو سے زیادہ اللہ پر بھروسہ ہے کہ وہ مارنے والے سے بہت بڑا ہے مجھے اس نے ہی بچایا ہے۔ ورنہ اب وہ گاؤں والا مندر تو چاچا غفور اور سنجیدہ نے اپنی گندی آتماؤں سے آباد کر ہی لیا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو گھر کے کھلے صحن میں چار پائی پر پایا۔ ذہن میں سب کچھ آگیا۔ مجھے لگا شاید میں مر گیا ہوں۔ تب ہی اماں اور بابا کو خود پر جھکا دیکھا۔ اماں کی آنکھ سے آنسو میرے گالوں پر گر رہا تھا۔

”پتر.....! میرا پتر تو ٹھیک ہے ناں۔ طبیعت خراب تھی تو کیوں آیا تھا پتر۔ اتنا تیز بخار ہے تجھے راستے میں مندر کے پاس بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ تو اتفاق سے تیرا بابا وہاں چلا گیا ورنہ تو میرا پتر نہ جانے کب تک بزار رہتا۔“ اماں دیوانہ وار مجھے چومتی ہوئی پیار کرتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

”اُف وہ سب کیا تھا؟“ میں نے اپنے پھوڑے کی طرح دکتے بازو کی طرف دیکھا۔ وہاں پر واضح زخم کے نشان اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”پتر لینا رہ! ابھی تو بخار ہلکا ہوا ہے تیرا۔“ بابا نے مجھے لٹاتے ہوئے کہا۔

”اماں..... اماں..... رات کو غفور چاچا.....“

”نام نہ لے بیٹا اس کم ذات کا۔ اس نے دشمنی بھی کی تو ایسی کہ اسے بھائی کہتے شرم آتی ہے۔“

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی بابا نے مجھے روک دیا۔ ”اچھا ہوا ناں برے کا انجام برا ہی ہونا تھا۔ تو صیف کے بابا دیکھو اللہ نے کیسا بدلہ دیا۔ اس کو کیسی موت ملی ہے خدا دشمن کو بھی ایسی بد موت نہ دے تو یہ تو بہ میرے تو روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ اماں کی بات پر میں اچھل گیا۔ یہ بابا اور اماں کیسی باتیں کر رہے تھے۔

”ہاں دونوں باپ بیٹی جہنم رسید ہو گئے تو صیف کی ماں! دیکھو ایک معصوم کے ساتھ زیادتی کر کے کیا ملا۔ رسوائی بھی اور ذلت والی موت بھی۔“

”باپ اور بیٹی!“ میں پلنگ سے اچھل کر گرنے ہی والا تھا۔ ”ابھی رات کو تو مجھے دونوں ملے تھے لیکن..... لیکن.....!“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”چپ کر جا تو صیف کی ماں دیکھ تو تو صیف کی طبیعت خراب ہے۔ ہم بعد میں بتائیں گے۔“ بابا نے



چوٹھی ہولناک کہانی

خواب کے زخم



صداقت حسین ساجد

اُس ڈاکٹر کی وہشت ناک پہتا جواک ایسے جس جڑے کے ہتھے بچہ گیا جس کی روانا زہار خون نمی

بارش کا طوفان رکسنے والا نہیں ہے۔ بار بار آسمانی بجلی کے نڑکنے سے کچھ دیر کے لیے ہر طرف روشنی ہو جاتی

کافی دیر سے جاری موسلا دھار بارش نے اب طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لگ تو یوں رہا تھا کہ یہ



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



تھی۔ ابھی وہ کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر اتنے زور سے دستک ہونے لگی کہ گنا تھا کہ اس نے دروازہ جلدی سے نہ کھولا، تو دستک دینے والا اسے توڑ دے گا۔

”اس طوفانی بارش میں بھلا کون آ سکتا ہے؟ شاید کوئی مریض ایسا ہو جس کی حالت بہت نازک ہو۔“

یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ بجلی زور سے کڑکی اور اس کی نظر سامنے موجود درخت پر پڑی، جس کی ایک شاخ پر بیٹھا الوداعی گھوڑا تھا۔ ابھی وہ الو کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے ایک آواز سنائی۔

”ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے..... ڈاکٹر صاحب!“

اس نے چونک کر سامنے دیکھا، تو اس کے سامنے ایک لمبا بڑا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس آدمی کا چہرہ اسے الو کی طرح لگا۔ چہرے پر کڑھکی چھائی ہوئی تھی۔ اپنی طرف ڈاکٹر کو متوجہ دیکھ کر وہ ایک مکروہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر مسکرانے لگا۔ اس کے سامنے والے اوپر کے دانت کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ وہ ایک بار پھر مخاطب ہوا۔

”ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ چلیے..... آپ کی بہت مہربانی ہوگی..... کیوں کہ ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔“

اب جو ڈاکٹر نے مزید غور کیا، تو وہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا، کیوں کہ اس پر اس طوفانی بارش کا ذرہ بھر بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا لباس بالکل خشک تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے پیچھے نظر دوڑائی، تو اسے کوئی سواری دکھائی نہ دی۔ ڈاکٹر نے اس آدمی کو پہلے اس گاؤں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے خوف کو وہم جانا اور سر جھٹک دیا۔

”مریض کو کیا ہوا ہے؟“

”اس کا تو مجھے پتا نہیں..... لیکن وہ ہے بہت

تکلیف میں۔“

اس نے اس خوف کو اپنا وہم سمجھ کر جھٹک ڈالا، لیکن دل تھا کہ عجیب سے انداز میں دھڑکے جا رہا تھا۔

”آپ تھوڑا انتظار کریں..... میں اپنا بیگ اٹھا لوں اور کار باہر نکال لوں۔“

”ٹھیک ہے..... ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر واپس پلٹا۔ اپنا بیگ اٹھایا اور اپنی کار نکال کر اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گیا، حالانکہ اس کا دل تو بہت کر رہا تھا کہ وہ انکار کر دے، لیکن وہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے یہ پیشہ اپناتے ہی اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ وہی انسانیت کے کام آئے گا اور کبھی کسی مریض کو واپس نہیں بھیجے گا۔

ڈاکٹر کا نام ظہور تھا۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس گاؤں میں آئے ہوئے اسے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اس کے باقی گھر والے تو شہر میں رہتے تھے، جنہیں ملنے کے لیے وہ پندرہ دن کے بعد تین چار دن کے لیے شہر چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ظہور نے راستے میں اس شخص سے پوچھا۔

”آپ کہاں رہتے ہیں، کیوں کہ آج سے پہلے

میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔“

”اس گاؤں کے باہر جو ایک سفید مکان ہے

وہاں!“

”ہاں! میں نے دیکھ رکھا ہے۔“

”ہمیں وہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔“

جس طرح کا وہ خود کرخست تھا، اسی طرح اس کا

لبہ بھی کرخست تھا۔

”لیکن وہ مکان تو کب کا خالی پڑا ہے اور ایک

بات اور بھی ہے.....“

”کیا بات؟“

”اس میں تو کوئی بھی رہنا پسند نہیں کرتا۔“

”اسی لیے تو ہم وہاں آکر بس گئے ہیں۔“

”اس مکان کے بارے میں تو عجیب سی باتیں

سننے کو ملتی ہیں۔“

”سب جھوٹ ہے..... ہمیں تو ایسا کچھ محسوس

نہیں ہوا۔“

ڈاکٹر ظہور کے ذہن میں ابھی تک اس کا وہ جملہ گونج رہا تھا۔

”ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے۔“

اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک بار پھر بجلی زور سے کڑکی، تو کچھ دیر کے لیے ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ ڈاکٹر ظہور نے اس آدمی کو دیکھا، تو اس کا دل ایک بار پھر ان جانے خوف سے لرزنے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوگی۔ وہ حیران تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالاں کہ پہلے بھی وہ کئی بار اجنبیوں کے ساتھ دور دراز کے علاقوں میں آدمی رات کو بھی جا چکا تھا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، جو آج ہو رہا تھا۔

میں منٹ کے بعد وہ اس سفید مکان کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازے کے قریب ایک درخت تھا۔ ڈاکٹر ظہور نے اس کے نیچے اپنی کار کھڑی کی اور اپنا بیگ اٹھا کر اس شخص کے ساتھ مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ طوفانی بارش اسی طرح جاری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے آسمان پھٹ بڑا ہو۔ تیز ہوا کے جھکڑوں میں خود کو سنبھالنا بہت مشکل تھا، لیکن عجیب بات تھی کہ اس لمبے ترنگے شخص پر اس طوفانی بارش اور ہوا کے تیز جھکڑوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر اس الو کی شکل والے شخص نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ مکان کی اوپر والی منزل سے کسی کے میڑھیوں سے نیچے اترنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر کسی نے دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر کو ایک عجیب سی ناگوار بو محسوس ہوئی۔ دروازہ جس نے کھولا تھا وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر دھک سے رہ گیا۔ بڑھیا کی شکل بھی بے حد مکروہ تھی۔ اس کے بال یوں تھے، جیسے کسی چڑیا کا گھونسلا ہو۔ اس کی حالت سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو۔

والد کے جانے بعد

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا

مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے

تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی

وہ جھوٹا تھا

مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک

میں جو بھی دیکھتا ہوں سوچتا ہوں

وہ وہی ہے

جو ہماری ٹیک ٹامی اور بدنای کی دنیا تھی

کہیں کچھ بھی نہیں بولا

تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں

میں کہنے کے لیے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں

تمہیں جیسا ہوا میں اپنی ہی کرسی پہ پاتا ہوں

شاعر: ندا فاضلی

ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگی، جس سے اس کے دانت دکھائی دینے لگے۔ اس کے لمبے دانتوں کی نوکیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تیز دھار خنجر ہوں۔ ڈاکٹر کو گہرا ہٹ محسوس ہونے لگی۔ بڑھیا کے ہاتھ میں موم بتی تھی۔ ڈاکٹر کو ایک عجیب سی بات کا احساس ہوا، تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ موم بتی پر طوفانی بارش کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا شعلہ بالکل سیدھا تھا۔ بڑھیا نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے مکان کا دروازہ ایک زور دار دھماکے سے بند ہو گیا۔ مکان جتنا باہر سے بوسیدہ دکھائی دے رہا تھا، اندر سے اتنا برا نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ جس کمرے میں کھڑا تھا، وہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اس کے ساتھ چار کمرے تھے۔ حویلی کے دروازے کے پاس ہی سے سیزھیاں اوپر کی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ اس ہال میں زیادہ تر لکڑی کا سامان تھا۔ فرنیچر کافی بوسیدہ لگ رہا تھا۔ ایک طرف ایک ٹیبلے میں

کو کئے دھک رہے تھے۔ انگلیٹھی کے اوپر دیوار پر دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں توجہ سے دیکھا، تو یہ اسی جوزے کی تھیں۔ یہ ان کی جوانی کی تصویریں تھیں۔ اب تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔

بڑھیا نے ڈاکٹر کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود اس شخص کے ساتھ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ بہت خوف ناک دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان سے پوچھا۔

”مہربانی کر کے مجھے بتائیے کہ مریض کون ہے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ مرو نے کہا۔
”کیونکہ مجھے اس طوفانی بارش میں واپس جانا بھی ہے۔“

اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ یوں لگا کہ جیسے قیامت آگئی ہو۔ ہوا کے جھکڑوں نے اور تیزی اختیار کر لی۔ پورے مکان کے در و دیوار ہلنے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر کی نظر ان دونوں پر پڑی، تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، کیوں کہ ان کی شکلیں خوف ناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ان کے پیروں پر پڑی، تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے تو جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ ان کے پیر پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے اور ناخن ایک ایک انچ کے قریب بڑھے ہوئے تھے۔ اسے خون اپنی رگوں میں جتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ کانو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جواب دے گئیں۔ اس کا بس چلتا، تو وہ کب کا یہاں سے بھاگ جاتا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اٹھ نہ سکا۔ لگتا تھا کہ کسی ماورائی طاقت نے اسے صوفے کے ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ ڈاکٹر نے سنا کہ بڑھیا اسے مخاطب کر کے کچھ کہہ رہی ہے۔ اس نے غور کیا، تو اسے اس کے الفاظ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگے۔ اس کی بات سن کر وہ لرز کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر! مریض اصل میں ہم ہی ہیں اور

پتا ہے۔“
”کیا پتا ہے؟“
”ہماری دوا کیا ہے؟“
”کیا ہے؟“

”ہماری دوا خون ہے۔ جس کے بغیر ہم زیادہ عرصہ تک نہیں جی سکتے۔“
”کیا؟“

”ہا ہا ہا..... ہو ہو ہو..... ہی ہی ہی.....“
اچانک بڑھیا بھیا تک آواز میں قہقہے لگانے لگی۔ اب وہ اس شخص کے ساتھ اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ لگتا تھا کہ اس میں ہلنے چلنے کی ذرا سی بھی طاقت نہ رہی ہو۔ اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی، لیکن وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اچانک ایک دھماکا ہوا اور پورا کمراندھیرے میں ڈوب ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دو سائے بالکل اپنے پاس دکھائی دیے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش کرتا، اچانک اس کی گردن میں کوئی نوک دار چیز چبھی۔ تکلیف اس قدر تھی کہ اس کے ہوش جاتے رہے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اسے سب واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ کمرہ پھر روشن ہو چکا تھا۔ بارش کا زور نوٹ چکا تھا۔ اس نے چونک کر سامنے باہر کی طرف دیکھا، تو اچھل پڑا۔ وہ دونوں اب جوان ہو چکے تھے، جس طرح کے وہ تصویروں میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت وہ اوپر والی منزل پر جانے کے لیے بیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر کو اپنے جسم سے سارا خون نچڑا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ انھیں شاید ڈاکٹر کے ہوش میں آنے کا پتا نہیں چلا تھا، اس لیے اس نے جیسے سے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش

کی، لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اسے اندر کی طرف کھینچ سکتا۔ دروازے میں لگی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابھی اس نے کارٹارٹ کی ہی تھی کہ وہ دونوں پیچھے چلاتے اس کی طرف بھاگے۔ وہ یوں اس کی طرف بڑھ رہے تھے، جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے آرہے ہوں۔ ان کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ ڈاکٹر کو پتا تھا کہ اگر اس بار اس نے حوصلہ چھوڑ دیا، تو بچ نہیں پائے گا۔ اس نے کارموڑ کر بھگا دی اور ساتھ ساتھ آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ جوں ہی اس نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کی، وہ دونوں یوں فضا ہی میں ترپنے لگے، بیسے انھیں آگ لگ گئی ہو۔ ڈاکٹر نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اندھا وحش اپنی کار بھگاتا رہا۔ وہ گھر کے پاس پہنچا، تو کار اس کے قابو سے نکل چکی تھی۔ ایک زوردار دھماکے سے وہ درخت سے جا ٹکرائی اور ڈاکٹر کے ہوش جاتے رہے۔

☆.....☆

جب اسے ہوش آیا، تو وہ ایک نرم بستر پر لینا تھا۔ اس کے سامنے اس کا دوست وقاص کھڑا تھا، جو اس گاؤں میں اس کا واحد دوست تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”مم..... مم..... میں اس وقت کہاں ہوں؟“

”تم گاؤں سے قریبی شہر کے ہسپتال میں ہو۔“

”ہسپتال میں؟“

”ہاں!“

”لیکن کس لیے؟“

”حادثے کی وجہ سے تمہارا خون بہہ گیا تھا۔“

”حادثہ..... کیسا حادثہ؟“

”تمہاری کار درخت سے ٹکرائی تھی۔“

یہ سنتے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

”اوہ!“

”تھوڑی دیر اور ہو جاتی، تو تمہارا بچنا محال تھا

..... ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی؟“

”کس بات کی؟“

”کہ اس طوفانی بارش میں تم جا کہاں رہے

تھے؟“

وقاص کی بات سن کر ڈاکٹر نے اسے ساری بات

بتا دی۔ یہ سب سن کر وقاص زور سے ہنس کر کہنے لگا۔

”ظہور! تم نے کوئی خوف ناک خواب دیکھا

اور خوف زدہ ہو کر کار میں بیٹھ کر کہیں جانے لگے ہو

مگے پھر کار بے قابو ہو کر درخت سے جا ٹکرائی.....“

”نہیں..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”دوست! وہ مکان تو کب کا خالی پڑا

ہے۔ اب اس میں کوئی نہیں رہتا۔ تمہیں غلط

فہمی ہوئی ہے۔“

ڈاکٹر نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش

کی، مگر وقاص شہ مانا۔ وقاص نے اسے اطمینان

دلانے کے لیے دو بندے بھیجے، جنہوں نے

واپس آ کر بتایا کہ سفید مکان تو ویسے کا ویسا بند

پڑا ہے اور اندر سارے کمروں میں جالے لٹکے

ہوئے ہیں۔ ہر طرف گرد ہی گرد پڑی ہے

۔ اب اسے خاموش ہی ہونا پڑا۔

ڈاکٹر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ رات کو جو کچھ اس

نے دیکھا ہے، وہ ایک خواب ہے، لیکن مکان کی جو

حالت اب اسے بتائی گئی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ

واقعی اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اسی

خواب سے خوف زدہ ہو کر وہ کار میں جا بیٹھا اور یہ

جان لیوا حادثہ ہو گیا۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ تن درست ہوتا چلا گیا۔ وہ

ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر چلا گیا۔ وہ اس واقعے کو

سرے سے ہی بھلانا چاہتا تھا۔ دوسرے دن جب

اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور اس کی نظر اپنی

گردن پر پڑی، تو خوف سے لرز اٹھا۔ اس کی گردن

پر اب بھی دو گہرے زخم تھے، جن میں خون جما ہوا تھا

۔ یہ زخم خواب کے تو نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب

تھا کہ اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ

یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔

☆.....☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



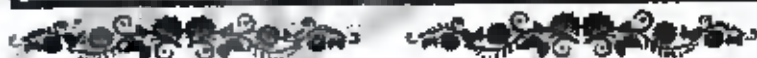


پانچویں ہولناک کہانی



سید وجاہت علی

اُس نوجوان کی ناقابل فروش داستان جس نے جن کے بچوں کو جوڑ کر اپنے دیکھا اور پھر



میری آنکھ مھلی۔ لائٹ جانے کی وجہ سے گرمی لگی تو میں بے دار ہو گیا تھا۔

میں اُنھ کے بیٹھ گیا۔ برابر میں لیٹے کڑن کو دیکھا۔ وہ بہ دستور محو استراحت تھا۔ لائٹ کے چلے جانے سے اُس دھٹی کی نیند میں ذرا بھی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ اُس کے خراٹوں کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ میں نے موبائل ٹارچ آن کی اور چھت کا رخ کیا۔ سارے زینے عبور کرنے کے بعد چھت پر قدم رکھا۔ اُس وقت کوئی بھی وہاں نہیں تھا کیوں کہ رات گیارہ بجے کے بعد لائٹ آ جاتی تھی تو سب واپس اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ اوپری زینا چھوڑتے ہوئے اور چھت پر قدم رکھتے ہوئے میری نظر سناٹے چھت کی منڈیر پر پڑی تو وہاں کا منظر دیکھ کے میں دھک سے رہ گیا تھا۔

چھت کی منڈیر پر دو لڑکے کراٹے لڑ رہے تھے۔ دونوں نے کراٹوں کا مخصوص سفید لباس پہن رکھا تھا اور جیسی چن جیسی مہارت اور ہاؤ ہو کی آوازوں کے ساتھ وہ باہم دست و گریباں تھے۔ یہ تین منزلہ عمارت کی منڈیر تھی۔ کوئی انسان کا بچہ جسے اپنی

منظر بڑا خوفناک اور روکنے کھڑے کر دینے والا تھا۔ میرے جسم کے سارے بال بول کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور ایک سرد لہر پورے وجود میں اوپر سے نیچے تک دوڑ گئی تھی۔

یہ مٹی کا اوائل تھا اور گرمیوں نے ابھی سے اپنا اشتعال ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مزید برآں لوڈ شیڈنگ۔ سب زچ ہو گئے ہی رہ گئے تھے۔ دن میں تو بہر حال لوڈ شیڈنگ برداشت کرنا تھی لیکن شام کے وقت یا شب میں چھت ایک اچھا آپشن تھا۔ میں ان دنوں نانی کے گھر آیا ہوا تھا۔ پیپرزدے کے فارغ ہوا تھا اور ذہنی طور پر تازہ دم ہونے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ عموماً کراچی میں دن میں ہوا کچھ کچھ بند ہوتی تھی لیکن شام کے وقت جنوبی سمت میں سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا بڑی راحت بخش تھی۔ لائٹ چلی جاتی تھی تو سب چھت پر آ جاتے تھے۔ موسم اور نیوڈ شیڈنگ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور نفسیاتی کمی بڑی حد تک دور ہو جاتی تھی۔

اُس رات وہ تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا جب

Downloaded From Paksociety.com

سے میرا دل ہڈیوں کا پنجرہ توڑ کے باہر آ جائے گا۔
میں نے بھاگنا چاہا تو ان میں سے ایک گونجتی ہوئی
آواز میں بولا۔

"آؤ... ہمارے ساتھ کراٹے لڑو..."

میں نے سن رکھا تھا کہ عموماً جنات میں شرارت
کا مادہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور اگر وہ جن زادے تھے
تو شاید وہ اس وقت میرے ساتھ بھی شرارت کرنے
کے موڈ میں تھے۔

لیکن اُس لمحے مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا کہ میں
جیسے میکا کی انداز میں چلتا ہوا آگے آیا اور جست
لگا کے منڈیر پر چڑھ گیا۔ یہ یقیناً خود کشی کے
مترادف تھا لیکن اس لمحے شاید میں اپنے آپ میں
ہی نہ رہا تھا۔ ایک رو بوٹ سا بن گیا تھا جو ریموٹ
کنٹرول کے اشارے پر چلتا ہو مگر اس سے قبل کہ
کھیل شروع ہوتا، میرے ذہن میں ایک جھماکا
سا ہوا اور جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں آیت الکرسی
کا ورد کرنے لگا اور جھلاٹک لگا کے نیچے اتر آیا اور

بڈیاں تڑوانے اور جان سے جانے کا شوق نہ ہو،
تین منزلہ عمارت کی منڈیر پر کراٹے لڑنے یا اچھل
کود کا محض سوچ سکتا تھا، عملاً یہ کام پاگل پن کی حدود
میں آتے تھے۔ پھر وہ دونوں کون تھے؟ یقیناً کوئی
ما فوق الفطرت شے تھے کیونکہ اول اگر وہ ماموؤں
کے بچوں میں سے ہوتے تو اندھیرے میں بھی میں
انہیں پہچان لیتا۔ دوم یہ کہ کسی ماموؤں کا کوئی بچہ
کراٹے نہیں جانتا تھا اور جانتا بھی ہوتا تو اتنی اونچی
بلڈنگ کی منڈیر پر اتنی سرعت، اتنی مہارت سے لڑنا
ناممکن تھا۔ پہلے پہل ایک لمحہ کے لیے تو میں سوچ میں
پڑ گیا کہ جو منظر میں دیکھ رہا ہوں، آیا یہ ایک مسکھکہ خیز
منظر ہے یا خوفناک؟ لیکن جب وہ دونوں کراٹے
چھوڑ کے میری جانب دیکھنے لگے تو مجھے ایسا محسوس
ہونے لگا جیسے میرے جسم کے ہر خلیے میں ٹائم بم رکھ
دیے گئے ہوں جو اگلے لمحے پھٹنے والے ہوں۔ اُن
کے چہرے عجیب سے تھے۔ وہ میری جانب دیکھ کے
قہقہے لگانے لگے اور مجھے محسوس ہوا کہ مذہبت کی وجہ

دوبارہ ہوش آیا تاہم میرا خیال ہے کہ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آیا تھا تو سب میرے ارد گرد جمع تھے اور اُن کی تشویش و تحیر سے لبریز لگا ہیں مجھ پر مکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا بیٹا شعیب...؟؟ تم نے کیا دیکھا ہے چھت پر...؟؟"

"وہ... وہ چھت پر... وہاں دو لڑکے... تین تین لڑکے... مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید بخار چڑھ گیا تھا۔"

"چھت پر تو کچھ نہیں ہے بیٹا... سب سے بڑے ماموں نے میری تردید کرتے ہوئے مجھے دلا سہ دیا۔" ہم دیکھ آئے ہیں چھت پر۔ کچھ بھی نہیں ہے شعیب بیٹا وہاں...

لیکن میں نے انہیں دھیرے دھیرے ساری بات بتائی تو اُن سب کی فکر اور خوف میں اضافہ ہو گیا اگرچہ وہ سب اس واقعے کو میرا وہم ہی قرار دے رہے تھے اور دوبارہ کئی بار چھت کا دورہ کر آئے تھے۔ اُن میں سے کسی نے وہاں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ سب نے مجھے بھی دوبارہ چھت پر چلنے کی رائے دی تا کہ میرا "وہم" دور ہو جائے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس کے بعد دو دن تک میں بخار میں مبتلا رہا۔ بخار اُترتا تو میں مزید وہاں نہیں رکا اور اپنے گھر آ گیا۔

☆.....☆

جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا اُسے میں ہرگز اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا تھا لیکن اُس واقعے کی کوئی عقلی توجیہ کرنا بھی ممکن نہ تھی۔ نانی کے گھر والے وہاں عرصہ دراز سے رہ رہے تھے اور ایسا واقعہ کسی کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ ان سب نے تو اُسے میرا وہم ہی ٹھہرایا لیکن ایسا نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فی الواقع میرا کمر اُس غیر انسانی مخلوق سے ہوا تھا۔ وہ تینوں جن زادے تھے یا کوئی اور مافوق الفطرت مخلوق تھے؟ صرف وہ تینوں ہی وہاں بیٹھا کیے ہوئے تھے یا اُن کی تعداد زیادہ تھی؟ وہ اتفاقاً یا عارضی طور پر وہاں آئے تھے یا مستقل انہوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا؟ یہ

تیزی سے زینے کی طرف بڑھا۔ دونوں میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن اُن کے وحشت ناک، اعصاب شکن قہقہے جاری تھے۔ میں نے زینے پر قدم رکھا تو ایک اور حواس کھو دینے والا منظر سامنے تھا۔ بیڑھیوں پر سے ان کی طرح کا ایک اور لڑکا یا مخلوق کرائے کے سفید لباس میں چھت کی جانب آ رہا تھا۔ مجھے نیچے کی جانب جاتا دیکھ کے وہ بولا۔

"کہاں جا رہے ہو ڈیر...؟"

اس کی آواز میں بھی ایک گون اور وحشت سی تھی لیکن میں اسے نظر انداز کرتا پاگلوں کی طرح اور بہت تیزی سے اس کے برابر سے گزرتا ہوا دو دو تین تین بیڑھیاں بیک وقت پھلانگتا ہوا زینے سے نیچے آ گیا۔ مجھے اس طرح جانا دیکھ کے وہ بھی ان دونوں کی طرح ہنسنے لگا اور اُن کے پر ہول قہقہے مجھے اپنے پیچھے آتے محسوس ہوئے۔ آسمان پر ایک کے بعد ایک آتے جاتے بلکے بھورے بادل ان بادلوں کی اوث میں چھپتے جھانکتے چاند اور ستارے اور اُن مافوق الفطرت مخلوقات کے خوفناک قہقہے... بڑا وحشت ناک سماں تھا۔

میں سیدھا نیچے کمرے میں آ کے رکا۔ سانس لوہار کی دھوکائی کی طرح پھل رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ہزار فرلانگ کا سفر دوڑتے ہوئے طے کر کے آیا ہوں۔ توپ کے دھماکوں کے شور سے بھی نہ جا گئے والا میرا کزن حیرت انگیز طور پر پیدا رہ گیا تھا۔ وہ میری اس کیفیت کو دیکھ کے متحیر رہ گیا۔

"کیا ہوا شعیب...؟؟" کاشف نے تعجب سے استفسار کیا۔ "تم ہانپ کیوں رہے ہو...؟؟"

"وہ... وہ... جج... چھت... چھت پر... بس میرے منہ سے اتنا ہی نکل سکا اور میں چکرا کے گر پڑا۔ ایسا لگا جیسے حواسوں پر اندھیرے چھاتے جا رہے ہوں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

بالکل درست اندازہ تو نہیں کہ کس وقت مجھے

حکمت والا قول

ایک مرتبہ شیخ سعدی بازار میں چلے جا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے کسی کو بہترین قسم کے خربوزے فروخت کرتے دیکھا۔ ان کے دل میں خربوزے کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ نفس نے ان سے کہا کہ کسی رشتے دار سے قرض لے کر خربوزے خرید لو، چنانچہ آپ اپنے ایک رشتے دار کے پاس پہنچے لیکن قرض مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ نے سوچا کہ میں یہ قرض دینے سے انکار نہ کروں۔ نفس پکارا۔ ”اگر اس سے قرض لینا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے سے لے لو۔“ آپ کو اس کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ نفس پھر پکارا کہ چلو، کسی ایسے رشتے دار سے لے لو جو بہت قریبی ہو اور انکار نہ کرے شیخ سعدی اب اپنے نفس سے یوں مخاطب ہوئے۔ ”تم سے زیادہ قریبی رشتے دار میرا کون ہو سکتا ہے؟ آج تم ہی مجھے اوحار دے دو۔“ اور یوں وہ خربوزے خریدے بغیر ہی چلے گئے۔

حسن انتخاب: محمد قاسم خان بلوچ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ایکا ایک بایک میرے برابر میں آرکی۔ اس پر تین لڑکے سوار تھے اور پیچھے دو لڑکوں کے ہاتھ میں ریو الورتھے جو انھوں نے بڑی سرعت سے میرے پہلو میں لگا دیے تھے۔

اب ساری صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ وہ مو بائل چھیننے والے لئیرے تھے اور میرے ساتھ بھی وہ یہی کچھ کر رہے تھے۔

ان میں سے تیسرے نمبر والے نے میری جیبوں پر ہاتھ مارا اور بیچ میں بیٹھا شخص درشت لہجے میں بولا۔

”جو کچھ ہے خاموشی سے نکال دے۔۔۔“ اس کے لہجے میں درشتی کے ساتھ بد تمیزی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ”ورنہ ساری گولیاں اتار دوں گا تیرے جسم میں۔۔۔“

لیکن پھر اس لمحے جو کچھ ہوا بہت عجیب تھا۔

سب سوالات اپنی جگہ تھے اور ان کا جواب معلوم کرنا بھی اہم تھا مگر یہ بات میرے نزدیک طے شدہ تھی کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ نظر کا دھوکا یا خیالات کی پرفریب تجسیم نہیں تھی بلکہ فی الحقیقت ایسا ہوا تھا۔

بہر حال اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ میں اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ ایام کی گردنے واقعے کی تازگی کو کہیں زور نہ دیا تھا۔

☆.....☆

لیکن پھر ایک روز ایک تعجب آمیز بات ہو گئی۔ اس رات میں اپنے دوست وقار کے گھر سے واپس آرہا تھا۔ میں وقار کے گھر عموماً بایک پر آتا ہوں لیکن دراصل اس وقت میں رات کا کھانا کھا کے گھر سے نکلا تھا۔ ارادہ چہل قدمی کا تھا اس لیے بایک نہیں اٹھائی تھی۔

میں وقار کے گھر پہنچا تو عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ ہم دونوں نے قریبی مسجد میں نماز ادا کی۔

ملاقات کے بعد میں نے اس سے رخصت کی اجازت لی اور واپس چل پڑا۔ اگرچہ وقار نے مجھے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی تھی لیکن مجھے اسے زحمت دینا اچھا نہیں لگا۔

گھر تک کا راستہ پندرہ منٹ کا تھا۔ میں شارٹ کٹ لیتے ہوئے اس راستے پر مزگیا جہاں لوگوں کی اتنی آمد و رفت نہیں تھی۔ روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ مو بائل وغیرہ چھیننے کا خدشہ رہتا تھا اس لیے راہ گیر اس راستے سے اجتناب کرتے تھے لیکن میں اس راہ پر قدم ڈال چکا تھا۔ سڑک اس وقت سنسان ہی تھی۔ اکا دکا کہیں کوئی لامٹ جلتی نظر آ رہی تھی جس کی کرنیں اندھیروں کے سامنے مغلوب ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔

جب میں سڑک کے وسط میں پہنچا تو ایک بارگی بایک کا شور سنائی دیا جو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا یعنی بایک اس سمت میں آرہی تھی جس جانب میں گامزن تھا۔

میں چلتا رہا۔ آتی ہوئی بایک کے شور میں اضافہ ہوتا گیا۔

"بھائی ہمیں معاف کر دو..." وہ گھٹکیا ہے۔"
ہمیں معاف کر دو... ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اب کسی
کو نہیں لوٹیں گے۔ ہمیں چھوڑ دو بھائی..."

"چھوڑنے کی التجا تو وہ لوگ بھی کرتے ہوں
گئے جن کی تم حلال کمائی لوٹتے ہو لیکن اس وقت
تمہیں ان پر ترس نہیں آتا... اب تم پھنس گئے ہو
مکافات عمل میں... انھوں نے گولی چلا دوں گا..."
چارونا چاروہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر اس معاملے کا منطقی انجام کیا ہوا؟ وہ ایک
انگ داستان ہے۔ اس سے قطع نظر میرے لیے
حیرت انگیز امر یہ ہے کہ میں یکا یک کراٹوں کا ماہر
کیسے بن گیا تھا؟ اس وقت جس مہارت سے میں
نے لیروں کا مقابلہ کیا تھا وہ اس شخص کے لیے نا
ممکن تھا جو کراٹوں سے نابلد رہا ہو اور حقیقت یہ ہی
تھی کہ نہ مجھے زندگی میں کراٹوں کا کوئی شوق رہا تھا
نہ کبھی میں نے یہ فن سیکھا تھا۔ چنانچہ یہ سوال کہ
مجھے خود بہ خود کراٹے لڑنا کیسے آگئے بڑے اچھے کا
عث تھا۔ اس چھت والے واقعے سے قبل میری
ایک آدھ دفعہ دو دو لڑائیاں بھی ہوئی تھیں جن میں
مجھے شکست ہوئی تھی لیکن اس مذکورہ واقعے کے بعد
میں یک دم لڑائی بھڑائی کے اس کھیل کا ماہر بن گیا
تھا۔ کیا اس حیرت انگیز واقعے کا اس رات والے
واقعے سے جب میرا کراٹا ان تین غیر انسانی لڑکوں
سے ہوا تھا کوئی تعلق ہے؟ ان لیروں سے نپٹنے کے
بعد میں نے کچھ لوگوں سے جو کراٹوں کے فن سے
نہ صرف واقف تھے بل کہ مثالی حد تک مہارت بھی
رکھتے تھے سے نبرد آزما کی بھی کی۔ انھوں نے تین
دفعہ مجھ سے مقابلہ کیا اور تینوں دفعہ وہ ہار گئے یعنی
ان لیروں کو شکست دے دینا اتفاق نہ تھا بل کہ فی
الحقیقت مجھے کراٹوں کا فن آگیا تھا۔

میرا ان غیر انسانی مخلوقات سے ٹکراؤ اور اس
کے بعد میرے اندر کراٹے لڑنے کی اہلیت پیدا ہو
جاتا بہت حیرت انگیز ہے اور یہ حیرت ہمیشہ مجھے
گھیرے رہے گی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس لحاظ سے مجھ میں نہ جانے کس طرح ایک توانائی
سی بھرنی اور یہ خیال میری سوچوں میں جاگزیں ہو
گیا کہ میں کراٹے جانتا ہوں اور وہ تینوں میرے
ایک ہاتھ کی مار ہیں۔

میں تقریباً پانچ فٹ فضا میں اوپر اچھلا اور میری
دونوں لپٹیں ان دونوں کے سینوں پر پڑیں۔ یہ ان
کے لیے قطعی غیر متوقع حادثہ تھا۔ ان تینوں لیروں
کو یہ شائبہ بھی نہیں نہیں گزرا ہو گا کہ دو ریوالور
برداروں کی موجودگی میں کوئی اس طرح مزاحمت
کرے گا۔ وہ بوکھلا ہی گئے۔ ریوالور ان کے ہاتھوں
سے نکل کے زمین پر گر گئے تھے اور وہ دونوں بھی
بانیک کے دوسری طرف لڑھک گئے تھے۔ اس
صورت حال میں پہلے لڑکے نے جو بانیک چلا کے
لاپا تھا اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے
دام میں ہاتھ کی پھنسی سے اس کی گدی پر وار کیا اور
بانیک ہاتھ سے وہ ریوالور جھپٹ لیا جسے نکال کے وہ
مجھ پر فائر کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں وہ دونوں سنہل
جگے تھے اور اپنے ریوالوروں کی طرف لپک رہے
تھے۔ یہ دیکھ کے میں نے ان کے ساتھی کو اٹھا کر ان
پر دے مارا۔ اس سے قبل مجھ میں اتنی طاقت اور
جھلک نہیں تھی لیکن اس وقت نہ معلوم کس طرح مجھ
میں اتنی قوت اور مہارت آگئی تھی اس وقت میں
خود اپنے آپ پر حیران ہو رہا تھا۔

میں نے پیر کی شوکر سے دونوں ریوالور دور کر
دیے اور اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور ان پر تان
لیا۔

"اب تمہیں پتا چلے گا کم نصیبوں..." میں نے
ایک ایک لٹ ان تینوں کے رسید کرتے ہوئے لب
کشتائی کی۔ وہ تینوں اب کچھ کرنے کی پوزیشن میں
نہیں تھے۔ حیرانی پریشانی اور سرسیمکی کی کیفیت
میں مجھے دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کی مخلوق کو لوٹتے ہو نا حق پریشان کرتے
ہو... انھو... چلو تھانے۔ اب تھانے دار تمہارا بھرتہ
بنائے گا اور اگر تھانے دار نے تمہیں چھوڑ دیا تو میں
تمہاری سلا ضرور بنا دوں گا..."



زہر گھرا انتقام

ہنسٹ حوا

اولاد انسان کی ہو یا جانور کی پیاری سب کو ہوتی ہے اتفاقاً ہونے والے حادثے نے

جہاں ایک کی جان بچائی دوسرے کو موت دے دی

جو کہیں کہیں جلتے بلب کی وجہ سے تھوڑی بہت روشنی ہوتی ہے وہ بھی لوڈ شیڈنگ کی نظر ہو چکی تھی، گاؤں میں ابھی صرف چوہدری کے گھر ہی یو پی ایس کی

عشاء کی نماز ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا، ایک تو ویسے ہی اس وقت تقریباً سبھی لوگ اندھیرے کمروں میں نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں اور



سہولت موجود تھی باقی گھروں میں اب بھی لالین یا موم بتی سے کام چلا لیا جلتا تھا۔ انور سردی کے باعث بستر میں دبک گیا ساتھ میں اس کا تین سالہ بیٹا حسن اس کی بغل میں گھسا کہانی سنانے کی ضد کر رہا تھا اس کی بیوی عذرا بھی فارغ ہو کر اپنی چار پائی پر جا لی تھی۔

”بس کر حسن اپنے ابا کو تنگ نہ کر آ میں سناتی ہوں تجھے کہانی“ عذرا نے حسن کو بہلا کر پاس بلانے کی آخری کوشش کی۔

”نہیں مجھے ابا سے ہی سنتی ہے بس“ اس ڈر سے کہ کہیں اس کی ماں اسے اٹھا کر اپنے پاس نہ لے جائے وہ ضدی لہجے میں کہتا انور سے اور بھی زیادہ لپٹ کر لیت گیا۔ ”یا اللہ آج تو سردی کی انتہا ہو گئی ہے“ عذرا نے کپکپاتے لہجے میں کہتے ہوئے لحاف کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا پھر بھی سردی محسوس ہوتی رہی تو اس نے سر بھی لحاف میں کر لیا۔ انور نے حسن کو کہانی سنانا شروع کر دی اور وہ ہمیشہ کی طرح کہانی کے ہر فقرے پر سوالات کرنے لگا۔ عذرا کچھ دیر پاپ پیٹنے کی باتیں سنتی رہی پھر نیند کی وادی میں اترتی چلی گئی۔ لحاف کی گری، باپ کے پیار اور شفقت بھری پناہ میں آکر حسن بھی زیادہ دیر قیامت سے جنگ نہ کر سکا اس کی طرف سے کوئی سوال نہ ہونے پر انور خاموش ہو گیا اس نے مسکراتے ہوئے حسن کے ماتھے کو چوما اور پھر خود بھی سونے کا ارادہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے میں جلتی کوئلے کی انگیٹھیں کی ہلکی روشنی کمرے کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی تینوں نفوس گہری نیند میں تھے جب اچانک بیرونی دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ ”اکی خیر اس وقت کون آیا ہوگا“ عذرا پریشانی سے کہتی ہوئی بے اختیار بستر پر اٹھ بیٹھی۔ انور بھی جاگ چکا تھا اتنے میں ایک بار پھر دستک ہونے لگی۔

”سو جا تو میں دیکھتا ہوں جا کر“ انور چادر لپیٹتا باہر کی طرف لپکا جاتے جاتے اس نے میز پر رکھی نارنج بھی اٹھائی۔

”ذرا دھیان سے۔“ عذرا کی فکر میں کوئی کمی نہیں آئی تھی وہ ابھی تک چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی

بلکہ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بھی انور کے ساتھ باہر جا کر دیکھے کہ اتنی رات کو کون آیا ہے مگر وہ جانتی تھی انور کو اس کا اس طرح اتنا پریشان ہونا برا لگے گا اسی لیے وہیں بیٹھ کر انور کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ نارنج کی روشنی میں انور دروازے کی طرف جا رہا تھا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے سائیڈ پر پڑی ہوئی کلپاڑی اٹھا کر مضبوطی سے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی، ملکی حالات کا تقاضا تھا کہ محتاط رہا جائے۔ انور صحن میں آیا تو سردی کی لہر اسے اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ شدید سردی اور اندھیرے نے مل کر ماحول کو خاصا پر سرار بنا دیا تھا لیکن گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ عام بات تھی ہاں البتہ اگر کوئی اجنبی اس وقت وہاں آ نکلتا تو ایک بار تو ضرور ماحول کے اثر میں آکر سہم ہی جاتا۔ دروازہ اب بھی اتنی ہی شدت سے بجایا جا رہا تھا۔

”آ رہا ہوں بھائی صبر کر“ انور نے زور سے آواز لگائی لیکن شاید اس کی آواز باہر تک نہیں پہنچی تھی دستک اسی طرح جاری تھی۔ انور کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی اس نے لمبے لمبے قدموں سے جلدی جلدی بڑا سا صحن پار کیا اور ہوشیار رہتے ہوئے باہر کا دروازہ کھول دیا۔

”کون ہے؟“ اس نے نارنج کی روشنی ادھر ادھر گھماتے ہوئے سوال کیا، کوئی جواب نہ پا کر دروازے کے باہر ادھر ادھر تھی دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔

”عجیب بات ہے کون تھا اور چلا کیوں گیا وہ بھی ایسے اچانک“ وہ کچھ لمحے اور وہاں کھڑا دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا ابھی وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ اسے اندر سے عذرا کی چیخ سنائی دی وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگا لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے اندر کوئی چور ڈاکو نہیں تھا بلکہ وہ ایک بڑا سا سانپ تھا جو صحن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انور دیوانہ وار چیختا ہوا کلپاڑی کا دار کرنے کے لیے سانپ پر جھپٹا لیکن وہ لمحوں میں نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا، بجلی آچکی تھی انور اور عذرا

نے بلب جلا کر کمرے کا ایک ایک کونہ چھان مارا مگر وہاں کوئی سانپ دکھائی نہ دیا۔ عذرا محسن کو سینے سے لگائے سہمی ہوئی نگاہوں سے کمرے میں ہر طرف دیکھ رہی تھی جبکہ انور بھی خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا، اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائی صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ اس نئی مصیبت نے ان کے ذہن سے دروازے پر ہونے والی دستک کا خیال نکال دیا تھا، باقی کی رات ان دونوں نے جاگ کر ہی گزاری کمرے کا بلب بھی رات بھر جلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ دونوں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے پھر اپنی اپنی سوچوں میں کھو جاتے۔

☆.....☆

اگلے دن ایک بار پھر سارے گھر میں بڑی باریک بینی سے سانپ کی تلاش کی گئی تھی اور اس کے نہ ملنے پر وہ دونوں کچھ سکون محسوس کرنے لگے تھے۔ عذرا رات بھر جانے کون کون سی سورتیں پڑھ پڑھ کر گوشت میں سوئے محسن پر پھونکتی رہی تھی دن نکلتے ہی اس نے چاول پکا کر بچوں میں تقسیم کیے تھے یہ ایک طرح سے خدا کا شکر ادا کرنے کا اس کا طریقہ تھا۔ محسن پر سے صدقے بھی اتارے گئے اور سرے کی سلائی سے اس کے سینے پر دل کی جگہ کاٹا مار کر نظر بند سے بچانے کی تدبیر بھی کر لی گئی تھی۔ ان سب حفاظتی انتظامات کے بعد وہ پرسکون ہو گئی تھی وہ جو ایک خوف سادل کو جکڑے ہوئے تھے اب غائب تھا شام تک وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی گھر گریستی میں مشغول ہو چکی تھی۔

☆.....☆

”کیا بات ہے انور تو کچھ پریشان لگ رہا ہے، گھر پر سب خیریت تو ہے نا؟“ اگلے دن کھیتوں میں دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے تو نور اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ نور محمد عرف نور کا دوست ہی نہیں سا جھے وال بھی تھا۔ دونوں اپنے گھر میں اکیلے تھے کھیتوں میں کام کرنا ایک اکیلے انسان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ کھسکے بھی ہر انسان کی زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے، دونوں کے کھیت ایک دوسرے سے ملے

ہوئے تھے۔ ایک ون مشورے سے دونوں نے فیصلہ کیا کہ آج سے وہ دونوں مل کر ساری زمین پر کھیتی باڑی کریں گے اور جو ملے گا اسے آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ آج تین سال ہونے کو آئے تھے انہیں اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا تھا، دونوں ایک دوسرے کے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ نور و چارون سے شہر گیا ہوا تھا اس کی بیٹی کا بخارا ترے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ گاؤں کی ڈسپنسری سے دو تین بار ووا لینے پر بھی جب آرام نہ آیا تو وہ بیوی بچوں کو لے کر شہر اپنی سالی کے گھر چلا گیا تھا آج صبح ان کی واپسی ہوئی تھی گاؤں پہنچتے ہی وہ کھیتوں میں چلا آیا تھا اور دونوں صبح سے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ نور و کے بار بار پوچھنے پر انور نے اس رات کا سارا قصہ اسے کہہ سنایا۔

”عجیب بات ہے اتنی سڑی میں سانپ نکلتے تو نہیں ہیں ویسے، اور پھر اس کا اس طرح غائب ہو جانا“ نور و بھی حیران تھا۔

”اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے نور و کہ اس سے پہلے ایک اور سانپ بھی نکلا تھا میرے گھر سے۔ اسے بھی میں نے محسن کے پاس دیکھا تھا“ انور نے مزید بتایا۔

”یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے؟“ نور و نے چونکتے ہوئے دریافت کیا۔

”جس صبح تو شہر کے لیے نکلا تھا اسی ون کی بات ہے، تیری بھابی نے مجھے سویرے گھر کا کچھ ضروری سامان لانے کے لیے کہا تھا۔ میں پہلے کھیتوں پہ رہا اور جب سورج نکل آیا تو سوچا جا کر گھر سامان وے آؤں۔ میں سامان لے کر گھر پہنچا تو محسن کی ماں صحن میں کپڑے دھو رہی تھی۔ میں نے محسن کے بارے میں پوچھا تو بولی کمرے میں کھیل رہا ہے۔ میں نے سوچا محسن کے لیے جو منہائی لایا ہوں وہ خود ہی اسے دے دیتا ہوں بہت خوش ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر میں اندر گیا اور میں نے دیکھا محسن موڑھے پہ بیٹھا ہے، لیوی پر کارٹون لگے تھے۔ وہ انہی کو دیکھنے میں مگن تھا اور اس کے موڑھے کی دائیں طرف ایک سانپ تھا محسن کو

”ذکیرہ انور پہلی بات تو یہ کہ تیرا گھر گاؤں کے بالکل کونے میں ہے یعنی گاؤں کے باقی گھروں سے کافی ہٹ کر ہے۔ ایسے میں اگر گاؤں میں کسی کورات کے اس نام کوئی ضرورت بھی ہوتی تو وہ اپنے ارد گرد کے گھروں میں جاتا نہ کہ اتنی دور تیرے گھر جاتا اور پھر فرض کرو کسی وجہ سے چلا بھی گیا تھا تو تجھ سے بات کیسے بنا واپس کیوں چلا جاتا؟“ انور کی بات نے انور کو بھی سوچ میں ڈال دیا لیکن اسے اب بھی دسک اور سانپ کے درمیان کوئی تعلق دکھائی نہ پڑ رہا تھا۔ انور کا گھر آگیا تھا وہ اللہ حافظ کہتا انور سے جدا ہو گیا اور انور اکیلا اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ جہاں اس کی بیوی اور بیٹے کی صورت میں زندگی بائیں پھیلائے اس کی نظر تھی۔

☆.....☆

اس کے بعد کئی سارے دن یونہی گزرتے چلے گئے انور اور عذرا بھی اس بات کو بھول بھال گئے لیکن اچانک ایک دن پھر ایسا واقعہ ہوا کہ وہ بھولی ہوئی بات پھر سے سوالیہ نشان کی صورت ان کے ذہنوں میں خوف پھیلاتے گئی۔ اس روز رات بھر کھیتوں پر رہنے کی باری انور کی تھی۔ صبح سویرے انور نے اس کی جگہ ڈیوٹی سنبھال لی اسی لیے وہ بہت سویرے ہی گھر سے نکل گیا تھا، عذرا بھینسوں کا دودھ دودھ کر فارغ ہوئی تو دودھ کی بالٹی سائیڈ پر رکھتے ہوئے اس کی اچھتی سی نظر صحن کی طرف اٹھی تھی اور پھر وہیں جم کر رہ گئی تھی، صحن میں بڑا سا سانپ رہنکھتا ہوا صحن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ عذرا نے چاہا کہ وہ بھاگ کر صحن کے پاس پہنچے لیکن خوف کی شدت نے اس کے قدموں کو زمین سے جکڑ کر رکھ دیا تھا پھر ایک عجیب بات ہوئی عذرا کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ وہاں سے غائب ہو گیا اس کے غائب ہوتے ہی عذرا جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گئی اور بے تابانہ انداز میں اس طرف بھاگی مگر سانپ کا کوئی اتنا پتا نہ تھا کمرے میں صحن میٹھی میند کے مزے لے رہا تھا۔ عذرا نے فوراً انور کو بلا بھیجا، انور نے بہت سمجھایا کہ وہ سانپ کوئی حقیقت نہیں تھا بلکہ اس کا وہم تھا جو اس کے خوف کی

شاید اس کی موجودگی کی خبر بھی نہ تھی، میں نے برآمدے میں پڑے موٹے کو اس سانپ پر دے مارا۔ خدا کا شکر ہے میں وقت پہ پہنچ گیا ورنہ جانے کیا ہو جاتا، اور پرسوں رات پھر ایک اور سانپ اور وہ سانپ بھی صحن کی منجی (چارپائی) کی طرف ہی جا رہا تھا، میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ نہ جانے یہ کیا ماجرا ہے“ انور واقعی بہت پریشان تھا۔

”فکر نہ کر انورے اتفاق بھی تو ہو جاتا ہے نا دنیا میں تو مالک کا کرم دیکھ دونوں بار اس نے صحن کو کسی بھی نقصان سے بچا لیا“ انور وہ بھی یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گیا لیکن اس نے انور کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا اگر میں دروازہ بچنے پہ نہ اٹھتا تو وہ شاید سوتے میں ہی۔۔۔“ اس سے آگے کے منظر کا تصور کر کے ہی انور کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔

”تجھے پتا چلا کون آیا تھا اس رات دروازے پر؟“ انور کے سوال پر انور کا ذہن اس بات کی طرف گیا جسے وہ اب تک بھلائے ہوئے تھا۔

”یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھا۔“

”تم نے کسی سے پوچھا بھی نہیں؟“ انور نے مزید پوچھا۔

”نہیں یار مجھے تو خیال ہی نہیں رہا اس بات کا میں آج معلوم کرتا ہوں کہ کون آیا تھا اس رات۔“

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا بلکہ اس کے بعد دونوں حقے کے کئی کس بھی لگا چکے تھے اب پھر سے دونوں کام کرنے کے لیے تیار تھے۔

☆.....☆

کھیتوں سے واپس آتے ہوئے انور اور انور نے کئی جگہ پر لوگوں سے باتوں باتوں میں جاننے کی کوشش کی کہ اس رات کوئی انور کے گھر آیا تھا کیا؟ مگر انہیں ہر طرف انکار ہی سننے کو ملا۔

”میں تجھے پریشان نہیں کرنا چاہتا انور لیکن مجھے یہ معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے“ گھر کی طرف جاتے ہوئے انور نے انور سے کہا۔

”کیا مطلب ہے تیرا؟“

وجہ سے اسے حقیقت بن کر دکھائی دیا تھا مگر عذرا یہ سب ماننے کو تیار نہ ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر سانپ کی تلاش کی گئی مگر لا حاصل، دوستوں کے مشورے سے سپیرے کو بھی بلوایا گیا مگر سانپ نہ ملتا تھا نہ ملا۔ اس کے بعد تو یہ جیسے معمول ہی بن گیا کبھی عذرا کو تو کبھی انور کو گھر میں جگہ جگہ سانپ دکھائی دیتا اور لمحوں میں غائب ہو جاتا دونوں اس صورت حال سے بہت پریشان تھے، آخر نورو کے زور دینے پر انور اس کے ساتھ ایک باباجی کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گیا جس کا نورو پہلے بھی کئی بار ذکر کر چکا تھا مگر انور ان سب چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ بہت سے لوگ اللہ والوں کا بھیس بھر کر لوگوں کو بے وقوف بناتے پھرتے ہیں، لیکن اب وہ اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ کوئی راستہ نہ پا کر نورو کے ساتھ چل پڑا تھا۔ حسن اور عذرا بھی ان کے ساتھ تھے۔

☆☆☆☆

دو گھنٹے انتظار کے بعد جس وقت وہ باباجی کے حجرے میں داخل ہوئے دوپہر ڈھل رہی تھی، ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ نورو باہر ہی ٹھہر گیا تھا وہ دونوں میاں بیوی محسن کو اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے تو باباجی کے الفاظ نے انہیں حیرت میں ڈال دیا جو ہونٹوں پر پُر شفقت مسکراہٹ لیے اس سے مخاطب تھے۔

”آگئے تم!! میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا، آؤ بیٹھو“ وہ دونوں حیران ہوتے فرش پر بھی سفید چادر پر بیٹھ گئے۔ محسن گردن گھما گھما کر وچپسی سے حجرے کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ دونوں میاں بیوی عقیدت اور حیرت بھری نظروں سے باباجی کو دیکھ رہے تھے۔

”باباجی یہ ہمارا بیٹا ہے محسن اور.....“ باباجی نے انور کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔

”جانتا ہوں بیٹا سب جانتا ہوں تمہارا مقدمہ تو کب سے میرے پاس آیا ہوا ہے، ذرا صبر کرو دوسرا فریق بھی آجائے تو بات کرتے ہیں“ باباجی کی بات پر عذرا اور انور ناگہمی کی کیفیت میں ایک دوسرے کو

دیکھنے لگے، ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہی تھیں مگر اب خاموش تھے۔ باباجی آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے ان کے لب ہلکے ہلکے بل رہے تھے اور ہاتھوں میں تھاجی بیج کے دانے ایک ایک کر کے انگلیوں کے درمیان پھسلتے جا رہے تھے ایسے ہی تقریباً پانچ منٹ گزر گئے، حجرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی تو باباجی نے آنکھیں کھول دیں عذرا اور انور بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے جبکہ محسن اب کھیل میں مگن ہو چکا تھا۔ لمحہ بھر بعد حجرے میں جو داخل ہوا اسے دیکھ کر خوف سے دونوں میاں بیوی کی آنکھیں خوف سے پھٹنے والی ہو گئیں، حجرے کے دروازے سے وہی سانپ اندر داخل ہو رہا تھا جسے عذرا اور انور پہلے کئی دنوں سے اپنے گھر میں دیکھتے چلے آ رہے تھے، انور نے ایک کر محسن کو اپنی گود میں بھر لیا اور سانپ کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس سے کہہ رہا ہو ”میرے ہوتے تم میرے بیٹے کا کچھ نہ بگاڑ پاؤ گے“ سانپ سیدھا جا کر باباجی کے سامنے بیٹھ گیا۔

”بس ٹھیک ہے ارسلان اب انسان کے روپ میں آجاؤ“ باباجی سانپ سے مخاطب ہو کر بولے تو لمحہ بھر میں سانپ وہاں سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک چھفت کا مجسم انسان بیٹھا دکھائی دینے لگا وہ غصے اور نفرت سے انور اور اس کی ٹیم کی کو دیکھ رہا تھا۔ ”میں آپ کے کہنے سے انتقام لینے سے رک گیا ہوں باباجی لیکن آپ سے انصاف کی امید رکھتا ہوں۔“ انہیں گھورتے ہوئے وہ باباجی سے مخاطب ہوا۔

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ باباجی نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

”انور بیٹا یہ ارسلان ہے، ہماری طرح اللہ کی مخلوق ہے جو عام طور پر ہم لوگوں کو دکھائی نہیں دیتے، اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے بیٹے کا قتل کیا ہے اور یہ اس کا بدلہ لینے کے لیے تمہارے بیٹے کی جان لینا چاہتا تھا، یہ چاہتا تو تمہارے سوتے میں بھی اس کی اور تمہاری جان لے سکتا تھا لیکن یہ تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو مار کر تمہیں تڑپا دیکھنا چاہتا تھا، اس رات تمہارے دروازے پر دستک دینے والا

تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہوں، تم ایک اچھے جن ہو
 ارسلان، درو مند دل رکھتے ہو، بیٹے کو کھونے کے دکھ
 سے واقف ہو، کیا تم چاہو گے کہ جس دکھ میں تمہارا دل
 تڑپ رہا ہے وہی دکھ کسی اور کو بھی سہنا پڑے جبکہ اس
 سب کے بعد بھی تمہارا بیٹا تمہیں واپس لے گا نہ ہی
 تمہارے دکھ میں کوئی کمی آئے گی۔ باباجی کی بات پر
 ارسلان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
 ”تو میں کیا کروں باباجی؟“ ارسلان نے روتے
 ہوئے پوچھا۔

”ان بڑے آنسوؤں سے اپنے انتقام کی آگ کو
 ٹھنڈا کر دو ارسلان صبر کے راستے پر چلو، بے شک
 معاف کرنے والا بہت بڑا ہوتا ہے۔“
 ”میں تباہ دل سے تم سے معافی مانگتا ہوں کاش
 کہ یہ سب نہ ہوا ہوتا لیکن اگر اب بھی تمہارا دل مجھے
 معاف کرنے کو تیار نہیں تو میری غلطی کی سزا میرے
 معصوم بچے کو مت دو، تمہیں بدلہ چاہیے تو میری جان
 لے لو“ انور نے روتے ہوئے ارسلان کے سامنے
 ہاتھ جوڑ دیے۔ ارسلان نے ایک نظر باباجی کی طرف
 دیکھا اور دوسری نظر محسن پر ڈالی جو باپ کی گرفت سے
 آزاد ہوتے ہی حجرے میں گھومتا پھر رہا تھا اور اب
 گھومتا گھامتا ارسلان کے پاس آ پہنچا تھا، وہ معصوم ہر
 بات سے بے خبر ارسلان کو مسکرا کر دیکھ رہا
 تھا۔ ارسلان کا دل اس مسکراہٹ سے پگھل گیا اس
 کے اندر بدلے اور انتقام کی آگ سرد پڑ گئی۔ اس نے
 ہاتھ بڑھا کر محسن کے گالوں کو پیار سے چھوا اور
 آنسوؤں میں بھیکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں اپنے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔“ یہ
 کہتے ہی دو دھواں بن کر حجرے سے غائب
 ہو گیا۔ عذرا اور انور نے آنسو بہاتے ہوئے باباجی کا
 شکریہ ادا کیا اور محسن کو کسی قیمتی خزانے کی مانند آغوش
 میں سینے حجرے سے باہر چلے آئے۔ سورج مغرب
 میں پناہ لے چکا تھا تاریکی پھیل رہی تھی لیکن ارسلان
 نے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے عذرا اور انور کی
 زندگیوں کو غم کی تاریکی میں ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔

☆.....☆

بھی ارسلان ہی تھا، مجھے جیسے ہی معاملے کی خبر ہوئی
 میں نے ارسلان کو رکھنے کے لیے کہا اور اس نے میری
 بات مان لی اس لیے اس رات یہ تمہاری نظروں سے
 اوجھل ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اس کے بیٹے
 کا قتل کیوں کیا لیکن تمہاری زبان سے سننا چاہتا
 ہوں۔ باباجی نے ساری تفصیل بتا۔ ہوئے انور کی
 طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ جو حیرت و خوف کے
 طے چلے احساسات کے ساتھ یک ٹک ارسلان کو
 دیکھے چلا جا رہا تھا باباجی کے سوال پر جیسے ہوش
 میں آ گیا۔

”باباجی میں اسے نہیں جانتا تو پھر اس کے بیٹے
 کے قتل کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ انور نے
 اچھٹے ہوئے باباجی اور ارسلان کو دیکھا۔ ”جسے سنا ہے
 سمجھ کر تم نے مار ڈالا تھا وہ میرا بیٹا تھا جو سانپ کے
 بہروپ میں تمہارے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا، لیکن
 تم نے اس کی جان لے لی“ اس سے پہلے کہ باباجی
 انور کی بات کا جواب دیتے ارسلان اسے غصے سے
 گھورتے ہوئے بولا، اور جیسے ساری بات لمحہ بھر میں
 انور کی سمجھ میں آ گئی۔

”میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہارے بیٹے
 کی جان جاتی رہی لیکن میری جگہ کوئی بھی باپ ہوتا وہ
 یہی کرتا، اگر تم اپنے بیٹے کو کسی خطرے میں دیکھتے تو تم
 بھی اسی طرح اس کا بچاؤ کرتے، کیا میں غلط کہہ رہا
 ہوں؟“ انور کے اندر کا باپ اپنے بیٹے کو خطرے میں
 دیکھتے ہی ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اب وہ بنا کسی خوف
 کے ارسلان کے چہرے پر نظریں جمائے اس سے
 سوال کر رہا تھا۔

”اگر باباجی نے میرے ہاتھ نہ باندھے ہوتے
 تو میں تم سے سوال جواب کرنے کی بجائے اپنے بیٹے
 کے قتل کا انتقام لے کر یہاں سے جا چکا ہوتا۔“

”سنو ارسلان مجھے بھی تمہارے بیٹے کی موت کا
 دکھ ہے لیکن تم انور کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو
 وہ تمہارے بیٹے کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا
 وہ تو صرف اپنے بچے کی حفاظت کر رہا تھا، اس سے
 غلطی ہوئی، قتل ہوا مگر یہ سب انجامنے میں ہوا، میں



صائمہ عروج

کیا آج کے زمانے میں آپ ہنگامہ کی نااہلی فہم کہانیوں پر اعتبار کرتے ہیں

اگر نہیں تو یہ کہانی ضرور پڑھیں

آنکھوں میں سجائے یونیورسٹی کے شب و روز گزار رہا تھا۔
پڑھائی میں مگن اپنی جی پی کو پچھلے سمسٹر سے زیادہ اچھا

یونیورسٹی میں قدم رکھنے والا ہر طالب علم آنکھوں میں
ایسے مستقبل کے خواب لیے گھومتا ہے۔ میں بھی یہی خواب



WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے کی فکر اور ساتھ میں یونیورسٹی لائف کی جولانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور یونی ایک عام سے دن جب لیکچرار کے نہ آنے کی وجہ سے ہم کلاس فیروز ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان میں ٹیبلوں کی صورت میں بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے کہ میری نظر میرا پر پڑی۔

میرا جو کلاس کی ذہین طالبہ تھی۔ جو ہر سمسٹر میں نمایاں جی پی لیتی۔ جسے طلباء رشک سے دیکھتے۔

وہ میرا جسے میں دن میں بیسیوں بار دیکھتا مگر آج کی نظر میں ایسا کیا تھا کہ وہ میرا چین و سکون لیے دور پرواز کر گئی اور رات کو میں اپنے بستر پر کرشمیں ہی بدلتا رہ گیا۔ "می را۔" ٹھہر ٹھہر کر میں نے نام لیا۔ ایک گدگدی کا احساس سر سے شروع ہوا اور پیروں تک رینگتا چلا گیا اور ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ سجے گئی۔

صبح کو باوجود اس کے کہ کم خوابی کی ذوریں میری آنکھوں میں جھلک رہی تھیں مگر میں ہشاش بشاش مسکرائے جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی اس بلاوجہ مسکراتا رہا۔ لیکچرز بھی توجہ سے نہ سنے اور جب کلاسز اختتام کو پہنچیں اور طلباء لیکچر ہال سے کتابیں سنبھالتے رخصت ہونے لگے۔ تب میں لڑکیوں کی اس روٹی طرف بڑھا جہاں میرا بیٹھی تمام لڑکیوں سے جدا لگتی تھی۔ یوں جیسے بہت سے ٹینوں میں ہیرا سب سے جدا لگتا ہے۔

"میرا۔" میں نے اسے پکارا۔ وہ کتاب سے نظر اٹھا کر مجھے سوائے نظروں سے دیکھنے لگی اور میں جو صبح سے شاواں و فرحان اپنے دل کو اچھلنے سے روک رہا تھا، لمحے بھر کو گڑ بڑا گیا۔

"کچھ کہنا ہے رمیز؟" لہجہ میں سادگی لیے وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ میں یہ کہ....." الفاظ ہی ادا نہ ہوتے تھے اور وہ ہنس دی۔ اس کے جننے سے جیسے جلتی رنگ سے بجنے لگے۔

"اتنے نروس کیوں لگ رہے ہو رمیز۔" اس سے قبل کہ میں اس جلتی رنگ کے سحر میں گرفتار ہو کر کسی فنیٹسی بھری دنیا کا سفر کرتا۔ میرا کی آواز نے میرے سفر کے قصبے کو روکا۔ "وہ مجھے تمہارے سابقہ لیکچرز کے نوٹس چاہیے۔"

اس وقت مجھے یہی بہانا سوچا۔ یوں بھی ایک طالب علم کو اپنی صنف مخالف کلاس فیلو

سے بات کرنے کے لیے اکثر و بیشتر یہی بہانا سوچتا ہے۔ "میں کل لے آؤں گی۔" وہ جانے کئے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور میں اس پر ہی خوش ہو گیا کہ کل بات کرنے کا بہانا میسر آیا۔

☆.....☆
اگلے دن وہ نوٹس لے آئی اور مجھے پکڑائے۔ اس سے اگلے دن میں نے وہ نوٹس اسے واپس کرتے ہوئے کہا کہ یہ لیکچرز مجھے سمجھ آ گئے تھے مجھے فلاں لیکچر کے نوٹس چاہیے تھے۔ اس سے اگلے دن وہ مطلوبہ لیکچر کے نوٹس لے آئی اور اس سے اگلے دن میں اس کے پاس جا کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے یہ پوائنٹس سمجھ نہیں آرہے، براہ مہربانی سمجھا دو۔"

اگلے دو دن وہ مجھے سمجھاتی رہی اور میں سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کی اداکاری کرتا رہا اور جو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ انجان بنی رہے گی تو ایسا ہرگز نہ ہوا۔ "رمیز تمہیں ایک بات بتاؤں۔"

"ضرور۔" کہنی پر چہرہ نکائے میں اشتیاق سے اسے نکلے جاتا تھا۔

"تم ایک برے اداکار ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں گڑ بڑا گیا۔

"وہ ہنس دی اور کہنے لگی۔" میں جانتی ہوں یہ ٹاپک تمہیں سمجھ آ چکے ہیں بلکہ شاید پہلے سے تمہیں آتے تھے۔ اب شاید تم مجھ سے پرائک کر رہے ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔

"نہیں..... نہیں۔ یہ پرائک (عملی مذاق) نہیں ہے۔" تو کیا پھر فنرٹ کرنا چاہتے ہو۔" وہ اس قدر بااعتماد لڑکی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا۔

"نہیں ایسا ہرگز نہیں۔"

"تو پھر....." سوالیہ نشان آنکھوں میں لیے وہ پوچھ رہی تھی۔

"تو پھر....." میں سوچنے لگا کیا جواب دوں۔

"کیا تم کل لیکچر میرے ساتھ کر سکتی ہو۔ وہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔" اور میں جو سوچ رہا تھا وہ سچ پا ہو کر انکار کر دے گی۔ خلاف توقع وہ مان گئی۔

☆.....☆
اگلے دن میں مقررہ وقت پر ہول پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ آج بھی وہ سادہ سے حلیے میں تھی مگر پھر

بھی حور لگ رہی تھی۔
”کیا کھانا پسند کر دگی؟“ اور اس نے بلا جھجک اپنی
پسندیدہ ڈشیں بتادیں۔

”تو کیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔“ میرا دل نچلانا
ساتا تھا اور کھانے کے بعد جب وہ سوفٹ ڈرنک کے
سپ لے رہی تھی تب میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے
ایک ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔
ڈبیا میں موجود سونے کی انگلی کی دمک اس کے
چہرے کی دمک سے کم نہ تھی۔ وہ بدستور سوفٹ ڈرنک کے
سپ لیتی رہی۔

”مجھ سے شادی کر دگی میرا؟“ میرا دل الگ لے پر
دھڑکنے لگا۔

”نہیں۔“ پرسکون سے انداز میں اس نے انکار کر دیا۔
”کیوں؟“ میں تڑپ اٹھا۔

”چند لمحے وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر
اس نے ڈبیا لے لی اور کچھ دیر انگلی کا ڈیزائن دیکھنے کے
بعد ڈبیا میز پر رکھ دی۔

”میری حقیقت جاننے کے بعد تم مجھ سے شادی
نہیں کرو گے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

”حقیقت۔“ میں اس لفظ کو زیر لب دہرا کر رہ گیا۔
”زمین مرغ سے جا کر نکرا جائے، دنیا میں آکسیجن
ختم ہو جائے میں پھر بھی تم سے شادی کروں گا اور تم کہتی
ہو حقیقت جاننے کے بعد مگر جاؤں گا۔“ میرے لہجے میں
چٹانوں سی سختی تھی۔

”ہاں تم حقیقت آشنا ہونے کے بعد پیچھے ہٹ جاؤ
گے۔“ سوفٹ ڈرنک ختم ہو گیا تھا اور اب وہ دونوں
ہاتھوں کی مٹھی میز پر رکھے کہہ رہی تھی۔

”تم مجھے آزمانا چاہتی ہو تو آزمالو میں پیچھے ہٹنے والوں
میں سے نہیں۔ بس ایک بار تم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے
دو۔ پھر میں تمہارا ہاتھ مرنے کے بعد ہی چھوڑ دوں گا۔“

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ہنسنے لگی۔ ہنستی ہی
چلی گئی اس کی ہنسی کا استہزاء مجھے رگیدنے لگا۔

”میرا مجھے تمہارا ہنسا اچھا نہیں لگ رہا۔“
”اور کچھ دیر بعد تمہیں میں بھی اچھی نہیں لگوں گی۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہی ہو گا۔ ابھی تو تم مجھ سے شادی کے خواہش مند
ہو۔ حقیقت جاننے کے بعد تم مجھے دیکھ کر رخ موڑ لیا کرو گے۔“
”اب بتاؤ بھی آزما بھی لو۔“ میں اس لفظ حقیقت کی
تکرار سے اکتانے لگا۔ وہ مجھے خشکیں لگا ہوں سے
دیکھنے لگی اور خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا۔ اس سے قبل
کہ میں اس خاموشی سے اکتا کر کچھ کہتا۔ وہ بولی۔

”میں انسان نہیں ہوں۔“
”تو کیا جن زادی ہو۔“ میں ہنسنے لگا۔
”نہیں، میں ناگن ہوں۔“ اور میری مسکراہٹ
قیقے میں بدلنے لگی۔

”بس کرو اب۔“
”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”ایسا ہے تو ہمیں بھی سانپ بن کر دکھا دو۔“ میری
ہنسی نہ رکتی تھی ایسی ماورائی باتیں کر کے وہ اگر مجھے الو بنا
رہی تھی تو میں ایسا عقل سے پیدل نہ تھا۔ چند لمحے وہ مجھے
دیکھتی رہی اور پھر اس نے مجھے سانپ بن کر تو نہ دکھایا مگر
جو میں نے دیکھا لمحے بھر کو میں کانپ ہی گیا۔

”مجھے کھنگلی باندھ کر دیکھو۔“ میرا کہہ رہی تھی۔
”یہ کام میں شوق سے سے کروں گا۔“ اور میں اسے

دیکھنے لگا۔ کس قدر حسین لڑکی تھی اور پھر..... میرے
روتھنے ہی کھڑے ہو گئے۔

اس نے منہ سے زبان نکالی۔ وہ زبان نہ تھی۔ پھن تھا۔ دو
دھاری پھن جیسے سانپ کا ہوتا ہے۔ ایک پار نہیں تین بار اور
میں سکتے میں آ گیا۔ اب ہنسنے کی باری اس کی تھی۔

”اب بولور میز مجھ سے شادی کرو گے؟“ وہ ویسے
ہی ہنس رہی تھی جیسے کچھ دیر پہلے میں ہنس رہا تھا۔

اور فقط چند لمحوں بعد کا پتی ناگوں پر اپنے دھڑکا
بوجھ اٹھائے میں سیدھی سڑک پر چلنا چلا جا رہا تھا۔

”زمین مرغ سے جا کر نکرا جائے، دنیا میں آکسیجن ختم ہو
جائے میں پھر بھی تم سے شادی کروں گا۔“ اپنے الفاظ میرے
کانوں میں گونجنے اور میں لڑھکتے لڑھکتے بھا۔ کہنے اور کرنے میں
بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق آج سے پہلے مجھے کبھی اتنے جامع
انداز میں سمجھ نہ آیا تھا۔ بھلا آپ بتائیے میں ایک ناگن سے کیسے
شادی کر سکتا ہوں؟ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM



سیاسی ادھوری ہے

سعدیہ سیٹھی

اس ناگن کی داستان جو چادر بھی اپنا انتقام تانے لگی تھی سے پہلے ایک زہر بھری داستان

سچے حقائق کی تلاش

ہی سوچ رکھا تھا کہ اس بار جب تم چھٹی آؤ گے تو مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنائیں گے، اور اس بار یہاں نہر پر آنے کی بجائے دریا پر جائیں گے۔" ندیم نے پر جوش انداز میں جواب دیا۔ اوکے تو پھر یہ پروگرام فائنل سمجھو اور واپس گھر جا کر آج ہی جال وغیرہ کا بندوبست کر لو، میں بھی امی سے کہہ کر ساتھ لے جانے کے لیے کھانا بنالوں گا۔" سہیل نے حتمی لہجے میں پروگرام فائنل کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ اس بار ساجد اور اکرام کو بھی ساتھ۔" ندیم بات کرتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا، جبکہ اس کے اٹھتے ہوئے قدم بھی رک گئے۔ سہیل نے اس کے رکنے اور اچانک چپ سادھنے پر اس کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا، کیوں کہ ندیم کے چہرے پر انتہائی ڈر اور خوف کے آثار ابھرے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ سہیل یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ بالکل نارمل انداز میں باتیں کر رہا تھا، اب اچانک اسے کیا ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے پر خوف سے پسینہ تنگ آ گیا تھا۔

"کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" سہیل نے حیرانگی سے پوچھا مگر ندیم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بس ایک طرف دیکھ کر رہا تھا۔ سہیل نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا

تہر کے درمیان میں پانی کے بہاؤ کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی، جس کی وجہ سے ایک مخصوص شور کی آواز پیدا ہو رہی تھی، جبکہ اس کے برعکس کناروں کے قریب آگے ہوئے سرکنڈوں میں پانی کا بہاؤ ٹانہ ہونے کے برابر تھا، پانی اس طرف آتو رہا تھا مگر سرکنڈوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر، اس کی ساری تیزی طراری ختم ہوئی جا رہی تھی۔ ویران اور سنسان پہاڑی پر اس وقت کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی شام ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے مگر فضا میں خنکی در آئی تھی،

ایسے میں سہیل اپنے جگر کی دوست ندیم کے ساتھ نہر کی سنسان پہاڑی پر خراماں خراماں چلتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ سہیل تعلیم کے سلسلے میں شہر میں رہتا تھا، مگر اس کا دل ہمیشہ گاؤں اور اپنے دوستوں میں ہی انکار ہوتا تھا، وہ جب بھی گاؤں آتا تو ندیم کے ساتھ نہر کے کنارے اورتک پہل قدمی ضرور کیا کرتا تھا، ایذا ختم ہونے کی وجہ سے اسے کان سے کچھ دن کی چھٹی تھی۔

کل رات ہی وہ واپس گاؤں پہنچا تھا۔ "یار چند دن بھنی ہے تو کیوں نہ خشک کا پروگرام بنایا جائے۔" سہیل نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی، میں نے تو پہلے

تو اس کی نظر نہر کی پٹری کے ایک طرف کھیتوں میں چلتے ہوئے نیوب ویل پر پڑی تو اسے خود بھی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی،

نیوب ویل کی ہودی کی چار دیواری پر سیاہ رنگ کے دو دھاری دار سانپ تین فٹ کی بلندی تک بھن پھیلائے آپس میں اس طرح بل کھا رہے تھے جیسے دو رسیوں کو بل دیا جا رہا ہو۔ ”کیا یہ لڑ رہے ہیں۔“ سہیل نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔ ”نہیں نہیں یہ ملاپ کر رہے ہیں۔“ ندیم نے انتہائی خوفزدہ انداز میں جواب دیا۔ ”یا تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو گئے ہو وہ ہم سے خاصے فاصلے پر ہیں۔“ سہیل نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ جوڑا سانپ انتہائی زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں وہ دیکھوانہوں نے ملاپ چھوڑ دیا ہے اور ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“ ندیم نے پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ سہیل نے واپس نیوب ویل کی طرف دیکھا تو واقعی سانپ آپس میں بل کھانا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے، اور اب لہر لہرا کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ”ایک منٹ رکو۔“ سہیل نے اسے کہتے ہوئے ایک طرف پڑا ہوا مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور تاک کر پورے زور سے سانپوں کی طرف اچھال دیا۔

نشانہ ٹھیک ایک سانپ کے پھن پر لگا جو مٹی کے ڈھیلے اور نیوب ویل کی پچھتہ دیوار کے درمیان میں آکر کچلا گیا۔ سانپ بل کھا کر پانی کی ہودی میں گرا اور وہاں سے بہتا ہوا کھالے میں آ گیا۔ اور اس کا مردہ جسم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا، جبکہ اس کا ساگی سانپ بے قراری سے کھالے کے کنارے اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں سانپ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ”اوہ اوہ یہ تم نے کیا کر دیا۔ اب تمہیں دوسرے سانپ کے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میں تمہارے ساتھ رہا تو یہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔“

ندیم نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا اور واپس گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی۔ ”ندیم سنو تو۔“ ندیم سہیل پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ”اسے کیا ہوا اتنا ڈر پوک انسان میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، سنی سنائی باتوں پر کتنا یقین رکھتا ہے کہ اگر جوڑے سانپ میں سے ایک کو مار دیا جائے تو دوسرا انتقام لیتا ہے۔ ہونہ ماٹی فٹ۔“

سہیل بڑبڑاتا ہوا نہر کی پٹری سے اتر کر نیوب ویل کے پاس آ گیا، جہاں کچھ دیر پہلے تک ناگ اور ناگن آپس میں محبت کر رہے تھے۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW

اڑتی ہوئی نیچے فرش پر جا گری۔ پروین بیگم نے فرش کی طرف دیکھا تو وہ ایک کالے سیاہ رنگ کا ناگ تھا۔ اسے دیکھ کر ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

نجانے ان میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی انہوں نے ہاتھ میں موجود گلاس ناگ کو دے مارا۔ تو اس نے تیزی سے کروٹ بدل کر خود کو بچالیا۔ گلاس ایک چھناکے سے نوٹ گیا۔ سانپ ایک بار پھر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلا اور سمیل کے ابو اندر آ گئے۔ انہیں اندر دیکھ کر سانپ ٹھٹھک کر رک گیا اور پھر تیزی سے اندرونی کمرے کی طرف ریجک گیا۔ سانپ دیکھ کر صوفی فیاض کے ہاتھ پر پھول گئے۔

”یہ کہاں سے آگیا۔“ انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔ مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پروین بیگم خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں جبکہ سمیل سکتے کی حالت میں اندرونی کمرے کی دہلیز کو دیکھے جا رہا تھا جہاں سے سانپ گزر کر کمرے میں گیا تھا۔

اس کے ذہن میں ندیم کی باتیں گھومنے لگیں۔

صوفی فیاض نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ لہرا کر اپنے والد کی بانبھوں میں جمبول گیا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا، کچھ ہی دیر میں پورا گاؤں ان کے محن میں اٹھ آیا۔

ندیم نے سارے گاؤں کے سامنے سمیل کے سانپ کو مارنے کا واقعہ سنایا تو سب دہشت زدہ ہو کر گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے، حکیم صاحب مختلف تدابیر آزما کر سمیل کو ہوش میں لے آئے تھے۔ مگر وہ کسی کی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

”اس موذی کو کیسے مارا جائے۔“ صوفی فیاض نے روہانسی آواز میں گاؤں والوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”کچھ نوجوان احتیاطی تدابیر کے ساتھ اندر جائیں اور اسے مارنے کی کوشش کریں۔“ پیش امام صاحب نے تجویز دی۔

”ابھی کچھ دیر رک جاؤ، میں نے اپنے بیٹے عدنان کو خانہ بدوشوں کی جھکیوں کی طرف بھیجا ہے، وہاں ایک بہت سیٹا جوگی رہتا ہے وہ ہمیں کوئی اچھا حل بتا دے گا۔“

صوفی فیاض کے چھوٹے بھائی شوکت نے انہیں روکتے ہوئے کہا، ابھی اس نے بات ختم کی ہی تھی کہ عدنان جوگی بابا کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ جوگی ایک ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے کندھے پر میلے سے کپڑے کا تھمبلا لٹکا ہوا تھا اور سر پر نارنجی رنگ کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ سارا

اس نے آگے بڑھ کر چونچے سے ٹکلتے ہوئے تازہ اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور سیر ہو کر پیا، اور پھر واپسی کے لیے چل پڑا۔ گاؤں پہنچنے پر ندیم اسے گلی میں ہی مل گیا۔

”یار بہت ڈر پوک انسان ہو مجھے لگتا ہے بچپن میں ہی ہوئی کہانیوں نے ابھی تک تمہیں اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔“ سمیل نے اسے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ کھسپائی ہنس کر رہ گیا۔ ”صبح کا کیا پروگرام ہے۔“ سمیل نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”میں جال وغیرہ کا بندوبست کرنا ہوں، مساجد اور اکرام کو بھی اطلاع کرویتا ہوں صبح تڑکے ہی نکل جائیں گے تاکہ واپسی جلدی ہو سکے۔“ ندیم نے جواب دیا۔

تو سمیل نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اب وہ اس کے ساتھ پھیلیاں پکڑنے بھی نہیں جائے گا۔ بہر حال اب وہ ٹائل لگ رہا تھا، سمیل اس سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

☆.....☆

”آج تو کہیں لمبی سیر کے لیے نکل گئے تھے۔“ اس کی امی نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”بس امی آج ندیم سے کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی تو گپ شپ میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”کاڑھا ہوا کا دودھ پوگے صبح سے رکھا ہوا ہے سارا دن پک پک کر سرخ ہو گیا ہے۔“

”واہ امی نیکی اور پوچھ کر جلدی لائیں۔“ اس نے بے صبری سے کہا تو اس کی امی مسکرا کر جگ میں دودھ ڈالنے لگیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سمیل کو کاڑھا ہوا دودھ بہت پسند ہے۔

”امی ابو کہاں ہیں صبح سے نظر نہیں آرہے۔“ اس نے آہنے میں اپنے سر اُپے پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آج مسجد کا لکھنڑ والا جا رہا ہے۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ وہ مسجد کی انتظامیہ میں ہیں، اسی لیے وہ آج وہیں مصروف ہیں۔“ پروین بیگم نے دودھ لے کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے انہیں دو چھتی سے کوئی چیز اڑ کر سمیل کی طرف آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے بنا کوئی وقت ضائع کیے دودھ کا جگ ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے سمیل کو زور سے دھکا دیا تو وہ الٹ کر پیچھے موجود چار پائی پر جا گرا۔

ایک لمحے پہلے جس جگہ سمیل موجود تھا وہ چیز وہاں سے

واقعہ سننے کے بعد جوگی بابا کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”بیجے تم نے نام کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے یہ سچ ہے کہ اس نسل کا سانپ انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا، مگر تم نکلنا کرو۔ میرے پیر و مرشد نے مجھے فیض عنایت کیا ہے۔ میں سانپ سے بات کر سکتا ہوں، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ انتقام لینے سے باز آجائے آگے تمہاری قسمت۔“ جوگی نے کندھے پر موجود تھیلے میں سے بین نکالتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازے کے سامنے موجود لوگوں کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بین ہونٹوں سے لگائی۔

اور پھر اگلے آدھے گھنٹے تک بین بجا بجا کر جوگی کی رگیں پھول گئیں مگر سانپ تو کیا کوئی سنپولیا بھی گھر سے برآمد نہ ہوا۔ ”بہت زیادہ غصے میں لگتا ہے وہ انتقام لیے بغیر نہیں ملے گا۔“ جوگی نے بین منہ سے ہٹاتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

”باباجی میرا ایک ہی بچہ ہے میں آپ کے پاؤں پر تکی ہوں اسے بچا لوں۔“ پروین بیگم نے جوگی کے حیرتوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے التجا کی، تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

”بہن جی کیوں مجھے گھبراہٹ کرتی ہو، میں ایک خاص بونی کا دھواں دے کر پھر کوشش کرتا ہوں۔“ جوگی نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا، جب اس کا ہاتھ تھیلے سے باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹی سی جھاڑی نما بونی تھی، پھر اس نے بونی کو آگ دکھائی تو اسے آگ لگنے کی بجائے گاڑھا دھواں نکلنے لگا جوگی نے دھواں اگلتی بونی کو گھر کے اندر پھینک دیا تو وہی دیر میں ہی پورا گھر دھوئیں سے بھر گیا، تو اس نے ایک بار پھر بین سنبھال لی اور اسے ایک خاص لے لے سے بجانے لگا۔ اس بار اسے بین بجاتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نیم وار دروازے میں سے ایک سیاہ رنگ کا آٹھ فٹ لمبا سانپ نکل کر گلی میں آ گیا، اور عین جوگی بابا کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور دائیں بائیں لہرانے لگا۔ اس کی آنکھیں اتنی زیادہ سرخ و ریز تھیں جیسے شعلے اگل رہی ہوں۔ وہ بار بار سرخ زبان باہر نکال رہا تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس طرح سانس لینے سے اس کا پورا جسم پھول اور پچک رہا تھا۔ جس سے اس کی بے چینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جوگی نے بین بجانے کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور اس کا ایک سر ازمین پر رکھ کر سانپ کے گرد گھومنے لگا۔

جوگی کے دائرے میں گھومنے پر سانپ بھی گردن پھیر

کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

دائرہ لگانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آکھڑا ہوا اور پھر اس نے ایک دم بین بجانا بند کر دی۔

اور کسی نامعلوم زبان میں چیخ کر کچھ کہا، جواب میں سانپ نے پھنکار ماری تو اس کے منہ سے زہر فوارے کی طرح نکلا، اور جہاں تک گرا وہاں سے زمین ایسے کھولنے لگی جیسے تیزاب گرایا گیا ہو، لیکن اس کا زہر دائرے سے باہر نہیں نکل سکا، ”یہ کہہ رہی ہے تم نے میرے شوہر کی جان لی ہے اب میں ہر حال میں تم سے بدلہ لوں گی۔“

جوگی بابا نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لیے اس سے کہیں کہ میرے بچے کو معاف کر دے، اس کے بدلے میں میری جان لے لے۔“ پروین بیگم نے ہاتھ جوڑ کر انتہائی جذباتی انداز میں روتے ہوئے کہا، جوگی بابا نے ایک بار پھر تاکن سے بات کی۔

”یہ کہہ رہی ہے کہ اگر تم اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو ابھی اس علاقے سے دور بھیج دو اور اگر بھی یہ دوبارہ مجھے نظر آیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پھر اسے میرے انتقام کوئی نہیں بچا سکے گا، اس کی جان میں صرف تمہاری وجہ سے بخش رہی ہوں۔“

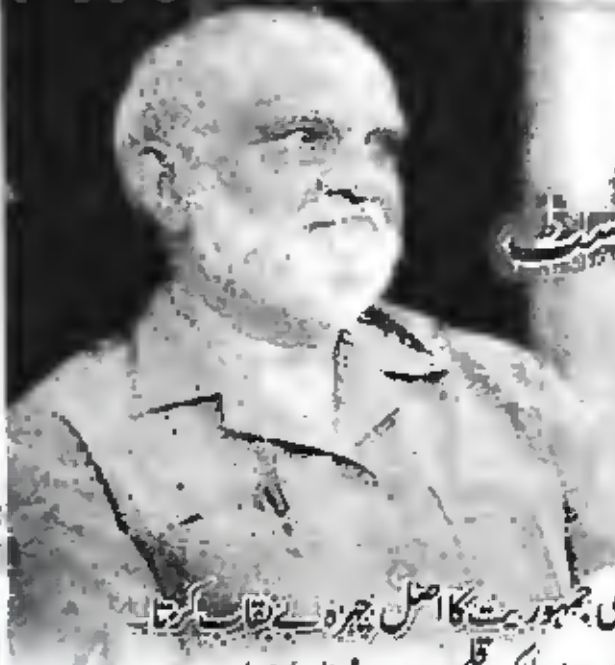
جوگی بابا نے ایک بار پھر تاکن سے بات کرنے کے بعد انہیں بتایا۔ ”ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے۔ میرا بیٹا اب بھی دوبارہ اس گاؤں میں تو کیا اس ضلع میں بھی قدم نہیں رکھے گا۔“ صوفی فیاض نے فوراً حای بھرتے ہوئے کہا۔

اور سہیل کو اسی وقت عدنان کے ساتھ شہر کی طرف روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد جوگی بابا ایک بار پھر چھڑی زمین پر رکھ کر دائرے کے گرد چکر لگانے لگا مگر اس بار اس نے پہلے کی نسبت اتنے چکر لگائے تھے،

جب چکر مکمل ہوئے تو تاکن دائرے سے نکل کر سر جھکائے نہر کی سمت چل دی۔ اس کی چال میں اپنے جیون سا بھی کے قاتل سے انتقام نہ لے سکنے کا ملال اور شکست خوردگی واضح تھی۔

واپس اپنے محل میں پہنچ کر اس نے اپنے انڈوں کی طرف دیکھا اور ان پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے انتظار ہے کہ اس کا اسی انتقام ان میں سے نکلنے والے سوراخوں نے ہی پورا کرنا ہے۔ اور تب تک اسے صرف انتظار کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆



بھارت میں ملک الٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ ہے قاتل کرتا ہے
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت

آخری حصہ

سے اہلتا ہوا پانی نوش جان کیا۔ کاریں زیادہ تھیں۔ رفتار کم۔
اس لیے ہم پانچ بجے کے قریب شملے میں پہنچ سکے۔ شہر میں
گرمیاں گزرنے کے لیے آئے ہوئے سکون پسند لوگوں
کے سکون اور چہل قدمی میں مداخلت کرتی ہوئی ہماری
کاریں منزل کی طرف جارہی تھیں۔ سیزن میں کاروں کا
داخلہ شملے کے اندر ممنوع ہوتا ہے صرف Summit کی
گاڑیاں جارہی تھیں۔ شملے میں جونی کانفرنس کا خلا اثر نظر
آتا تھا۔ ”انڈین آئل“ نے اسے اپنی پمپنگ کا ذریعہ بنالیا تھا
جگہ جگہ پمپروں پر بیئر لگے تھے جن پر پہاڑیوں کی
چوٹیاں بنی ہوئی اور اوپر لکھا ہوا کہ انڈین آئل کے ذریعے
جونی کانفرنس میں بیٹھے، شہر سے گزرے تو یہ گرمیاں
گزرنے آئے ہوئے خوب صورت لوگ کھلتے ہوئے رنگوں
میں اپنے کھڑے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے
تھے انگریزی اور ہندی دونوں میں۔ ”دوسرا اعلان تاشقند
ہرگز نہیں۔“ یہ بھی کیسا اعلان تھا کہ اس سے پاکستان خوش ہوا
اور نہ بھارت۔ دونوں ملکوں میں اس کی رسوائی ہو رہی ہے۔
پہلے ہم ”ہما چل بھون“ پہنچے۔ کیونکہ اس قافلے میں سے کچھ
لوگوں کو یہیں ٹھہرنا تھا۔ اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں
جہاں ٹھہرنا ہے وہ جگہ یہاں سے نو میل دور ہے ابھی کچھ اور
موز کاٹنے تھے۔ کچھ اور ہندی لگی پیشانیاں دیکھنا تھیں شملے

چندی گڑھ ایئر پورٹ شہر سے آٹھ نوکلو میٹر (بھارت
میں آج کل فاسلوں کا یہ نظام چل رہا ہے) دور تھی شہر سے
باہر باہر ہی ہم شملے کے لیے چل پڑے۔ رستے میں وہی
کھیت تھیں اور وہی غریب محنت کش، دھوئی بنیان میں ملبوس،
سڑک کے ادھر ادھر کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے
آ رہے تھے جن سے خوش حالی یا برے ملک کا کوئی نشان نہیں
جھلکتا تھا۔ کالکاسولی اور جانے کون کون سے علاقے رستے
میں غربت کے مناظر پیش کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بل
کھاتے ہوئے پہاڑی راستے شروع ہو گئے تھے جن کے
ایک طرف گھانیاں، خطرناک گھانیاں تھیں۔ اس سڑک کی
مرمت ہو رہی تھی۔ کھر دے چہروں والے دبلے پتلے مگر
مضبوط بازوؤں والے مزدور پہاڑ کاٹ رہے تھے۔ یہ فرہاد
تھے مگر ان کی شیریں، صرف شام کی روٹی تھی۔ شاید مل ہی
جاتی ہو۔ مردوں کے ساتھ بوزھی اور ادھیز عمر کی عورتیں بھی
پہاڑی لباس پہنے پتھر توڑ رہی ہیں۔ ان محنت کشوں کے
چہرے پر بھی وہی پسینے کے قطرے تھے جو کسی بھی ملک کے
مزدوروں کے چہرے پر ہوتے ہیں۔ وہ اتنی ساری کاروں کو
اکٹھے جاتے دیکھ کر ہاتھ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے ان کی
آنکھوں سے ایک حیرت اور حسرت جھلکتی تھی۔ ہماری کاروں
کے کارواں نے رستے میں دو تین مرتبہ بڑا کیا اور جیشوں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کی خنکی کے لیے ہم پہلے سے تیار ہو چکے تھاب خشکی اور بڑھ رہی تھی کیونکہ ہم اور بلندی کی طرف جارہے تھے۔ "وائٹلڈ فلاور ہال جنگلی پھول کا ہال" 8500 فٹ بلندی پر ہے۔ چاروں طرف حسین سرسبز وادیاں اور تچ میں وائلڈ فلاور ہال۔ مگر خوب صورت اور حسن ایک اضافی چیز ہے ہم جس ذاتی کیفیت میں اس پہاڑی مقام پر آئے تھے اس کی وجہ سے یہ حسن اور خوب صورتی ہمارے لیے بے معنی تھے۔ وائلڈ فلاور ہال۔ بھارت کے شعبہ سیاحت کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ اصل عمارت کے علاوہ کچھ کالج بھی بنے ہوئے ہیں۔ پارکنگ کے لیے الگ جگہ ہے۔ یہاں ہمارا استقبال جے این بھٹ نے کیا۔ وہ کراچی میں بھارتی ہائی کمیشن میں پریس نوٹس لکھ رہے تھے۔ اس لیے کراچی کے صحافیوں سے ان کا اچھا خاصا تعارف تھا۔ انہوں نے کمروں میں ہماری رہنمائی کی۔ ہم نے تلی گرام آفس وغیرہ کا پتہ اور یافت کیا۔ ہمیں اب گاڑیوں کے نئے نمبر دیے گئے جو ہماری واپسی تک ہمارے لیے مخصوص رہیں گی اور اس کے بعد ہمیں آسانی تھی کہ جب جی چاہے ہم شہر جاسکتے ہیں۔ صدر بھنواور ان کی پارٹی تین پہلی گاڑیوں سے دوپہر کو ہی شملہ پہنچ گئی تھی۔ پانچ بجے بات چیت شروع ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ گرینڈ ہوٹل کے پریس ہال میں 7 بجے بریفنگ ہے۔ جوئی این کول بھارت کے فارن سیکریٹری کریں گے۔ ہم نے جلدی جلدی تیار ہو کر پریس ہال پہنچنے کی تھی۔ کیونکہ ہماری منزل بالآخر وہی تھی اور اس کے بعد نیلی گراف آفس۔ کمرہ نمبر 3۔ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک میں شریف فاروق (نوائے وقت) اور دوسرے میں عسکری علی شاہ (خیبر میل) نسیم ہمایوں (تعمیر) تھے۔ میرے ساتھی واجد شمس الحسن (ڈیلی نیوز) کو شیخ حامد محمود کی رفاقت نصیب ہوئی تھی۔ دوسرے لوگ باقی کمروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ مظہر علی خان اور ایم اے منصور ی نیچے الگ الگ کالچوں میں تھے۔ ہم نے پریس ہال کا رخ کیا۔ وہاں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بھارت کے کونے کونے سے صحافی آئے ہوئے تھے۔ غیر ممالک کے صحافیوں کی بری تعداد بیٹھی تھی۔ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی بھی موجود تھے۔ ٹی این کول صاحب کا انتظار تھا۔ وہ تو تشریف نہ لا سکے۔ البتہ ایس کے سنگھ جو بیرونی پبلش کے جوائنٹ سیکریٹری

ہیں۔ وہ ساڑھے دس بجے کے قریب آئے۔ انہوں نے فارن سیکریٹری کی طرف سے معذرت کی اور بریفنگ کے تین گھنٹے لیٹ ہونے کی کہانی بھی سنائی کہ افسروں کی سطح پر بات چیت طویل ہو گئی۔ اس لیے دیر ہوئی ہے ان کی بریفنگ بڑی دلچسپ تھی۔ وہ دونوں وفود کی طرف سے ایک مشترکہ بیان پڑھ رہے تھے اور اخبار نویسوں کے ہجوم میں سے وہ بے وقوف قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ ایس کے اخبار نویسوں میں خاصے مقبول نظر آتے تھے۔ کیونکہ چاروں طرف سے "ایس کے ایس کے" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس بریفنگ سے اتنا معلوم ہوا کہ دونوں سربراہوں کی ملاقات ہوئی جس میں رسمی گفتگو ہوئی بعد میں اور افراد بھی اس گفتگو میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس میں آئندہ ملاقاتوں کے لیے موضوعات طے کیے جانے لگے۔ موضوعات کیا تھے دنیا بھر کو معلوم تھا بھارت نے جارحیت کی تھی۔ روس جیسی بڑی طاقت اس کے پیچھے تھی اور کچھ ہماری سیاسی غلطیاں جن کی وجہ سے ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی ناراض ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشرقی پاکستان پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ ہمارے بھائی ہم سے جدا ہو گئے۔ 93 ہزار جتنی قیدی کی ہزار مربع میل سب کچھ بھارت کے قبضے میں تھا۔ ہمارے پاس کیا تھا ایک شکست خوردہ مگر با حوصلہ قوم کا عزم تازہ تیسری دنیا کی منتقلی حمایت۔ مگر یہ سب کچھ اخلاقی سرمایہ تھا۔ مادی نہیں۔ ہمیں جتنی قیدی واپس لینا تھے مقبوضہ علاقے واپس لینا تھے کشمیر اور مشرقی پاکستان کے مستقبل پر بات ہونا تھی۔ یہی موضوعات تھے اور اس میں ترمیمات کا فیصلہ ہونا تھا۔ پہلے کیا اور بعد میں کیا۔ ہم باوقار سمجھوتہ چاہتے تھے مگر بتدریج اب بھارت کے پاس چونکہ ہمارے قیدی بھی تھے اور علاقے بھی۔ اس لیے وہاں Packaged deal یعنی سب کچھ یکمشت کا شور بلند ہو رہا تھا کہ پاکستان کا شیر پھر بھی اس طرح دبا ہوا نہیں ملے گا۔ ابھی جو کچھ حاصل کرنا ہے کر لو۔ لوگ بڑی محبت اور پیار سے ملتے تھے۔ بھارتی صحافی اور بھارتی پریس انفارمیشن کے افسر دیدہ و دل فرس راہ کیے دیتے تھے لیکن ان سب کا سیاسی رویہ اور موقف ایک سا تھا بعض لوگ انتہائی مخلصانہ طور پر کچھ مشورے دیتے تھے۔ بریفنگ کے بعد ہم سیدھے نیلی گراف آفس پہنچے۔ تار تیار کیا۔ بات چیت سے

اور کچھ اخبارات سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چوٹی کانفرنس ایک اور چوٹی کانفرنس کا پیش خیمہ بنے گی۔ ہم نے یہی خبر بھیجی تھی۔ نیلی گراف آفس میں شور برپا تھا۔ ٹائپ رائٹر چل رہے تھے۔ تیلی پرینٹر کھڑک رہے تھے۔ سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ نکات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہمیں رات کی تنہائی اور اندھیرے میں والٹڈ فلاور ہال تک پہنچنا تھا۔ میں اور واجد صاحب ساتھ تھے۔ ہال میں پہنچے تو یاران صحافت کھانے کی میزوں کے سامنے ڈائے ہوئے تھے۔ آج کی کارگزاری پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک تمام اہل کار پر امید تھی کہ بات یقیناً آگے چلے گی اور ہم مایوس نہیں ہوں گے۔ ہمیں بتایا گیا کہ والٹڈ فلاور ہال میں لوگ ہی مون منانے آتے ہیں۔ ہم سیاسی ہی مون منانے آئے تھے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ سیاسی ہی مون سے پہلے بھی تلخیاں اور بعد میں بھی تلخیاں۔ اگلی صبح افسروں کی سطح پر مینٹگ ہونا تھی۔ ہم والٹڈ فلاور ہال سے دس سائز سے دس بجے نکلے مینٹگ جاری تھے۔ غیر ملکی اخبار نویس ہمارے چل سیکر ٹریٹ کے باہر ڈیرہ جمائے تھے۔ بریفنگ شام کو ہونا تھی۔ ہم بازار کی طرف نکل گئے۔ مری اور شملے میں کافی فرق ہے۔ مری کا سلسلہ کوہ بہت مختصر سا ہے جب کہ شملہ ایک طویل سلسلہ کوہ کے درمیان واقع ہے۔ کیونکہ اسے چاروں طرف سے سرسبز پہاڑ اور وادیاں گھیرے ہوئے ہیں شملہ کا مال روڈ بھی مری کے مال روڈ سے کچھ آگے ہی ہے۔ روٹی، رنگ، خوشبو میں کچھ موسم بھی تھا۔ کچھ سربراہ کانفرنس کی وجہ سے بھی دور دراز سے لوگ آئے ہوئے تھے اس لیے مال پر ہر طرف رنگ بکھرے تھے۔ صرف پیشانیوں سے گمان ہوتا تھا کہ یہ خواتین ہندومت سے تعلق رکھتی ہوں گی ورنہ وہی تیل بائم، ساڑھیاں، کھلے بال، فیشن میں پاکستان اور بھارت ایک ہی مقام پر نظر آتے ہیں۔ بھارت ہم سے لاکھوں دس گنا بڑا سہی مگر فیشن میں ہماری خواتین نے بھارتی خواتین کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مال روڈ پر ہماری دلچسپی کی چیز کتابوں کی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ سے اردو اخبار سمیٹے۔ دوسری دکان پر گئے۔ اس کے مالک ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے ان کی زبان میں گفتگو کی یہ کتابوں کی دکانیں ہماری اونچی سوسائٹی کے مزاج کی کتابیں رکھتی تھیں۔ مثلاً جنس پر، نفسیات پر، بچوں کے لیے انگریزی میں لطیفوں کی کتابیں،

انگریزی ناول، نجوم کی کتابیں، پامسٹری، کچھ سیاسی کتابیں بھی سجا رکھی تھیں۔ جن کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ یہ کتابیں صرف پاکستانی وفد کی آمد کے پیش نظر دہلی سے منگوائی گئی تھیں کہ وہ لوگ ایسی کتابیں ضرور خرید کر لے جائیں گے۔ ان میں ولیپ مکر جی کی ”ذوالفقار علی بھٹو“ اقتدار کی پیاس“ سب سے زیادہ بک رہی تھی۔ بنگلہ دیش پر بھارتی اخبار نویسوں کی تعینفات بھی بڑی تعداد میں تھیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ بھارت کے صحافی ابہم موضوعات پر فوری طور پر کتابیں لکھ ڈالتے ہیں تاکہ تمام ضروری کوائف قلمبند ہو جائیں۔ ہمارے سینئر صحافی جو بائیس تیس سالہ تجربے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں بھی یہ سنجیدہ کام کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اس لیے ہمارے ہاں صحافت ایک باقاعدہ سودمند پیشہ نہیں بن رہا ہے۔ بڑے بڑے صحافی تمام راز اپنے سینوں میں دبا کر ساتھ ہی لے جاتے ہیں، قوم اسی طرح محروم رہتی ہے۔ کچھ کتابیں خرید کر، کچھ کتابیں دیکھ کر ہم ہمارے چل بھول بچھ جاتے ہیں۔

ہمارے چل بھول کو اسٹیٹ ہاؤس سمجھ لیجئے۔ بھارتی اخبارات نے لکھا تھا کہ ہمارے چل بھول کو بہت آراستہ کیا گیا تھا۔ اسے مہمانوں کے شایان شان بنانے کے لیے نئے قالین بچھائے گئے۔ پروے لٹکائے گئے۔ رنگ روغن از سر نو کیا گیا۔ عمارت پر بھارتی ترنگا اور صدر پاکستان کا اسٹینڈرڈ لہزار ہا تھا۔ پاکستان کا پرچم کھڑا نہیں دیا۔ حالانکہ کسی سربراہ کی آمد پر سرخوں پر مہمان اور میزبان دونوں سکوں کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ ہمارے چل بھول میں اگرچہ سیکورٹی کا سخت انتظام تھا مگر پاکستانی مہمانوں کے لیے آنے جانے کی آزادی تھی۔ ہم اپنے وزرائے کرام سے ملے۔ ابھی تھقل کی فضا تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ہم وہاں سے والٹڈ فلاور ہال کے لیے روانہ ہوئے، دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ پھر شہر جانے کی سوچنے لگے۔

واپس آرہے تھے تو ایک ترنگے والی گاڑی رکی۔ اس میں سے وزیر خارجہ سردار سون سنگھ برآمد ہوئے۔ وہ پاکستانی صحافیوں کے لیے رہائش کے انتظامات کا جائزہ لینے آئے تھے۔ میں ان سے مذاکرات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ بات چیت میں خاصی مشکلات پیش آرہی ہیں کیونکہ دونوں ملکوں کو 25 برس سے مسائل درپیش ہیں۔ ان کا ایک دم حل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے پوچھا بات کچھ نی بھی

ہے کہ نہیں۔ سردار جی کہنے لگے۔ ابھی تو نہیں۔ کل تک شاید کچھ بات چل نکلے۔ میں نے آخر میں پوچھا۔ ”کیا ہم پر امید رہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

ہمیں سردار جی کی بات سے مذاکرات کے رخ کا کچھ اندازہ ہوا۔ اس کے مطابق ہم نے ایک خبر بنائی اور شام کو ہی فائل کر دی۔ پھر گریڈ ہوٹل کے پریس ہال میں جا کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا تھا کہ آج پاکستان کی طرف سے بریفنگ ہوگی۔

ہم ہال میں داخل ہوتے ہیں تو بھارتی پریس انفارمیشن کے افسر اور کچھ صحافی گھیر لیتے ہیں۔ خاطر تواضع پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ اپنے میزبان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہم اپنے تکلف سے اپنے مہمان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وقفوں وقفوں سے اطلاع ملتی ہے کہ بریفنگ کے لیے پاکستان کے سیکریٹری وزارت خارجہ مسٹر افتخار علی آج بھی چاہتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں تو سیکریٹری وزارت خارجہ کی بجائے بیرون ملک پبلسٹی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مقبول بھٹی برآمد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول بھٹی بتاتے ہیں کہ ان کے فارن سیکریٹری ہال کی طرف آرہے تھے مگر ڈرائیور کو شاید راستہ معلوم نہ تھا وہ گاڑی کو کسی اور طرف لے گیا، جہاں سے واپسی کا راستہ بہت طویل تھا اور پیدل بہت چڑھائی تھی۔ فارن سیکریٹری دل کے مریض ہیں وہ اونچائی نہیں چڑھ سکے۔ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ گاڑی میں ہی بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہیں پھر میننگ میں شرکت کرنا ہے، اس لیے انہوں نے مجھے بھیج دیا ہے کہ میں آپ سے بات چیت کر لوں۔

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ مذاکرات بڑے کٹھن مرحلے پر ہیں۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دونوں وفدوں کے ارکان کی کوشش ہے کہ ایک متفقہ بیان تیار ہو جائے۔ وہ شاید آپ تک کسی وقت پہنچ جائے۔ آج کی ملاقات دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک رہی۔ پھر سہ پہر کو چھ سے سات بجے تک۔ غور و خوض کا موضوع ایجنڈے کی بنیادی اہمیت کے موضوعات رہے ہیں۔ مری میں جو مذاکرات ہوئے ان کی بنیاد پر ہی بات چیت کی جارہی ہے۔ ہمارے صدر محترم شملہ میں محکمانہ امیدوں کے ساتھ آئے ہیں تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان نئے تعلقات کا دور شروع ہو۔

دوسری میننگ کے بعد افسر اپنے اپنے سربراہوں کو

رپورٹ دینے کے لیے گئے ہیں۔ آج سربراہوں کی ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ ویسے دونوں سربراہ آج رات کے کھاتے پر مل رہے ہیں جو وزیراعظم اندرا گاندھی نے صدر بھٹو کے اعزاز میں دیا ہے۔ یہ ملاقات خالصتاً سوشل ملاقات ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ بات چیت کی رفتار بڑی سست مگر اطمینان بخش ہے۔

ایسی بریفنگ سے اخبار نویسوں کی کیا تسلی ہوتی، وہ اب ایک دوسرے سے کچھ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے بعد سیمبل ہوٹل میں ایس کے کی طرف سے ایک استقبالیہ تھا۔ پاکستانی اخباری نمائندوں کے اعزاز میں۔ یہاں بھارتی اخبار نویس بھی مدعو تھے اور غیر ملکی اخبار نویس بھی۔ جام کھنک رہے تھے۔ کچھ لوگ پرانی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ لاہور سے گئے ہوئے ہندوشرنا تھیوں کو لاہور یاد آ رہا تھا۔ ہندوستان کے علاقوں سے پاکستان میں آباد ہونے والے اپنے علاقوں کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب احساس ہے، جس زمین میں پیدا ہوئے، اس زمین سے پھمڑنے کا غم اور ایک نئی زمین کو اپنا وطن بنا لینے کا ایک نیا عزم۔ میں اس احساس سے فرار اختیار کرتا تھا۔ میں ہندوستان کی سرزمین سے اپنے پرانے رشتوں کی راکھ کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ سفید بالوں والے لوگ یہ باتیں کرتے اچھے لگتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی فضا میں ہم سے کہیں زیادہ عرصے سانس لیے ہیں، ہمارا سرمایہ صرف یہ ہے کہ ہم نے زیادہ سانس آزاد فضا میں لیے ہیں۔

استقبالیہ جب آخری دسویں پر تھا تو ایس کے کی آواز آئی۔ میننگ سے کچھ اطلاع آگئی تھی۔ اب وہ اس سلسلے میں صحافیوں کو یہیں خبر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک مشترکہ بیان بھی پڑھ کر سنایا۔ اس میں بھی وہی تفصیل بتائی گئی تھی کہ افسروں کی سطح پر کس وقت اور کہاں ملاقات ہوئی۔ البتہ یہ بتایا گیا کہ وزیراعظم اندرا گاندھی اور صدر بھٹو نے کھانے پر بھی بات چیت کی اور یہ ”یورنگ ڈنر“ تھا۔ اس کے بعد اخبار نویسوں کو پھر ٹیلی گراف آفس بھاگنا پڑا۔ شیلے کے نیلی گراف آفس میں دہلی سینٹرل ٹیلی گراف آفس کا عملہ لایا گیا تھا۔ کیونکہ دنیا بھر کے اخبار نویس پہنچے ہوئے تھے۔ کام کا

رش تھا۔ اس لیے اخبار نویسوں کو سہولت پہنچانے کے لیے وزارت اطلاعات نے وزارت مواصلات کے تعاون سے خصوصی انتظامات کیے تھے۔ شملہ لاہور سرکٹ کھولا گیا تھا جس کی وجہ سے صرف پانچ منٹ میں تار لاہور پہنچ جاتا تھا۔ ان کے ایم اے منصوری بھارت میں نمائندہ کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ ان لیے نئی گراف آفس میں ان کی جان پہچان بھی بہت تھی۔ رات کا کھانا ام نے والٹڈ فلاور ہال میں کھایا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں دہلی کے اشوک ہونل کی طرف سے انتظامات تھے۔

دور در گزر گئے تھے۔ بات وہیں کی وہیں تھی۔ بھارتی اخبارات بھی یہی خبریں دے رہے تھے۔ ان کا زاویہ یہ تھا کہ پاکستان مری میں طے شدہ ایجنڈے سے انحراف کر رہا ہے۔ جن سنگھ کے واجپائی کے اخباری بیانات زور و شور سے شائع ہو رہے تھے۔ جن میں بار بار اندرا گاندھی پر زور دیا جا رہا تھا کہ پاکستان سے گئے ہاتھوں وہ حصہ بھی لے لو جسے پاکستان آزاد کشمیر کہتا ہے۔ کیونکہ اس کا پاکستان کے پاس رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اکلی صبح ہم شہر جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں سردار سورن سنگھ کی یہ بات ہوتی ہے کہ آج کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا اور شام تک بات کوئی شکل اختیار کر لے گی۔ اسی امید کے ساتھ ہم چل رہے تھے۔ جمعہ کو تعطل اور بڑھ گیا تھا۔ صدر اور وزیراعظم کی اصل ملاقات نہیں ہو پاری تھی۔ آج انسروں کی سطح پر فیصلہ کن بات ہونے والی تھی۔ آج دونوں طرف سے نظر ثانی شدہ مسودوں پر غور ہونا تھا۔ خیال یہ تھا کہ شاید کوئی پہلو نکل آئے۔ ہم ہما چل بھون گئے۔ تو معلوم ہوا کہ صدر بھنوت آج پاکستانی صحافیوں سے ملنے والی ہیں اور اپنے طور بتائیں گے کہ بات چیت کہاں تک پہنچی ہے۔ بیچ میں وقت تھا۔ ہم پھر بازار کی طرف نکل گئے۔ کتاب فروشوں نے کچھ مزید کتابیں لانے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید لے آئے ہوں۔ ایک لالہ جی سے میں نے کہا تھا کہ وہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کا لٹرچر دیں۔ انہوں نے اگلے روز کا وعدہ کیا تھا۔ ان کی طرف گیا تو انہوں نے بتایا کہ کمیونسٹ لٹرچر آگیا ہے۔ اپنی دکان کے ایک کونے میں بلایا اور بڑی رازداری سے کچھ کتابیں دیکھنے کے لیے کہا۔ اس کمیونسٹ لٹرچر میں مسیم گور کی کتاب تھی اور اس کے علاوہ

تمام وہ بریٹینڈائی لٹرچر تھا جو روس کا سفارت خانہ پاکستان میں مفت تقسیم کرتا ہے۔ اور اخبارات کے دفاتر میں تو بڈل کے بڈل پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے لالہ جی سے کہا کہ یہ تو روں کا لٹرچر ہے جو ہمیں مفت مل جاتا ہے اور بڑی تعداد میں ہمیں تو بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کا لٹرچر درکار تھا۔ خیر انہوں نے معذرت کر لی۔ ہم نے "ایشیا بک اسٹال" اور "منروا بک ڈپو" سے کچھ مزید کتابیں خریدیں۔ ہمارے موضوعات تو پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش تھے۔ بنگلہ دیش برٹونی کی کتاب خاصی بک رہی تھی۔ سبرامنیہم کی کتاب بھی تھی۔ کچھ چالو کتابیں تھیں۔ جن میں خبریں سچا کر دی گئی تھیں۔ ان دکانوں پر اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ کتابوں کی تلاش میں سب مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہم نے اپنی بڑاوری میں سے کسی کو ریکارڈوں کی دکان پر جاتے نہیں دیکھا مگر بھارتی اخبارات نے آج یہ خبر جما دی تھی کہ بھارتی فلمی ریکارڈوں کی خریداری کے لیے پاکستانی وفد کے ارکان ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ بھارتی اخبار نویس اپنی کتابوں کے مقابلے میں اپنے ریکارڈوں کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ ورنہ ہم تو ان کی کتابوں کے زیادہ قائل تھے کہ ان کے ہاں نہ صرف ان کی قدیم تاریخ، ان کی تحریک آزادی، آزادی کے بعد کے بھارت اور "بنگلہ دیش" کے قیام کے لیے بھارت کی "جدوجہد" اور مسلح مداخلت تک پر کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں پاکستان کی تاریخ، سیاست اور عاشری پہنچوں پر بڑی اچھی کتابیں ملتی ہیں ایک اردو اخبار نے تو یہ بھی خبر لگائی کہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سیکریٹری جنرل شرعی عزیز احمد نے ایک دکان سے میٹس کے ریکارڈ خریدے۔

آج ساڑھے تین بجے کے قریب افسروں کی سطح پر ملاقات شروع ہوئی جو سوا گھنٹہ تک جاری رہی۔ افسر پھر اپنے اپنے سربراہوں کو رپورٹ دینے کے لیے چلے گئے۔ آج کی وقت صدر بھنوت اور وزیراعظم اندرا گاندھی کی ملاقات بھی متوقع تھی۔ ہم چھ بجے کے قریب ہما چل بھون پہنچ گئے۔ کیونکہ صدر بھنوت پاکستانی صحافیوں سے ملنے والے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ صدر، وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملنے کے لیے جانے والے ہیں۔ اس لیے صدر

کی اخبار نویسوں سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ہم ہمارا چل بھول کے خوب صورت لان میں بیٹھ گئے۔ جس سے شملہ کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔ سرسبز پہاڑ، گنگائی ہوئی ادایاں۔ اس ہرے بھرے ماحول اور حسین فضا میں ہمیں آپس کی بات چیت میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ بھارت اب تک ہم پر ذلت آمیز امن مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افسروں کی سطح پر ملاقات میں پہلے روز بھارت نے جو مسودہ پیش کیا وہ تو اعلان پاشتند سے بھی بدتر تھا۔ اس میں بھارت نے بالکل ایک فارغ کی زبان میں گنگو کی تھی۔ لہجہ عجیب تھا، شرطیں عجیب تر۔ کہنا یہ تھا کہ پاکستان جارحیت سے باز نہیں آئے گا۔ پہلے بھی اس نے مین بار حملہ کیا ہے۔ اب اسے جتنی قیدی واپس مل گئے اور حالات پر سکون ہوئے تو وہ پھر تیاری کرے گا اور کسی نہ کسی روز پھر یہ حملہ کر دے گا جتنی قیدی تو واپس نہیں مل سکتے اس کے لیے تو بنگلہ دیش سے پوچھنا پڑے گا کیونکہ پاکستانی فوجوں نے بھارتی فوجوں اور ملٹی فوج کے مشترکہ کمانڈر جنرل جگ جیت سنگھ ارڈا کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

ایک شرط یہ تھی پاکستانی فوج کی تعداد بھارتی فوج کے مقابلے میں آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیے۔ پھر یہ کہ بھارت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ دو پاکستان کی اسلحہ ساز فیکٹریوں اور فوجوں کی انسپشن کے لیے ماہرین بھیج سکے۔

ایک عجیب پابندی یہ تھی کہ آپ عرب ملکوں سے فوجی سسٹم میں کوئی مدد نہیں لیں گے۔ آپ اپنے فوجی اقتصادی تعلقات کے لیے مشرق وسطیٰ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے برصغیر کی طرف رجوع کریں۔ مطلب یہ کہ بھارت کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں خاصہ اسلحہ تیار ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیے یہیں سے خرید لیا کریں۔

کشمیر کی موجودہ فائر بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیں۔ یہ مسئلہ آپس میں طے چاہیے اس کو کسی ادارے یا دوسرے فریق کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

مغربی پاکستان کی سرحدوں کی حد بندی بھی کئی مقامات پر غلط ہے۔ اس سے بھارت کو دفاعی طور پر نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے ان سرحدوں میں بھی رد و بدل ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کا یکمشت طے ہونا ضروری ہے کیونکہ 25 برس سے ان مسائل کے باعث ہی بار بار پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑتی ہے۔

یہ شرائط انتہائی خطرناک تھیں اور ایک طرح سے پاکستان کو بھارت کا غلام بنالینے کے مترادف۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے بیورو کریٹ اس کے خلاف ڈٹ گئے اور انہوں نے اس ڈرافٹ کو ٹیکس مسٹر دکر دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ ڈرافٹ اس قدر ذلت آمیز ہے کہ اسے مذاکرات کی بنیاد بھی نہیں بنایا جاسکتا۔

بھارتی بیورو کریٹس کو بالکل غلطی نظر نہیں آئی اور دیکھا کہ پاکستانی وفد اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ تو انہوں نے نظر ثانی کے لیے حامی بھری۔ پاکستان نے بھی اپنا ڈرافٹ پیش کیا۔ آج جس وقت ہم ہمارا چل بھول کے دسیج لان میں بیٹھے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ اس وقت تک پاکستان اور بھارت کی طرف سے تین تین ڈرافٹوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ آخری ڈرافٹ دونوں سربراہوں کے پاس تھے۔ اس وقت انہی ڈرافٹوں پر بات ہو رہی تھی اور دونوں سربراہ بالکل اسیے تھے۔ درحقیقت یہ پہلی سربراہ ملاقات تھی۔ کیونکہ دونوں سربراہ اکیلے مل رہے تھے۔ پھر افسروں کی سطح پر تفصیلی ملاقات ہو چکی تھیں۔ دونوں طرف سے جتنی ڈرافٹ پیش کیے جا چکے تھے۔ افسروں کو اب مزید کوئی کوشش نہ کرنا تھی۔ دونوں سربراہوں کو اب ادھر یا ادھر کا فیصلہ کرنا تھا۔ دونوں کو اس بات کا اختیار بھی تھا۔

ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ہمارے پروفٹول کے ایک صاحب نے آکر کہا کہ آپ لوگوں کے اعزاز میں بھارت نے ثقافتی شو کا اہتمام کر رکھا ہے۔ وہ شروع ہو رہا ہے چلیے۔ ہمیں بھی ہمارا چل بھول میں رکنا تھا کیونکہ صدر بھنوا اور مسز اندرا گاندھی کو بھی اس ثقافتی پروگرام میں آنا تھا۔ ہمارا چل بھول کا بال بہت خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ روایتی کرپان بلم، تلوار، دوچار پر لگی تھیں۔ بال مہمانوں اور میزبانوں سے بھرا تھا۔ اگلی قطار خالی تھی۔ جس پر معززین کو آکر بیٹھنا تھا۔ اناؤنسر انتہائی شستہ اردو میں اعلان کر رہے تھے۔

اناؤنسر نے بتایا کہ صدر بھنوا اور مسز اندرا گاندھی بھی۔ کچھ دیر میں پہنچا ہی چاہتے ہیں اس درمیانی عرصے میں ہم

آپس میں بات کرتے تھے سردار سون سنگھ صدر بھٹو کے
بائیں ہاتھ بیٹھے تھے۔ وہ بھی آپس میں بات کرتے تھے۔
بدھائی کا رقص چل رہا تھا۔ نور کا عوامی رقص تھا۔ بول
کچھ یوں تھے۔ "ہا چل پرویش بھارت کا تاج ہے۔ اس کی
اوچی اوچی برف پوش چوٹیاں مرناں پرندے کی کٹھنی کی طرح
ہیں نیچے میدانی علاقہ ہے۔ مشکل ترین حالات میں رہنے
والے یہاں کے محنتی اور جفاکش لوگ ہنسی خوشی ہر مشکل کا
سامنا کرتے ہیں۔"

ایک گیت "میر یا وزیر!....." ہندوؤں میں ذات
پات اور چھوت چھات کے بارے میں تھا۔ ایک سردار
ایک عام خاندان کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ذات پات
کی دیواریں توڑ کر ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں اور یہ
ثابت کر دکھاتے ہیں کہ وہ محبت کرنے والے دلوں کو کوئی
طاقت جدا نہیں کر سکتی۔

ہا چل پرویش کے وار حکومت میں بیٹھے، ہم اس
پہاڑی صوبے کے مختلف اضلاع کے رقص اور ثقافتی
مناظر دیکھ رہے تھے۔ سرسوری تالی چاک رقص ایک دو
گانا تھا۔ کچھو کچھو جس کے بارے میں بتا گیا کہ پنجاب
میں جس طرح ہیر گائی جاتی ہے اسی طرح سارے ہا چل
میں کچھو گایا جاتا ہے۔

رانی اورانی منت اندا کچھو
بیری بھری آں ہندو قاتا
میرے جندے بیری بھری آں
ہندو قاتا

(کچھو۔ کچھو سے درخواست کرتی ہے۔ کچھ تو اس طرح
رات بے رات مت آیا کر دشمنوں نے تجھے مارنے کے لیے
اپنی بندو قیں بھر رکھی ہیں۔)

"ہم آزاد ہیں۔ ہماری اپنی حکومت ہے۔ ملک تیزی
کے ساتھ شاہراہ تری پر گامزن ہے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچ
گئی ہے۔ جگہ جگہ کارخانے چل گئے ہیں۔ نہریں بن گئی
ہیں۔ کھلے نیلے آسمان پر ایک ستارہ کی طرح ہمارا ملک دک
اٹھا ہے۔"

آخر میں گدا تھا۔ جو خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس
کے ساتھ پروگرام ختم ہو گیا۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے
تھے۔ دونوں سربراہ بھی۔ ہم باہر مال میں آئے۔ صدر بھٹو

اپنا پروگرام کچھ تبدیل کر کے پیش کریں گے۔ معزز مہمانوں
کے آنے کے بعد پروگرام پھر ترتیب سے پیش کیا جائے گا۔
اناؤنسر کی اردو بھی نہایت شستہ تھی اور جملے معنی خیز تھے۔
رقص اور گیت واجبی سے تھے۔ معلوم یہ ہوا تھا کہ یہ لوگ کلو
کے پہاڑی علاقے سے آئے ہیں اور پھر پروگرام بھی سارا
پہاڑی ہے۔ اس لیے رقص اور گیتوں میں تیزی نہیں ہے۔
گیت پہاڑی پنجابی میں تھے کچھ کچھ میں آ جاتے تھے کچھ
اوپر سے گزر جاتے تھے۔ میرے ساتھ طارق عزیز بیٹھے
تھے۔ اناؤنسر کی آواز سن کر انہیں بڑا جوش آتا اور کئی خطابت
کا شوق بھی آتا مگر آداب محفل کہ خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ
نہ تھا۔ خالد حسن بھی بڑے مودبانہ انداز سے پروگرام سن
رہے تھے پہاڑی لباس میں لپٹی عورتیں جن و جمال کا ان پر
شائبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ثقافتی پروگرام کی دلچسپی اور
رقاصوں کے جمال کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ رقص دیکھنے
کے بجائے میں، احمد حسن علوی (مسادات) اور واجد محسن
انہیں اپنے نوٹس سے خبر تیار کرتے رہے۔ اسی اثناء میں صدر
بھٹو آ پہنچے اور کچھ دیر بعد سزا اندرا گاندھی۔ اس دور میں ہم
پہلی بار اس خاتون کی جھٹک دیکھ رہے تھے۔ اب نئے
سرے سے پروگرام شروع ہو گیا۔ اناؤنسر بار بار اس بات پر
زور دیتے تھے کہ برصغیر کی ثقافت ایک ہے۔ اب جو رقص
پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ پاکستان اور ہندوستان میں مقبول
ہے۔ ان جملوں کی کات میری سمجھ میں آئی تو تھی اور کوئی
انہیں محسوس کرتا یا نہ کرتا۔ میرے آباؤ اجداد بھی اسی علاقے
کے رہنے والے تھے۔ کانگڑو، کلو۔ یہ سب نام بچپن میں سن
رکھے تھے۔ کسولی، کالکا، میرے بچپن سے وابستہ ذخیرہ الفاظ
میں نظر آتے ہیں مگر اب ہم اپنا ایک آشیان تعمیر کر چکے ہیں۔
اس کی حفاظت کی کوشش تو کر رہے ہیں۔ اب دیکھیں کہ اس
میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں اور بھی بہت سے ممالک
ہیں جن کے درمیان سرحدیں کھینچ گئی ہیں۔ ثقافت،
معاشرت ایک ہی ہے۔ پھر بھی وہ اپنی ثقافتی اور سیاسی
وحدت قائم کیے ہوئے ہیں۔ بھارت کی بیٹی رقص کر رہی
ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ مذاکرات کا کیا ہوا ہے۔ ساتھ
میں بیٹھے ایک صاحب اشارہ دیتے ہیں بات کچھ آگے بڑھی
ہے تو دونوں سربراہ یہاں آئے ہیں اور اکتھے بیٹھے بھی ہیں۔
میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کبھی کبھی صدر صاحب اور اندرا گاندھی

اندر گاندھی کو رخصت کر چکے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ واجد شمس الحسن اور طارق عزیز ایک طرف رکے رہے۔ بھٹو صاحب نے ہماری طرف دیکھا۔ خیریت دریافت کی۔ خود ہی کہنے لگے میں آپ لوگوں سے ملنے والا تھا مگر ملاقات کا وقت درمیان میں آ گیا۔ پھر سہمی۔ ابھی ہم پھر مل رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کوئی وقت مقرر ہوا ہے تو انہوں نے بتایا کہ کل صبح دس بجے۔

ہمارے لیے یہ ایک خصوصی خبر تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی اور اخبار نویس نہیں تھا۔ طارق عزیز کو تو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہے؟ اس لیے اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہم نے ایمبمڈر سیدھے ٹیلی گراف آفس کی طرف دوڑائی۔ وہاں لوگ پاکستان کے سیکریٹری وزارت خارجہ کی بریفنگ سن کر آئے تھے۔ ان کا آج کی خبروں کا ذریعہ اخبار علی تھے۔ جو کل دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کے سبب بریفنگ کے لیے نہیں آ سکے۔ آج خبروں کا ماحصل یہ تھا کہ صدر بھٹو جواز خود وزیراعظم سے ملنے کے لیے ریٹریٹ میں گئے تھے۔ اس سے مذاکرات نے ایک فیصلہ کن سمت اختیار کی ہے۔ ممکن ہے ناکام ہوتے ہوئے مذاکرات سنبھل جائیں اور کچھ بات بن جائے۔ کشمیر آج بھی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

آج مجھے تھوڑا سا وقت ملا تو میں نے بھارت کے ایک مقتدر صحافی پران چوہڑا کا مضمون دیکھا۔

پران چوہڑا 1962ء میں سردار سون سنگھ کے ساتھ آئے تھے۔ وزیرائے خارجہ کی سطح پر بات چیت کا دو چل رہا تھا۔ پران لکھتے ہیں کہ ان مذاکرات کی رپورٹنگ کے علاوہ وہ ایک اور مشن پر بھی تھے۔ جے پرکاش نرائن نے پاک بھارت دوستی گروپ قائم کیا تھا۔ جے پرکاش نرائن پاکستان میں چند جرات مند لوگوں میں سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دہلی میں پاکستان کے ایک سابق ہائی کمشنر مسٹر بروہی کے نامذاتی خط بھی لکھا تھا۔

پران لکھتے ہیں۔ ”میں بروہی سے ملا وہ اس تجویز سے ہی کانپ گئے۔ مضبوط دل ہونے کی بجائے نرم دل ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں اس کام کے سلسلے میں کسی سے رجوع نہ کروں۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے اور اس شخص کی خیریت بھی، جو اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا

ہے۔ میں نے سوچا کہ حالات اتنے خراب نہیں ہونے چاہئیں جتنے بتائے جا رہے ہیں۔ میں نے چوہدری ظلیق الزماں سابق سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ سے ملنے کی ٹھانی۔ انہیں میں تقسیم سے پہلے جانتا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی دیر میں کھلے اور کہنے لگے۔ ایک مہاجر کی حیثیت سے کراچی میں بالکل اچھوت ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہنے لگے۔ زندگی کے آخری برسوں میں پاکستان اور بھارت کے درمیان صلح آشتی ہو جائے تو اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہوگی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے۔ کیونکہ زندگی کا باقی ماندہ عرصہ ان کے لیے بڑا قیمتی ہے۔

اس کے بعد پران چوہڑا صاحب نے مسٹر بھٹو سے ملنے کی ٹھانی۔ مسٹر بھٹو ان دنوں شہرت کے زینے طے کر رہے تھے۔ انتہائی وضع دار، پر تکلف رہنے سے بڑوں کے لیے بڑا ادب۔ سون سنگھ کے گاڑی کے پاس پہنچنے سے پہلے خود بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیتے۔ بھٹو صاحب سے میں ملا تو وہ انتہائی گرمجوشی سے ملے وہ مستقبل میں پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں اچھی توقعات رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان مذاکرات کے نتائج کا انتظار کیجیے پھر شاید دوستی گروپ کے قیام سے کچھ زیادہ ہی ممکن ہو جائے۔ اس وقت صبح اور لاپ اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ اس کے لیے کسی ملک میں بھی لابی کی ضرورت نہ ہوگی۔

پران چوہڑا لکھتے ہیں کہ ایک یہ مسٹر بھٹو تھے۔ دوسرے مسٹر بھٹو سے میں ذاتی طور پر نہیں ملا لیکن سنا بہت کچھ اپریل 1963ء میں جب پاک بھارت مذاکرات کا سلسلہ ناکام ہو کر ٹوٹ گیا اس وقت دہلی میں مسٹر بھٹو نے جو پریس کانفرنس کی۔ اس میں مسٹر بھٹو کا ایک ایک لفظ زہر میں چھپی ہوئی زبان سے نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ 1965ء کے مسٹر بھٹو کو ہم سب جانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ قابل معافی ہے۔ کیونکہ پاکستان میں مقبول ہونے کے لیے بھارت کی مخالفت انتہائی ضروری ہے۔ صدر ایوب کو پاکستانیوں کی نظروں میں مسٹر بھٹو اسی صورت میں گرا سکتے تھے کہ وہ بھارت کے خلاف بڑھ چڑھ کر نفرت پھیلائیں۔ مسٹر کرپنن نے یکے بعد دیگر بھارتی وزیرائے اعظم کو اس لیے یہ مشورہ دیا تھا کہ صدر ایوب کی سیاسی زندگی کے دوران ہی پاکستان سے

کوئی سمجھوتا کر لیا جائے بعد میں بہت مشکل ہوگا۔

سے کیا کیا توقع باندھنے بیٹھے تھے۔

اوسر مذاکرات میں ایک موز روٹھا ہو چکا تھا۔ اندرا گاندھی اور مسز بھنوک بات چیت نے ناکام ہوتے مذاکرات کو کامیابی کی امید عطا کر دی تھی۔ والٹڈ فلاور واپس جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے مسز اندرا گاندھی پاکستانی اخبار نویسوں سے ملاقات کریں گی۔ ہم نے شکر کیا ورنہ شاید صرف رات ثقافتی پروگرام میں مسز اندرا گاندھی کی جو جھٹک دیکھی تھی اس پر اکتفا کرنا پڑتا۔

اگلی صبح ہمیں جلدی تیار ہونا پڑا کیونکہ مادام اندرا گاندھی سے بات چیت کرنے کے لیے جانا تھا۔ ری ٹریٹ جہاں مسز اندرا گاندھی قیام پذیر تھیں۔ یہاں پہلے صدر بھنوک ٹھہرایا جا رہا تھا مگر بعد میں بھارتی حکومت نے جانے کیا سوچا شاید 'ری ٹریٹ' کے لفظ کو اچھا شگون نہ جانا اور وہاں خود وزیراعظم ٹھہر گئیں کیونکہ اگر برصغیر میں پائیدار امن کے قیام کی ضرورت ہے تو اس کے لیے ری ٹریٹ بھارت کو کرنا ہوگا نہ کہ پاکستان کو۔ خوب صورت ہرے بھرے لانوں میں گھری ایک پرانی سی عمارت جس سے تہائی جھانک رہی تھیں۔ وہاں جب ہم پہنچے تو لان میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ جے این بھٹ گئے تھے۔ انہوں نے مادام کے پرائیویٹ سیکریٹری سے متعارف کرا دیا۔ ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے تو مادام بھی عمارت سے آتی دکھائی دیں۔ باری باری سب کا تعارف ان سے کروایا گیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر پر نام کہے جا رہی تھیں۔ پھر وہ بیٹھ گئیں تو بات چیت شروع ہوئی ایک عجیب سی فضا تھی۔ جانے کتنے برسوں بعد ایک بھارتی سربراہ اور پاکستانی اخبار نویسوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی۔ سگڑوں تلخیاں، ہزاروں کشیدگیاں، برسوں کی دشمنیاں، صدیوں کے فاصلے سب سے پہلے بات پاکستانی صحافی کے منہ سے نکلی تو یہی۔ "آپ پاکستان کب آ رہی ہیں۔"

"آپ کے پریذیڈنٹ صاحب نے دعوت تو دی ہے دیکھئے کب آؤں۔"

"آپ گزشتہ مرتبہ کب آئی تھیں؟"

"ہڈت جی کے ساتھ لیاقت علی خان صاحب کے

زمانے میں۔"

مشرقی پاکستان کے سقوط تک یہی مسز بھنوک ہے اور آج کل ہم جن مسز بھنوک کو دیکھ رہے ہیں وہ قطعی مختلف ہے یقیناً نہیں آتا ہے کہ مسز بھنوک جیسے جذباتی شخص کو جس ناگفتہ بہ حالت میں ٹھک ملا تھا وہ اس کو بھنور سے نکال کر آگے لے چلا ہے۔ ان وقت اگر پہلے والے مسز بھنوک ہوتے تو وہ سو مرتبہ غصہ کر چکے ہوتے۔ ٹیفن پھار لیتے۔ لیکن نہیں وہ اپنے ملک کو انتہائی محمل سے آگ لے آئے ہیں۔

پران چوپڑا لکھتے ہیں۔ "اب مسز بھنوک اپنے ملک کے سب سے بڑے لیڈر ہیں جو تمام تر مشکلات اور وقتوں کے مقابلے میں بلند یوں پر جا پہنچے ہیں۔ مسز بھنوک نے صرف اپنی ذاتی مقبولیت کی طاقت پر یہ شہرت حاصل کی ہے۔ وہ نہ تو قائد ہیں اور نہ تخت کے پیچھے پوشیدہ فوجی ٹولے کا آلہ کار۔ ان کی طاقت عوام کی طاقت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کو ہجوم یا بھیڑ کی طاقت پسند ہے لیکن بہر حال یہ طاقت جتنا کی طاقت نہیں ہے۔"

یہ جذباتی، چالاک اور انتہائی تجربہ کار مسز بھنوک ہیں۔ جن سے مسز گاندھی کو ملنا ہوگا۔ وہ یقیناً ایک بڑا چیلنج ہوں گے۔ ایک ایسا شخص جس میں اپنے آپ تحفظ کی جبلت بڑی مضبوط ہے جس کا دماغ مختلف قسم کے واقعات نے اور تیز کر دیا ہے۔ وہ چوٹی کی کانفرنس سے کیا حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور مسز گاندھی کو کیا رہنمائی کرنی چاہیے کہ وہ اس میں سے کیا حاصل کریں۔

جواب ظاہر ہے کہ وہ اپنے جتنی قیدی واپس لینا چاہیں گے۔ مغربی پاکستان کے مقبوضہ علاقے حاصل کرنا چاہیں گے۔ یہی دو باتیں بنیاد ہیں سارے مسائل کی۔

آخر میں پران چوپڑا نے یہ لکھا ہے کہ مسز بھنوک کے سامنے اب دو تین باتیں ہیں انہیں فیصلہ کرنا ہے کہ وہ برصغیر جنوبی کی تعمیر نو کریں گے یا اس عمل سے باہر رہ جائیں گے لیکن اگر وہ تعمیر نو کے لیے تیار ہیں تو انہیں ان تبدیلیوں کو تسلیم کرنا ہوگا جو کم از کم جزوی طور پر ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں اگر وہ جاتے ہوئے یہ احساس بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو بڑی بات ہوگی۔

پران چوپڑا بھارت کے بڑے پرائے صحافی ہیں۔ ان کا طویل اقتباس میں نے صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ اس

آپ کا جی بھی چاہتا ہے آنے کو؟“ ان میں جی چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال نہیں ہے اگر میرے جانے سے کچھ فائدہ ہوگا تو ضرور جاؤں گی۔“

بعد میں دوسرے موضوعات پر بھی بات چیت ہوئی اندرا گاندھی ویسے تو انتہائی اعتدال سے بات کر رہی تھیں ان کا عورت پن بھی بات بات میں جھلکتا تھا۔ ان کے بالوں میں سفیدی اور جواب دیتے وقت مسکراہٹ۔ ڈپلومیٹک مسکراہٹ سے زیادہ زنانہ مسکراہٹ تھی مگر اس زنانہ مسکراہٹ کے باوجود انہوں نے انتہائی ڈھٹائی سے گزشتہ تمام جنگوں کی ذمہ داری پاکستان پر ڈالی۔ 1948ء، 1965ء، 1971ء میں ہمیشہ پاکستان نے جارحیت کی۔

اب ہم ان سے کیا بحث کرتے۔ وہ تو سفید دن کو سیاہ رات کہنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ آپ کا بڑا ملک ہے بڑا رقبہ ہے بڑی فوج ہے۔ امن کو خطرہ آپ سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہا میں بڑے اور چھوٹے ملک پر ایمان نہیں رکھتی۔ اب بھی ہمارے عوام بالخصوص سرحدی علاقوں کے عوام ڈرتے ہیں کہ پاکستان یقیناً اس پر حملہ کرے گا اور اس کا نشانہ ہم لوگ ہوں گے اس لیے اب جب کہ پاکستان کا وفد بات چیت کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس سے جارحیت کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

جنگی قیدیوں کی بات چلی تو انہوں نے اس کو بھی پاکستان کے حملے کے خوف سے نپٹی کر دیا۔ جنگی قیدی تربیت یافتہ فوجی اگر آپ کو واپس کر دیں تو پھر آپ ہم پر حملہ کر دیں گے پھر جنگی قیدیوں نے ہماری اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس لیے بنگلہ دیش کی اجازت اس سلسلے میں ضروری ہے۔

پاکستان نامنجز کے ایجنے کے برکی نے سوال کیا۔ مادام آپ کہتی ہیں کہ جنگی قیدی تربیت یافتہ فوجی ہیں جنگ نہ کرنے کی ضمانت لیے بغیر انہیں کیسے بھیجا جاسکتا ہے آپ جانتی ہیں کہ ہمارے ہاں افرادی طاقت کی کمی نہیں ہے۔ ہم اتنے ڈویژن اور بھی تیار کر سکتے ہیں۔ جہاں تک اسلحہ کے لیے وسائل کا سوال ہے۔“

یہاں مادام اندرا گاندھی نے بیچ میں سوال کاٹتے

ہوئے لقمہ دیا۔

”مجھے معلوم ہے وہ بھی بہت ہیں۔“
”پھر۔“ ایک صاحب نے کہا۔ ”جنگی قیدیوں کو رکھنے سے آپ کیوں کہتی ہیں کہ ہم حملہ نہیں کریں گے۔ یہ تو نیت کی بات ہے۔“

ان سے کہا گیا پہلے جو کچھ ہوا اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان میں غیر نمائندہ حکومتیں تھیں۔ عوام کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ اب پہلی بار منتخب نمائندہ حکومت آئی ہے۔

مادام نے کہا۔ یہ درست ہے۔ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ اب آپ کے ہاں منتخب عوامی حکومت ہے لیکن اس سے پہلے جو غیر نمائندہ حکومتیں تھیں ان کے زمانے میں پریس کا کیا کردار رہا۔

”مادام کو بتایا گیا کہ پریس بھی بہر حال حکومت کے کنٹرول میں رہا ہے۔“

بات مسئلہ کشمیر پر آئی تو پھر مادام نے کہا کہ کشمیر پر پاکستان نے حملہ کیا تھا کشمیر تو ہمارا حصہ ہے۔ یہ جارحیت ہے۔

اس پر اٹن ترین صاحب نے کہا۔ بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی ہے۔

دوسرے مسائل پر بھی بات آئی۔ مذاکرات کے سلسلے میں انہوں نے کہا کہ میں اگرچہ زیادہ ناامید نہیں ہوں لیکن کوئی خاص بات ابھی تک نہیں نکلی ہے۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

خاصی دیر بات چلتی رہی۔ ہم وہاں سے اٹھ کر آئے تو خبر سچجی کی بے تابی تھی۔ واجد کس انس کی خواہش تھی کہ ان کا اخبار پریس میں جانے والا ہوگا اگر اس کو یہ شہ سرنخی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ والٹڈ فلاور ہال میں ٹیلی گرام کا انتظام ہو چکا تھا۔ وہاں آئے تو انہوں نے جلدی جلدی تار ٹاپ کیا اور ٹیلی گرام والوں کے حوالے کیا۔ تار بہر حال وقت پر چلا گیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وقت پر ڈیلی نیوز کے دفتر میں پہنچ سکا تھا کہ نہیں۔ پورا دن ابھی باقی تھا اور مذاکرات فیصلہ کن موبز پر پہنچے ہوئے تھے۔

ہم پھر شہر کی طرف چل نکلے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ آج انڈین انفارمیشن والے ایک فلم دکھا رہے ہیں۔ فلم کے لیے وقت دو بجے تھا۔ میں نے

اور واجد صاحب نے پھر بازار میں گھومنے کا ارادہ کیا۔ کتابوں کی دکانیں ہم اچھی طرح چھان چکے تھے۔ اب ان دکانوں میں سوائے جنسی اور سستے ٹائولوں کے کچھ نہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔ احتیاطاً ایک بار پھر پوچھ لیا کہ کوئی نئی کتاب آگئی ہو تو دیکھ لیں مگر باہمی ہوئی، جتنا داس اختر کی کتاب "پاکستان میں سیاسی سازشیں لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر ایوب خان کے زوال تک" کی ہمیں بہت تلاش تھی۔ ایک دکاندار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دہلی فون کر کے منگوا دیں گے مگر اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم آج شملے کی زندگی کو اور قریب سے دیکھنے کے لیے جدید شملے سے اتر کر قدیم شملے میں چلے گئے جسے "لوئر شملہ" بھی کہا جاسکتا ہے اوپر والے اور نیچے شملے میں بڑا فرق تھا۔ اوپر انتہائی صفائی، رونق اور رنگ بکھرے تھے۔ جدید سے جدید فیشن دکھائی دیتا ہے۔ ساڑیاں، نیل باٹم، کھلے بال، لانی قمیص، پیوں والے بال، دکانوں کے چمکتے دسکتے شوکیس اور نیچے وہی مفلسوں والی زندگی۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل، جن پر مزدوروں کا ہجوم ہے مزدور بوجھ اٹھائے جا رہے ہیں۔ گاڑیاں کھینچ رہے ہیں، پچھلے کپڑوں والے غریب گندے میلے پچھلے بچے..... یہ بھی شملہ ہے۔ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے بے گھر لوگ۔ غربت ہندوستان میں بھی پاکستان کے برابر کی ہے۔ حقیقی شملے کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے ہم واپس مال روڈ پر پہنچ گئے جہاں ہماری ایسے ڈی 155 DLY ہزار انتظار کر رہی تھی۔ رزسینیا جہاں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی نزدیک ہی تھی مگر احتیاطاً ہم گاڑی ساتھ لے چلے۔ بھٹ صاحب ہمارے منتظر تھے فلم دیکھنے کے لیے ہمارے وفد کے خاصے ارکان موجود تھے۔ فلم "پاکیزہ" تھی۔ کمال امروہی کی "پاکیزہ" ہمیں بتایا گیا کہ یہ مرحوم مینا کمار کی آخری فلم تھی۔ فلم رٹین تھی۔ جس کے پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

"اس کی دنیا میں پیار گناہ تھا۔ وہ بازار میں پیدا ہوئی تھی اور تماشا بننا اس کی تقدیر میں تھا۔ وہ ہر آنے والے سانس کے ساتھ پیدا ہوتی رہی۔ ایک ایک سانس کی ان گنت زندگیاں اور بے شمار موتیں! اس نے مرگ مسلسل قبول کی لیکن اپنے وجود کو صرف اپنا جسم سمجھنے سے انکار کرتی رہی اور جب چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ناقابل برداشت ہوئی تو وہ کمال امروہی کی پاکیزہ کے

روپ میں ظاہر ہوئی۔"

ایک اہم ترین مشن پر آئے ہوئے ہم اپنے قیمتی تین گھنٹے اس فلم پر صرف کر رہے تھے۔ اس لیے اس فلم کی طرف توجہ دینا ضروری تھا مگر یہ رہا تھا کہ بار بالوجہ بٹ جاتی تھی یا پھر یہ فلم ہمیں "چونی کانفرس" معلوم ہونے لگتی اور اس کے کردار چونی کانفرس کے کردار کانفرس کی طرح اس فلم میں بھی کئی مرتبہ قحط پیدا ہوا۔ بحران رونما ہوا۔ بھارتی فلموں کے ہم پاکستانی بہت دلداد دیتے ہیں کابل جا کر دیکھتے ہیں۔ لندن میں زیادہ وقت اس نیک کام میں صرف کرتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ فلم نہ جانے کتنی اچھی فلم ہوگی۔ فلم کے رنگ بھی دلکش تھے۔ فوٹو گرافی بھی عمدہ تھی مینا کمار کی اداکاری بھی انتہائی اعلیٰ تھی مگر فلم کی کہانی وہی تھی۔ طوائف اور ایک تماش بین جاگیردار کا چکرا کہانی کئی مرتبہ درمیان میں ختم ہوئی اور کئی بار شروع ہوئی۔ کہانی پر کہانی کار کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ مکالمات بھی وہی تھے جو ایسی فلموں کے بالعموم ہوتے ہیں۔ گیت البتہ اچھے تھے اور ان میں کئی گیت ہٹ ہو چکے تھے۔ یہ گیت تو آپ پاکستان میں بھی سن چکے ہوں گے۔

ان ہی لوگوں نے

انہیں لوگوں نے لے لیا وہ پیشہ میرا

☆

چلتے چلتے، چلتے چلتے

یوں ہی کوئی مل گیا تھا، سراو چلتے چلتے

وہیں ختم کے روکنی ہے مری رات ڈھلتے ڈھلتے

☆

موسم سے عاشقانہ

اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا

☆

چلو دلدار چلو

چاند کے پار چلو

ہم ہیں تیار چلو

آؤ کھوجا میں ستاروں میں کہیں

چھوڑ دیں آج یہ دنیا یہ زمیں

چلو دلدار چلو

اپنے پانچ دنوں میں سے یہ تین گھنٹے یہاں صرف کر

نہیں ہم کیسے لوٹتے ہیں۔ آج اتوار بھی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ کچھ فوٹو گرافی کر لیں۔ بازار آدھا بند ہے آدھا کھلا ہے۔ آج آخری دن ہے۔ سفارتی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ملاقات کے مختلف اوقات معلوم ہو رہے ہیں۔ صدر بھٹو پریس کانفرنس بھی کر رہے ہیں جس کا وقت ساڑھے پانچ بجے معلوم ہوتا ہے۔ ہم بازار گھوم کر پریس ہال میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے مبصر ظفر پیای سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کی بیگم بھی ریڈیو سے کچھ پروگرام پیش کرتی ہیں۔ ایک پرچے کی ادارت بھی کرتی ہیں وہ بھی ٹیٹھی تھیں۔ کافی ویرنگ "باہمی دلچسپی" کے معاملات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ہم نے ظفر پیای صاحب کو ریڈیو پر سنا تھا۔ ظفر پیای نے ہمارے اخبارات جو کبھی کبھار ملتے تھے ان میں ہمیں پڑھا تھا۔ برصغیر میں امن کیسے قائم ہو اس پر خاصی ویرنگ بات رہی۔ ادھر طارق عزیز بہت بڑی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ بھارت کے بڑے بڑے اخبار نویس ہمہ تنگ گوش تھے۔ طارق عزیز کئی روز سے تقریر کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ آج انہیں اس "پریس کانفرنس" سے خطاب کا موقع مل گیا تھا۔ اتنی دیر میں ایک اخبار نویس آتے تھے۔ وہ سرینگر سے آئے تھے۔ کشمیر کا مسئلہ بھی اس کانفرنس میں زیر غور آتا تھا۔ اس لیے انہیں خاص طور پر بھیجا گیا تھا کہ وہ کشمیر کے موضوع پر نظر رکھیں۔

اس اخبار نویس نے بتایا کہ کشمیر میں صدر بھٹو کی اس تجویز کو بہت پسند کیا تھا۔ جو انہوں نے کسی غیر ملکی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے وقت پیش کی تھی کہ کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگوں کو دونوں ملکوں میں آزادانہ گھومنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس اخبار نویس کا کہنا تھا کہ گزشتہ 25 برس میں اس سے بہتر تجویز سامنے نہیں آئی۔ اس طرح کشمیریوں کو اپنے گھڑے رشتے داروں سے ملنے میں بھی آسانی ہوگی اور وہ اس طرح رفتہ رفتہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی راہ متعین کر سکیں گے۔

اب ہم پریس کانفرنس کے لیے ہما چل بھون کا رخ کر رہے تھے۔

بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس کے بارے میں یہاں بڑا چرچا تھا۔ بھارت کے اخبار نویسوں کو ان کی 1963ء کی دہلی کی پریس کانفرنس یاد تھی۔ اس کے بعد انہیں موقع نہیں ملا تھا کہ وہ

کے نکلے تو ہم نے پریس ہال کا رخ کیا۔ پھر ہما چل بھون جا نکلے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ سفارتی سرگرمیاں معطل ہو چکی ہیں۔ اس وقت صدر بھٹو اپنے خصوصی معاون رفیع رضا کے ساتھ بلیرڈ کھیل رہے تھے۔ ہم ابھی یہ تجزیہ ہی کر رہے تھے کہ بلیرڈ کھیلنے کا اس وقت کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ مذاکرات آگے بڑھنے کی امید تھی کہ مادام گاندھی کے پرنسپل سیکریٹری مسٹر بکسر اور مسٹر ٹی این کول سیکریٹری وزارت خارجہ کچھ فائلیں دبائے۔ ہما چل بھون میں داخل ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ صدر بھٹو کو خبر کی گئی وہ کونٹ پہنچے ہوئے بلیرڈ روم سے باہر نکلے۔ دریافت کیا۔ کیا وہ لوگ آگئے ہیں؟ بتایا گیا کہ ہاں وہ لوگ آچکے ہیں۔ پھر وہ دونوں حضرات صدر بھٹو سے ملنے چلے گئے۔ ہم نے سوچا کہ بات کچھ بڑھی ہے اور کوئی نیا موڑ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے بھارت کے یہ دونوں ڈپلومیٹ یوں اچانک ملنے آئے ہیں۔ ہم ہما چل بھون میں خبر سوچتے پھر رہے تھے مگر میسٹنگیں تھیں کہ ختم نہیں ہوتی تھیں جتنی صاحب کے کمرے میں جھانکا وہاں شیرپاؤ صاحب بھی تھے۔ ان سے کچھ بات چیت کی۔ ملک معراج خالد سے ملے اتنی دیر میں رات پڑ گئی۔ نیچے ہال میں ایک فلم دکھائی جانے والی تھی۔ "صاحب، بی بی، غلام" بہت عمدہ فلم تھی رنگین نہیں تھی۔ سیدھی سا دی بلیک اینڈ وائٹ مگر کہانی اس قدر گھمبیر، دلچسپ کہ فلم سے ادھر ادھر توجہ نہیں ہٹتی تھی۔ ایک مٹی ہوئی بوسیدہ تہذیب کی کہانی جس کے کردار جاگیردار اور نواب جو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ہیں۔ ایک بوسیدہ جاگیردارانہ نظام مٹ رہا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد زوروں پر ہے۔ گورووت اس جدوجہد کا ایک کردار تھا۔ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں حقائق کا مقابلہ کیا۔ حقائق کو پیش کیا اور پھر وہ حقائق کی تلاش میں دنیا سے گزر گیا۔ اس فلم میں جاگیردار بھی تھے تماشین جاگیردار غریب کارکن بھی اور انقلابی گوریلے بھی۔ جو انگریز فوج کو خود ساختہ بم پھینک کر ہلاک کرتے تھے۔ یہ فلم دیکھ کر اٹھے تو محسوس ہوتا تھا کہ تین گھنٹے ضائع نہیں ہوئے وحیدہ رخصت کا کردار پہلی بار دیکھا۔

اگلی صبح جب ہم اٹھے تو دو جولائی طلوع ہو چکی تھی مذاکرات کا آخری دن ابھی تک معاملہ گونگو ہی تھا۔ معلوم

بھنو صاحب کی پریس کانفرنس دیکھ سکیں۔ ہمارا پہلے سے ہی خیال تھا کہ رش بہت ہو گا لیکن اپنے آپ کو مہمان سمجھتے ہوئے ہم مطمئن تھے۔ ہمارا چل بھول جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور وقت مقررہ انتظار کرنے لگے اور یہ خیال نہ رہا کہ پریس کانفرنس میں جگہ بھی نہیں ملے گی۔ وہی ہوا تھی۔ جب پریس کانفرنس میں پہنچے تو پیچھے چند کرسیاں خالی تھیں اور بس معلوم ہوا کہ بھنو صاحب مادم اندرا گاندھی سے ملے گئے ہیں۔ یہ ناکام ہوتے مذاکرات کو کامیاب بنانے کی آخری کوشش ہیں معلوم یہی ہو رہا ہے کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے پر راز ہوا ہے اور بھارت اس کو لگے ہاتھوں حل کروانے کی فکر میں ہے۔ افسروں کی سطح پر مذاکرات تقریباً ناکام ہو چکے ہیں کچھ غیر ملکی اخبار نویس تو یہ خبر بھی بھیج چکے ہیں کہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ بھنو صاحب آگئے ہیں۔ پریس کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ بھنو صاحب نے رکی جمنوں کے بعد انکشاف کیا ہے کہ ”اگر چند منٹ قبل میں وزیراعظم اندرا گاندھی سے نہ ملا ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ ہم یہاں سے کامیاب جا رہے ہیں نہ ناکام لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ بات آگے بڑھی ہے اور ہم ڈنر سے پہلے اور ڈنر کے بعد بھی مل رہے ہیں اگر رات گئے مجھ سے میں تو شاید آپ کو کوئی خبر دے سکوں۔“

اس پریس کانفرنس میں باتیں اصول بنی ہوئیں کیونکہ ابھی بھنو صاحب کوئی خاص بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ غیر ملکی اخبار نویس، بھارتی صحافی بڑے سخت اور خطرناک قسم کے سوالات پوچھ رہے تھے اور گھبراؤ کی کوشش کر رہے تھے مگر بھنو صاحب تو پریس کانفرنس کے ماہر ہیں۔ آدی سوچ سکتا ہوا کچھ کہنے کو ہوتا تو کوئی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔

اس پریس کانفرنس سے اخبار نویس بڑے متاثر نظر آتے تھے باوجود ان کے کہ انہیں کوئی خبر نہیں ملی تھی مگر وہ مطمئن تھے کہ رات تک کچھ علم ہو ہی جائے گا۔ آج بھارت میں ہماری آخری رات تھی۔ کل صبح ہم وطن کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ نیلی گراف آفس گئے۔ پریس کانفرنس شملہ سے دوسرے مقامات پر منتقل ہو رہی تھی۔ میں صرف انٹرا اور اپنے دفتر کو یہ اطلاع بھیجتا ہوں کہ رات گیارہ بجے تک انتظار کریں۔ معاذ ملے ہونے کا امکان ہے جس میں فوجوں کی واپسی، سفارتی تعلقات کی بحالی، دوستانہ ماحول کے قیام کے سلسلے میں مختلف امور ہوں گے۔ پھر ہم پریس

ہال میں جا بیٹھے۔ دس ساڑھے دس بجے تک ہمارا چل بھول پہنچنا ہے۔ فی الحال وہاں صدر بھٹو کی طرف سے ڈنر ہے۔ اب کے شملہ میں جگہ کی تنگی اور پاکستانی وفد کی زیادہ تعداد ہونے کے سبب ضیافتیں کئی حصوں میں ہوتی رہی ہیں۔ صدر بھٹو کے ڈنر میں بھی سب مدعو نہیں ہیں۔ اس کے دعوت نامے ہماری وزارت خارجہ نے دیئے ہیں۔ کچھ ایڈیٹروں کو بلایا ہے، وزارت خارجہ کی ڈکشنری میں ایڈیٹر صرف انگریزی اخبار والا ہوتا ہے۔ مظہر علی خان، عسکری علی شاہ، واجد شمس الحسن اور امین ترین مدعو تھے۔ اردو اخبار یا رسالہ کتنا ہی موثر اور کتنی ہی اشاعت رکھتا ہو، وزارت خارجہ کے نزدیک اس کا ایڈیٹر نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم اپنا ڈنر ہوٹل گرینڈ میں ہی کھا رہے تھے۔ یہاں سے ہم ساڑھے دس بجے کے قریب ہمارا چل بھول پہنچے۔ میرے ساتھ مساوات کے احمد حسن غلوی تھے۔ ڈرائنگ روم میں واجد شمس الحسن ملے انہوں نے کہا کہ یہاں تاریخ بن رہی ہے۔ آج یہیں ٹھہرنا ہے۔ ابھی چند لمحوں میں برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھا جانے والا ہے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کیمرہ مین، فوٹو گرافر، اخبار نویس ہال میں جمع ہو رہے تھے۔ ڈرائنگ روم جہاں پریس کانفرنس ہوتی تھی وہاں سے کرسیاں میز غائب ہو چکی تھیں۔ صرف قالین بچھا تھا سوا گیارہ بجے تو ایک میز بھی آگئی۔ تھوڑی دیر بعد اسٹینڈرٹ آگئی پھر پاکستان اور بھارت کے چھوٹے پرچم آگئے۔ اخبار نویسوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ بات بن رہی تھی۔ ڈائریسیاں آگئیں، بیورو کریٹ دکھائی دینے لگے۔ سیز جیوں کے ساتھ والے دروازے پر سب کی نظریں لگی تھیں۔ نیلی ویژن والے اپنی لائٹیں درست کر رہے تھے۔ وہ گھڑی نزدیک آ رہی تھی۔ کیا طے ہوا کیا نہیں ہوا کسی کو کچھ غم نہ تھا۔ بارہ بج گئے۔ 2 جولائی نذر گئی۔ بارہ بج کر پندرہ منٹ، اسی منٹ، پچیس منٹ، تیس منٹ، پچیس منٹ۔ صدر بھٹو اور مسز گاندھی آگئی ہیں، مسز گاندھی پہلے اس کرسی پر بیٹھنے لگیں جس کے سامنے پاکستانی پرچم تھا، صدر بھٹو نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا اور دوسری کرسی پر بیٹھنے لگیں تو ان کا پرس نیچے جا پڑا ایک پروٹوکول افسر نے پرس اٹھایا۔ بارہ بج کر چالیس منٹ پر دستخط ہونے والے ہیں مسز گاندھی مسز بکمر سے انگریزی میں پوچھتی ہیں۔ ”آپ نے اسے پڑھ لینا

ہے۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ سزرگاندھی دستخط کردیتی ہیں پاکستان کے وفد کے سرکاری ارکان صدر پاکستان کے پیچھے کھڑے ہیں مگر بھارت کے وفد میں فارن سیکریٹری مسٹر کوئلہ کھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ہندوستان کے بارہ بج کر چالیس منٹ اور پاکستان کے بارہ بج کر اسی منٹ۔ معاہدہ شملہ پر دستخط ہو گئے ہیں۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ میں نیچے قالین پر دوسرے کئی اخبار نویسوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ سامنے وہ شخصیتیں ہیں جن کی فراست پر برصغیر کے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، خوشحالی اور فلاح و بہبود کا وار و مدار ہے۔ آج تاریخ کا ایک اہم باب رقم ہوا ہے۔ کون جانے یہ بات کب تک باقی رہے۔ پھر کوئی نیا سوز آ جائے۔ تاریخ کتنی جاری ہے۔ مجھے خبر بھیجتا ہے۔ ہم ادھر ادھر سے سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت کم غم ہوتا ہے۔ جتوئی صاحب کے کمرے میں جتوئی صاحب اور شیر پاؤ صاحب معاہدے کے مختلف صفحات دیکھ رہے ہیں۔ ساتھ وزارت خارجہ کے سیکریٹری جنرل جناب عزیز احمد بیٹھے ہیں اب معلوم ہوتا مشکل ہے۔ اس معاہدے کا صحیح نوبت اعلان ہو گا۔ ادھر ادھر سے سوچ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بھارت اور پاکستان مغربی سرحد پر موجود مقبوضہ علاقوں سے اپنی فوجیں ہٹالیں گے۔ کشمیر پر صورت حال جوں کی توں رہے گی۔ دوستانہ تعلقات، معاندانہ پروپیگنڈہ بند۔ تار بھیجتا ہوں۔ شملے سے ایک فون لاہور میں قتل شقائقی صاحب کو کرتا ہوں کہ وہ کراچی فون کر دیں۔ معاہدہ ہو گیا ہے۔

ہم جس مقصد کے لیے آئے تھے اس میں سے کچھ تو حاصل ہوا۔ بات چیت آگے تو چلی۔ اب ہمیں تیاری کرنی ہے۔ دو بجے والد فلاح اور ہال پہنچتے ہیں صبح چھ بجے روانگی ہے۔ بڑا سامان پہلے ہی چندی گڑھ جا چکا ہے۔ ہم سیلی کاپڑوں سے جا رہے ہیں۔ چندی گڑھ پہنچتے ہیں اور سرکاری وفد کی شملے سے آمد کا انتظار کرتے ہیں جو ہمارے بعد آنے والے تھے۔ پی آئی اے کا بونگ بھی اسی وقت اتر رہا تھا۔ جب ہمارا سیلی کاپڑا اتر آیا۔ پی آئی اے کا بونگ کراچی سے آ رہا تھا۔ اس لیے کراچی کے اخبار اسی وقت مل گئے۔ یہ ایک معجزہ ہی لگا کہ بھارت کی سرزمین پر اسی دن کے کراچی کے اخبار 8 بجے مل جائیں۔ چندی گڑھ ایئر پورٹ پر موجود بھارتی افسروں کو بڑی شکایت تھی کہ کراچی کے اخبارات میں

سمجھوتے کی جھلکیاں شائع ہو گئی ہیں جب کہ جہاں معاہدہ ہوا اس سے صرف چند میل دور چندی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبار "نری یون" میں صرف یہی لکھا گیا ہے کہ رات گئے سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ کراچی کے اخبارات میں 2 جولائی کے بجائے 3 جولائی کی ڈیٹ لائن سے سمجھوتے کی کچھ جھلکیاں بھی دے دی گئی ہیں۔ اتنے میں ایک طوفان آ گیا اور اندازہ ہو گیا کہ اب سیلی کاپڑا آنے میں دیر لگے گی۔ میں یہاں کچھ بھارتی وزراء کا روم کا روم جاننے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ہریانہ کے انتہائی سادہ منش وزیر اعلیٰ مسرمنی لال ملے۔ کھدر کے پانچاے کرتے میں ان کے پاس بیٹھا۔ بات شروع کی۔ وہ کہنے لگے۔ "اچھا ہو گیا جی۔" میں نے کہا۔ "کچھ اور بھی بتائیں۔" وہ جواب دینے لگے "یا تو جیسے آدمیاں کی باتاں ہیں ہم تو صوبے کے وزیر ہیں۔ ہم سے تو صوبے کی بات کرو۔" بات اتنی محفول ہے کہ اور بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ وی آئی پی روم تھا۔ یہاں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی بیٹھے تھے۔ گورنر بھی۔ سادہ کپڑوں میں سادہ لوگ۔ فارن سیکریٹری بھی یہاں موجود تھے۔ وہ مظہر علی خان صاحب سے بات چیت کر رہے تھے۔ منی لال صاحب مجھ سے سندھ اور پنجاب میں زراعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ آپاشی کے طریقوں میں کیا ترقی ہوئی۔ کتنی پیداوار ہے۔ ہم نے تو یہاں یہ تجربے کیے ہیں۔ اپنے علاقے کے مسائل پر ان کی بڑی ہست معلوم ہوئی تھی۔ ہریانہ اور پنجاب دونوں کا دار الحکومت چندی گڑھ میں ہے۔ منی لال صاحب نے بتایا کہ سیکریٹریٹ میں تیسری منزل پر یہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیلیا صاحب بیٹھے ہیں اور چوتھی منزل پر میں۔ نختا ہوں۔ چندی گڑھ مرکز کے زیر انتظام ہے۔ ہریانہ اور پنجاب دونوں کی حکومتوں نے کرائے پر چندی گڑھ میں دفاتر لے رکھے ہیں۔

کچھ دیر بعد صدر صاحب اور ان کی پارٹی کے سیلی کاپڑا آ گئے۔ اس کے بعد جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہم جہاز میں جا بیٹھے۔ جہاز میں چندی گڑھ سے لاہور اتنا قریب ہے کہ آئس کریم بھی نہیں کھائی جاسکتی۔ 25 منٹ کا فاصلہ اترنے اور چڑھنے سمیت یہ 25 منٹ اس سے پہلے 25 برس تک بھلے رہے ہیں۔ ہم 25 منٹ بعد لاہور پہنچ گئے۔ جہاں عوام کا عظیم اجتماع ہمنوا صاحب کے انتظار میں تھا۔

..... ختم شد



اسرار کی کوکھ سے جنم لینے والی محنت
سناٹا تلے لکھن جکاتین

شادی الوداد

شادہ ذاکر

اگر اس رات وہ میرا پیٹھ میری مدد نہ کرتیں تو.....

.....

تھا مگر وہاں میٹرک تک تعلیم کی سہولت میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے چچا کے گھر رہائش پذیر تھا جو ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔ ہم مل کر اسکول آتے جاتے اور شام کو بھی اکٹھے ہی کھینے کے لیے جاتے جس کی وجہ سے ہمارے اکثر دوست اسے میرا بھائی ہی سمجھتے تھے۔ میری والدہ بھی اس سے نہایت شفقت آمیز رویہ رکھتیں اس لیے اس کا ہمارے گھر بھی بے تکلفانہ آنا جانا تھا۔ گری کی چھٹیاں وہ اپنے گاؤں میں گزارتا۔ اس مرتبہ واپسی پر وہ اپنے بڑے بھائی کی منگنی کی خوش خبری اور منگنی لایا۔ شادی دسمبر میں مقرر ہوئی تھی۔

ہم دونوں کی شدید خواہش تھی کہ میں اس میں شرکت کروں۔ اپنے والدین کی اپنے لیے محبت اور فکر مندی کو دیکھتے ہوئے مجھے زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ مجھے اکیلے دوسرے گاؤں جانے کی اجازت دیں گے لیکن میرے اور وسیم کے شدید اور لگاتار اصرار کے باعث وہ رضامند ہو گئے لیکن شرط یہ تھی کہ رات کو میں ہر حال میں گھر واپس آ جاؤں گا۔ وسیم نے وعدہ کیا کہ اس کے بھائی مجھے واپس چھوڑ جائیں گے۔

سال تھا 1975ء کا۔ اور مہینا تھا دسمبر کا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس واقعے کو گزرے تقریباً چالیس برس بیت چکے ہیں مگر ابھی تک یہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ میرا تعلق صوبہ پنجاب کے ایک نہایت خوب صورت اور سرسبز و شاداب گاؤں سے ہے۔ والد صاحب ایک خوش حال زمیندار تھے اور والدہ دن بھر گھریلو امور اور ہماری یعنی اپنی اولاد کی دیکھ بھال اور تربیت میں مگن رہا کرتی تھیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی پھر تین بہنیں اور آخر میں میرا نمبر ہے جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنی والدہ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اگرچہ میں کم عمر تھا لیکن گاؤں کی تازہ اور عمدہ خوراک اور صاف ستھری قدرتی آب و ہوا کی وجہ سے میں نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا اور اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔

وسیم میرا بہت قریبی دوست اور ساتھی تھا۔ ہم نہ صرف ہم جماعت تھے بلکہ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ اگرچہ اس کا تعلق دوسرے گاؤں سے



شادی کے روز میں صبح سویرے بیدار ہو گیا اور ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہو گیا تاکہ شادی کے کاموں میں اپنے دوست کی مدد کر سکوں۔ شادی اگرچہ شام کو ہونا تھی لیکن گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یوں مہمانوں کی دیکھ بھال اور تیاریوں میں دن گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور شام کو رسموں کا آغاز ہو گیا۔

سہرا بندی ہونے تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ پھر بارات بینڈ باجے کے ہمراہ دھوم دھام سے روانہ ہوئی اور ناشتے گاتے بھنگڑا اڑاتے تقریباً گھنٹہ بھر میں دلہن کے ہاں پہنچے۔ وہاں ہمارا بہت پر جوش استقبال ہوا اور سردی کی وجہ سے بارات کی مٹھائی اور چائے سے تواضع کی گئی۔ پھر نکاح کی سنت ادا کی گئی۔ خطبہ نکاح اور مبارک بادوں کے طویل سلسلے کے بعد کھانے کا آغاز ہوا۔

گاؤں میں عورتوں اور مردوں کے کھانے اور بیٹھنے کا الگ الگ انتظام ہوتا ہے۔ پہلے مردوں کو کھانا بھلایا گیا پھر خواتین کا نمبر آیا۔ اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ابھی بارات کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں نے سوچا جب تک بارات واپس جائے گی اور پھر کوئی مجھے چھوڑنے جائے گا تب تک کالی دیر ہو چکی ہوگی اور میری والدہ کو بھی دیر تک بیٹھ کر میرا انتظار کرنا پڑے گا لہذا بہتر یہی ہے کہ میں اکیلا ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ویسے بھی میں اتنی مصروفیت میں ان کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ یوں میں اپنے دوست کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود تنہا گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہاں سے ہمارا گاؤں تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹے کے پیدل راستے پر تھا، جوانی کا آغاز تھا۔ ڈر، خوف کا ذہن میں دور دور تک گزرنے تھا ویسے بھی گاؤں میں اتنا پیدل چلنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ سو میں نے بھی اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کر دیا۔ میں بہت تیزی سے چل رہا تھا لیکن تھوڑی

دیر میں سردی کی شدت نے مجھے کپپانے پر مجبور کر دیا۔ بھی میں نے شارٹ کٹ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ راستہ مجھے تقریباً پندرہ منٹ پہلے پہنچا دیتا۔ یہ ایک ویران علاقہ تھا جس میں جا بجا گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں اور وسط میں قبرستان تھا۔ دن میں تو لوگ بے وض رک وہاں سے گزرتے تھے لیکن رات میں اسے استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن میں نے بے خونی سے اپنے قدموں کا رخ ادھر موڑ دیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں بتی تھی لیکن گاؤں میں لوگ جلد ہی کاروبار زندگی بند کر کے گھروں میں بند ہو جاتے ہیں اس لیے ہر طرف سناٹا تھا چونکہ چاند کی آخری تاریکیں تھیں اس لیے ہر طرف

کسی ضروری کام سے قریبی شہر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے گرم گرم دودھ کا ایک گلاس پلایا جس کی خوشبو اور ذائقہ میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ تھوڑی دیر رک کر جب میں روانہ ہونے لگا تو سردی کی شدت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے زبردستی ایک گرم شال دے دی۔ میں ان کے اخلاق اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا اور تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

گرم گرم مشروب اور شال نے سردی کی شدت کو کم کر دیا۔ ان سے ملاقات نے خوف بھی کم کر دیا تھا۔ لہذا میں تیزی سے چلا رہا اور آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ گیا۔ میری والدہ میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ پورا واقعہ سن کر وہ ان ناویدہ خاتون کی شکر گزار ہوئیں اور مجھے صبح شال واپس کرنے کی ہدایت کی اور پھر ہم سونے چلے گئے۔

دوسرے دن بھائی کے ساتھ بانٹیک پڑ میں شال واپس کرنے کے لیے جانے لگا تو میری والدہ نے تحفہ ان کے لیے کچھ تازہ پھل بھی دیے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو آدم نہ آدم زاد، دور دور تک کسی جھوپڑی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بھائی سمجھے شاید میں جگہ بھول گیا ہوں لہذا ہم نے اس علاقے میں دور تک تلاش کیا۔ حیرت سے میرا برا حال تھا۔ پھر ہم مسجد گئے اور امام صاحب سے جھوپڑی کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ وہاں گزشتہ بیس برس سے رہائش پذیر ہیں لیکن انہوں نے آج تک وہاں کوئی جھوپڑی نہیں دیکھی۔

جب میں نے انہیں پورا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا اللہ کے راز اللہ ہی جانے۔ نہ جانے وہ اللہ تعالیٰ کی کون سی مخلوق تھی جس نے اس رات میری مدد کی۔ اس راز سے آج تک پروہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اگرچہ انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن میں کافی عرصہ خوفزدہ رہا اور اس راستے پر پھر کبھی تنہا نہیں گیا۔

☆☆☆

تاریکی کا راج تھا۔ دور دور تک آدم نہ آدم زاد اور مکمل خاموشی ایسے میں پاؤں کے نیچے چرچراتے پتوں کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ جب کوئی برندا اڑتا یا کوئی چھوٹا سا جانور بھاگ کر پاس سے گزرتا تو میں چونک جاتا۔ رفتہ رفتہ ویرانی تاریکی اور مہیب سنائے نے مجھ پر ہیبت طاری کرنا شروع کر دی۔ ایسے میں درختوں کے سائے بھی عجیب شکلیں اختیار کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا اور بخیریت گھر پہنچنے کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی نارنج تھی جس کی روشنی میں تھوڑی دور تک نظر آ جاتا تھا۔ میں تقریباً بیس پچیس منٹ میں قبرستان تک پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے مدھم سے بلب کی روشنی میں مجھے کچھ کتے محو آرام نظر آئے۔ میری موجودگی سے چونکا ہو کر وہ بھونکنے لگے اور چند ایک تو میرے پیچھے لپک کر آئے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا لیکن تھوڑی دور جا کر جھازیوں میں الجھ کر میں بری طرح گر گیا۔ ویسے تو مجھے معمولی خراشیں آئی تھیں لیکن وہاں پر ایک درخت کا کٹا ہوا تنہا جس سے ٹکرا کر میری ٹانگ شدید زخمی ہو گئی اور خون بہنے لگا۔ اب تک میں کتوں کی ہنج سے دور آچکا تھا۔

نارنج کی روشنی میں دیکھا تو زخم گہرا تھا اور میرے پاس فون روکنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اچانک مجھے کچھ فاصلے پر ایک مدھم سی روشنی غمگینی ہوئی نظر آئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک جھوپڑی میں دیا جل رہا ہے۔ میں نے ان سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پکارنے پر ایک ضعیفہ باہر آئیں اور میری بات سن کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے ایک کپڑا اور دوائی دی۔ میں نے زخم صاف کر کے دوائی لگا کر پٹی باندھ لی جس سے خون رک گیا۔

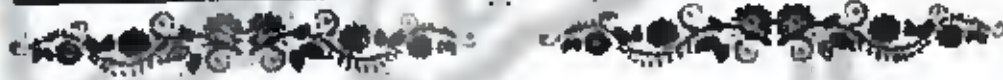
انہوں نے بتایا کہ وہ بے اولاد ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ برسوں سے یہاں مقیم ہیں جو آج



پہلا میراج حسن

کنزہ ملک

بچپن کی ایک نیکی ٹہرا اسرار طور پر اس دوشیزہ کو بہت بڑے نقصان سے بچا گئی



تھی۔ مجھے بارش میں نہانے کا بہت شوق ہے۔ اسی لیے
چھت پہ جا کر بارش کی ننھی ننھی بوندوں سے لطف اندوز

موسلا دھار بارش جاری تھی اور شام کا وقت
تھا۔ میں چھت پہ جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہی



Downloaded From
Paksociety.com

ہونا چاہتی تھی۔ آخری سیر می چڑھتے ہوئے میری نظر سامنے چھت کے آخری کونے پر پڑی تو میں حیران رہ گئی۔ معصوم کالے رنگ کالی کا بچہ ٹھنڈی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ مجھے جانوروں سے بہت ڈر لگتا ہے، جانوروں میں، بلی، کتے، ہوں تو اور بھی زیادہ دور بھاگتی ہوں۔ مگر بلی کے اس بلوگڑے کو دیکھ کر نجانے کیوں جذبہ ہمدردی جاگ اٹھا۔ اسی جذبے کے تحت میں آگے بڑھی۔ بلوگڑے کو اٹھایا اور فوراً چھت سے نیچے اتر آئی۔ کمرے میں جا کر بلی کے بلوگڑے کو اچھی طرح تولیے سے صاف کیا، اور پیالے میں دودھ ڈال کر پلایا۔

مجھے اس بلی کے بچے پر بہت پیار آ رہا تھا۔ ایسا پیارا بچہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالی سیاہ رنگت، اُس کی آنکھیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں۔ میں اُسے بانہوں میں بھر کر پیار کرتی رہی۔ وہ شاید بھوکا تھا۔ جب دودھ کا پیالہ اُس کے سامنے رکھا تو اُس نے لپ لپ کر کے دودھ پیا اور زبان سے منہ صاف کیا اور پے سکون ہو کر اونگھنے لگا۔ اُس کی پیاس بجھ چکی تھی اور اب کانپ بھی نہیں رہا تھا۔ میں اُس کو کمرے میں چھوڑ کر پھر سے چھت پہ چلی گئی۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔

گری کا زور ٹوٹ گیا تھا چرند، پرند اور حضرت انسان خوش ہو گئے تھے۔ میں چھت پہ کھڑی ارد گرد کے نظارے کر رہی تھی۔ بچے گلی میں بارش کے پانی میں کھیل رہے تھے اور سڑک پہ گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ ہر چہرہ خوشی سے جھمکا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں روح کو سکون بخش رہی تھیں۔

میں شاید چھت پہ اور ٹھہرتی مگر ماں جی کی آواز پہ مجھے نیچے کمرے میں جانا پڑا۔ کمرے میں داخل ہوئی تو بلی کا بچہ غائب تھا۔

ہیں.....! یہ کہاں گیا میں نے چار پائی کے نیچے، بیڈ کے نیچے دیکھا مگر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ جا چکا تھا، احسان فراموش۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور خود سے باتیں کرتی میں گھر کے کاموں میں جست گئی۔

بہ دو سال گزرتے چلے گئے۔ میں لڑکپن سے جوانی میں پہنچی تو ماں باپ نے میری شادی کر دی۔ اکمل ہنس مکھ اور پیار کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ساس، سر شادی کے چند سال بعد فوت ہو گئے۔ زندگی بڑی خوش گوار گزر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تین بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نواز دیا۔ میری بڑی بیٹی رمشا دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، فریجہ پانچویں اور نسیم علیشاہ مکتب میں دوڑتی تھیں۔ بیٹے علی ساتویں اور کاشان چھٹی میں پڑھتے تھے۔

جون کا مہینہ تھا۔ گرمیوں کی چٹیاں اسکولوں میں ہو چکی تھیں۔ رمشا محلے میں ٹیوشن جاتی تھی۔ بورڈ کا امتحان جو تھا۔ خوب تیاری کرنی تھی۔ علی اور کاشان، فریجہ نانو کے گھر چلے گئے تھے۔

اکمل کی دوسرے شہر پوسٹنگ ہو گئی تھی اور پندرہ دن بعد گھر کا چکر لگاتے تھے۔ میرا گھر شہر کے مضافاتی علاقے میں تھا۔ یہاں چند خاندان آباد تھے۔ پے سکون ماحول، نہ گاڑیوں کا دھواں نہ شور و غل..... لیکن..... لیکن ایک دن میری زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ میں کانپ اٹھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب رمشا ہانپتی کانپتی، بکھرے بالوں، خوف زدہ چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ پاؤں میں جوتے غائب، نہ کندھے پر بیک۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

”ماں!“

رمشانے گھر میں داخل ہوتے ہی پکارا اور زور دار چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ یہ مغرب سے کچھ دیر پہلے کا وقت تھا۔ میں نے رمشا کو اٹھایا اور بیڈ تک لے گئی۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ اُس کے منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ مجھے سب کام بھول گئے۔ نسیم علیشاہ بھی رو رہی تھی۔

میں نے اکمل کو فون کیا کہ وہ جلدی گھر آجائیں۔ انہوں نے آج ہی گھر آنا تھا مگر رات گیارہ بارہ بجے گھر آتے تھے۔ وہ ابھی آفس میں

تھے۔ خیر میری کال سنتے ہی وہ گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

میں ہسپتال کی مدد سے رمشا کو ہسپتال لی گئی اور اکمل بھی جلدی آگئے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد رمشا کو ہوش آیا تو ہم گھر آگئے۔ اگلی صبح جب میں نے رمشا سے پوچھا۔

”بیٹے..... کیا ہوا تھا۔ تمہیں؟“
”ای!“

پھر جو اُس نے بتایا تو حیران ہونے کے لیے کافی تھا۔ آج احسان فراموش اپنا بدلہ چکا گیا تھا۔ اب مجھے اُس کا احسان مند ہونا تھا۔ رمشا ٹیوشن سنٹر سے گھر آرہی تھی۔ راستے میں انسانی بھیڑیے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ انسانی روپ میں شیطانوں نے میری بیٹی کو نوچنا چاہا۔ جانے دو آوراہ کتے کب سے میرے بیٹی کے پیچھے پڑے تھے اور اپنے ناپاک ارادوں سے میری بیٹی کی عزت خاک میں ملانا چاہتے تھے۔ نیوشن سنٹر سے گھر تک آنے میں کھیتوں سے گزر کر آنا پڑا تھا۔

رمشا جب کھیتوں سے گزر رہی تھی تو اُس وقت ان درندوں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یہ درندے اچانک رمشا کے سامنے آگئے اور اس سے بدتمیزی کرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میری بیٹی بے آبرو ہو کر جیتے جی مر جاتی۔ کھیتوں سے موٹا تازہ بوڑھا سا بلا نکلا اور آنا فانا چاروں درندوں کے چہرے نوچ لیے۔

اُن کے چہروں سے خون فوارے کی طرح پھوٹ پڑا تھا اور رمشا اُن کے چنگل سے آزاد ہو کر گھر کی طرف بھاگی۔ جوتے وہیں رہ گئے، بیک بھی دوپٹہ بھی۔

آج اللہ نے میری لاج رکھ لی تھی۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔ میرے لبوں پہ خیر کے کلمات نکل رہے تھے۔ ابھی ہم ماں بیٹی صحن میں بیٹھی ہاتھیں کر رہی تھیں کہ دیوار سے میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔ میری نظریں آواز کے تعاقب میں اٹھ گئیں اور دوسرے لمحے میری بیٹی رمشا خوشی

ہم پیار سکھانے والے ہیں

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو
اس شہر میں نفیے پہنچو
بستی میں ہمیں بھی رہنہ دو
ہم پالن ہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پیئے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

(شاعر: احمد فراز)

سے کہہ رہی تھی۔

”ای! یہی بلا تھا۔“ جس نے مجھے بچایا۔ جس نے میری عزت بچائی۔ ای یہی تھا۔ یہی تھا۔“

اور مجھے پہنچانے میں دیر نہیں لگی تھی۔ یہ وہی بلا تھا جس کو بارش میں اس کے بچپن میں کمرے میں لے جا کر دودھ پلایا تھا۔ اُس کی بھوک مٹائی تھی، اُس کی جان بچائی تھی۔

آج اُس نے میری بیٹی کی عزت، آبرو بچا کر بدلہ چکا دیا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا اور میں سوچ رہی تھی انسانوں سے یہ جانور بھلے جو احسان فراموش نہیں ہوتے۔ انسان تو انسانوں کو نوچتے پھرتے ہیں۔

اُس کے بعد میں بلے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ دیوار سے نیچے اُتر آئے گا اور میں اُس کی بے پناہ خدمت کروں گی۔ لیکن وہ دیوار سے ایسے غائب ہوا جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ نہ میں دیوار سے نیچے اُترتے دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی غائب ہو گیا تھا۔ یا وہ واقعی بلا تھا..... یا اُس کا تعلق جنات سے تھا؟ اس سوال کا جواب بھلا کون دے سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- Open Paksociety Page.
- Click Liked.
- Select Get Notifications.
- Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow



جوان والا مکان

عظمیٰ یوسف زئی

اس گھر کی داستان عجب جس میں جو بھی کرایہ دار آیا جلدی اس کا اپنا مکان ہو جاتا تھا

سویا ہوا ہے، میں کیا کروں۔ اب مجھ سے برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا تو میں نے وہیں چھت پر ایک کونے میں پیشاب کر لیا۔ پاکی کا خیال تو بہت رکھتا تھا تو استنجے کے لیے ڈھیلا استعمال کر لیا اور چھت پر پانی کا ٹل لگا تھا ہاتھ دھو کر دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ایک بات بتاؤں کہ میں اپنے جوتوں اور چپل کا خاص خیال رکھتا تھا کیونکہ میرے والدین سفید پوش ہیں۔ وہ خراب ہونے پر بار بار چیزیں لے کر نہیں دے سکتے۔ اس لیے میں ہر چیز حفاظت اور محبت سے سنبھال کر رکھتا تھا۔ اپنی سینڈلوں کو میں سوتے وقت اپنے قریب رکھتا تھا کیونکہ یہ بہت اچھی تھیں اور ہوائی جہاز کے نازوں سے بنی ہوئی تھیں اور مجھے بہت پسند تھیں ابھی مجھے لینے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرے سر ہانے آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ایک پوری فیکٹی تھی جن میں مرد عورت اور بچے تھے۔ عورت کے چہرے پر نقاب تھا آدمی نے مجھ سے کہا۔ ”اچھا ہماری جگہ پر پیشاب کرتا ہے۔ ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے میری سینڈل اٹھائی اور اس کا اسٹریپ اکھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ سب غائب ہو

میری پھوپھو شاہ فیصل کالونی میں رہتی ہیں۔ ہم بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ ان کے گھر کی چھت پر اثرات ہیں لیکن کبھی کسی کو کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اس لیے اس بات کو زیادہ توجہ نہیں دی دیے بھی بچپن تھا کھیل کود کے دن تھے۔ مجھے ایک واقعہ ان کے گھر کی چھت پر پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے پھوپھا جن کو ہم بڑے ابو کہتے تھے کافی بیمار رہ کر فوت ہو گئے۔ ان کے چالیسویں والے دن گھر میں بہت مہمان تھے۔ گھر بھرا ہوا تھا۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی بھی تھی۔ ہم لڑکے رات کو اوپر سونے چلے گئے۔ میرے بڑے بھائی انور اور میرے دو کزنز عامر اور آصف تھے ہم نے دوسری منزل پر بڑی ریت کے اوپر چادر بچھائی اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

ان دنوں گلی محلوں میں بڑی وارداتیں ہو رہی تھیں اس لیے گھر والے ہر ممکن انتظام کر کے سوتے تھے۔ چھت پر بھی تالا لگا ہوتا تھا کہ برابر کے گھروں سے کوئی کود کر نہ آجائے۔ ہمارے چھت پر آنے کے بعد لا علمی میں کسی نے تالا لگا دیا اور ہمیں بتانہ چلا۔

آدھی رات کو مجھے پیشاب آنے کی وجہ سے آنکھ کھلی۔ میں نیچے جانے کے لیے اٹھا تو گرل والے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ پورا گھر

کہ کبھی جڑا نہ کبھی پہننا نصیب ہوا۔
ان کے کرائے داروں کو لگتا ہے کہ چھت پر بچے بھاگ
دوڑ رہے ہیں جب جا کر دیکھو تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ
بہت اچھے ہیں اگر کرائے دار اچھے نیک نمازی ہوں، صفائی
والے اور پڑھائی والے ہوں تو بہت پھلتے پھوٹتے ہیں اور
زیادہ تر اپنے گھر والے یعنی کرائے سے ذاتی مکان میں
شفٹ ہو جاتے ہیں۔ اکثر شادیاں ضرور اس گھر میں ہوتی
ہیں یہ گھر سب کو بہت راس آتا ہے۔

میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں اور میرا ایک بیٹا
پانچ مہینے کا محمد سالک خان ہے۔ میں میسر و چینل میں
ایڈیٹر ہوں اور شاہ فیصل کالونی میں پھوپو کے گھر کے
پاس ہی کرائے پر رہائش ہے۔ میں نے بھی چاہا کہ پھوپو
کے گھر کرائے پر اوپر والا پورشن لے لوں لیکن وہ خالی ہی
نہیں ہو رہا تھا مگر مجھے امید ہے میں پھر سے اس گھر کے
پوشیدہ مہینوں سے ملاقات ضرور کروں گا۔

☆☆☆

گئے۔ صبح ہوئی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ خواب تھا یا
حقیقت کیونکہ میرا دماغ سن سا ہو گیا تھا لیکن جب
میری نظر اپنی چپلوں پر پڑی تو میں حیران ہو گیا۔
کیونکہ اس کا ایک اسٹریپ ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے بھائی
اور کزنز کو پتا نہیں کہ رات کو کیا ہوا۔ خیر میں نے اپنی
پیاری سینڈل کے اسٹریپ کو چھت پر ہر جگہ تلاش کیا
پھر باہر گلی میں بھی دیکھا لیکن نہیں ملا بعد میں وہ
سینڈل کئی بار موچی کو بھیجی لیکن وہ جڑی ہی نہیں اور
پہننا نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے میں
نے کبھی چھت پر پیشاب نہیں کیا۔ بعد میں پھوپو
کے گھر والوں نے بتایا کہ اکثر چھت پر لوگوں کی
موجودگی کا احساس ہوتا ہے بلکہ جن لوگوں کا خون
ہلکا ہوا ان کو وہ لوگ نظر بھی آتے ہیں لیکن کبھی کسی کا
برا نہیں ہوا تو تم نے ان کی جگہ پر پیشاب کیا تھا تو
مجھے سمجھ کر ایک چھوٹی سی سزا دی کہ جس چیز کو تم عزیز
سمجھتے تھے تو وہ توڑ دی یعنی چپل کا اسٹریپ ایسا توڑا





اکتالیسویں رات



جو اداحہ

اس شخص کی کہانی جس نے جن کو قابو کر لیا تھا، مگر عمل کی آخری رات...

کر لیا ہے اور دن کا بھی۔

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ یاں یہ مت کر اس میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے لیکن وہ نہیں مانا۔ خیر انہوں نے وہ عمل شروع کر دیا پہلے چالیس دن تو اچھی طرح سے گزرے۔ اکتالیسویں دن وہ ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”آج آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ دیے بھی آج آخری رات ہے پھر اس کے بعد مرنے ہی مرنے ہیں، ہم نہیں مانے لیکن اس کی ضد کے سامنے ہم نے ہتھیار ڈال ہی دیے۔

ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک دریا ہے جہاں دریا کے نزدیک کوئی آبادی نہیں ہے۔ درختوں سے بھرا ہوا ایریا ہے۔ اس جگہ کا انتخاب انہوں نے کیا تھا۔ آدھی رات کو ہم تینوں وہاں پر پہنچے۔ تو اس نے کہا کہ آپ دونوں یہیں پر بیٹھ جائیں میرا انتظار کرے وہاں آپ لوگوں کے سامنے دریا کے کنارے میں اپنا عمل شروع کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اور دو دوست یہیں پر بیٹھ گئے اور وہ دریا کے کنارے جا کر اپنے ارد گرد دائرے کھینچ کر وہیں بیٹھ

یہ واقعہ جو میں لوگوں کو بتانے جا رہا ہوں یہ بالکل ایک سچا واقعہ ہے ہمارے محلے میں ایک 75 سالہ بزرگ رہتے ہیں ان کے آنکھوں کے سامنے یہ ناقابل فراموش واقعہ ہوا ہے انہوں نے مجھے خود سنایا ہے۔ لیجئے ان کی زبانی پڑھیے۔

میرا نام رحمان اللہ ہے یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں 25 سال کا تھا یعنی یہ پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے دو دوست سب سے بہترین دوست تھے ہم تین لوگ بہت اچھے ساتھی تھے۔ ہر جگہ ایک ساتھ جاتے تھے۔ ان میرا ایک دوست جن کو جنات قابو کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر جگہ گیا، ہر عامل کے پاس گیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر اسے ایک جنات سے متعلق ایک کتاب ملی۔ اس کتاب میں جنات کو قابو کرنے کا طریقہ لکھا ہوا تھا اس نے وہ کتاب مجھے دکھائی اور کہا کہ یہ اکتالیس دن کا عمل ہے جسے مجھے اکیلے ہی آدھی رات کو کسی سنسان جگہ پر کرنا ہے اور میں نے اس عمل کو کرنے کے لئے جگہ کا بھی انتخاب

گیا جو ہمیں دکھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد دریا کے دوسرے کنارے دو لمبے آدمی آئے۔ تقریباً ان کی لمبائی 20.22 فٹ تو ہوگی۔ جیسے ہی وہ دونوں آئے ہم دونوں ڈر گئے اور ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ ان دونوں کے آنے سے دریا میں بھینسوں کا ایک جھنڈ پتا نہیں کہاں سے آگیا۔ چاند مکمل تھا اور وہ ہمیں صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا۔

”مجھے تو بہت بھوک لگی ہے“ تو دوسرے نے بھینسوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

”یہ تمہارے سامنے کھانا پڑا ہے اور تم نہیں کھا رہے“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ایک بھینس کو اٹھا کر ایک ہی نوالے میں سارا کا سارا کھا گیا پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اسی طرح سارے بھینس وہ کھا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس سے تو میرا پیٹ نہیں بھرا“ تو دوسرے نے جواب دیا ”کہ جو تمہارے سامنے آدمی بیٹھا ہے اس کو کھا لو“ جیسے ہی اس نے یہ کہا

اس نے فوراً ہاتھ بڑھایا اور ہمارا دوست جو دائرے میں بیٹھا تھا اس کو اٹھایا جیسے ہی اس آدمی نے میرے دوست کو اٹھایا ہم دونوں نے اپنے جوتوں کو بھی وہیں چھوڑا اور تیز اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اپنے محلے پہنچ کر میں نے اپنے دوست سے کہا۔

”کل جیسے مجھے ہو ہمیں صبح سویرے وہاں جانا ہے“ اور گھر آگیا۔ صبح آنکھ کھلی تو بہت تیز بخار تھا اور اس بخار میں بھی گھر سے نکلا اور دوست کو لے کر رات والی جگہ پر پہنچا لیکن وہاں پر میرے مرے دوست کی لاش اور ہمارے جوتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں حیران ہوں کہ آخر ایسی کونسی غلطی ہوئی میرے دوست سے جو انہوں نے اس کی جان لے لی۔ پہلے چالیس راتیں تو اچھی طرح سے گزریں لیکن اکتالیسویں رات آخر اس سے ایسا کیا ہوا؟ جس کا جواب مجھے ابھی تک نہ ملا۔

☆☆.....☆☆



زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جھاڑنے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 21

آصف نے خبر پڑھنے کے بعد در شہوار کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ جاننے کے بعد ہی اپنا رد عمل ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ اس خبر کو خدا کی مدد سمجھا جائے یا اس پر افسوس کیا جائے۔

”ہمیں وقت مل گیا ہے آصف اب ہم اپنی بیٹی کو اس مصیبت سے بچا سکتے ہیں اس کا تسلی بخش علاج ہونے کے بعد ہی اس کی شادی کریں گے۔“ در شہوار نے کہا۔ آصف کی بھی ہوتی آنکھوں میں ایک چمک سی لبرائی پھر سوچ کی گہری لکیروں نے اس کی جگہ لے لی۔

”پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ رحمن نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا ہے یہ بہت ہی غیر یقینی اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ صنوبر کے حوالے سے سوچتا ہوں تو یہ اچھا ہوا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں ایسی باتوں کو کتنا بڑا طوفان بنا دیا جاتا ہے یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس شادی کو کچھ عرصے لیے ملتوی کرتے تب بھی اسی قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ملتوی کا مطلب ہمیشہ ملتوی نہیں ہوتا لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے اصل میں شادی ختم کی گئی ہے بس زیادہ بڑے رد عمل کی وجہ سے خاتمے کو ملتوی کا نام دیا گیا ہے اور ایسے حالات میں کوئی نہ کوئی مناسب عذر بھی ضرور ڈھونڈ لیا جاتا ہے جس کے سہارے لوگوں کے سوالوں کا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو در شہوار جس معاملے میں لوگ سوال جواب سے تشنہ رہ جائیں اس معاملے کو برسوں تک بھی پایا نہیں جاسکتا لوگ کسی نہ کسی بہانے اس کا تذکرہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ایسا ہوتا پھر رحمن پر بیت رہی ہوتی ہے ان کے لیے کہیں جانا اور کسی بھی محفل یا کسی بھی گروپ کا سامنا کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے یہ ہم ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔“ آصف کی اس لمبی چوڑی تقریر کو در شہوار نے بہت غور سے سنا اس کے ایک ایک لفظ سے وہ متشغف تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ جب قدرت کی طرف سے انسان پر کوئی مصیبت آن گری تو یہ اس کی زندگی میں اس کی بہترین ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کا امتحان ہوتا ہے اس لیے وہ بولی۔

”اب جو بھی ہو آصف ہمیں اپنی بیٹی کو دنیا کی ہر بات پر فوقیت دینا ہی ہوگی یہی سب والدین کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے۔ میں بہر حال اس خبر کو اپنی صنوبر کے لیے ایک گڈ نیوز سمجھتی ہوں۔“

آصف نے اس کی بات پر صاف کیا۔ لیکن ساتھ ہی اس تجسس کا بھی اظہار کر دیا کہ ہمیں کم سے کم یہ تو ضرور پتا ہونا چاہیے کہ رحمن کے بڑے فیصلے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ دونوں نے اس سے بھی پہلے اس بات پر

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جادو خیال کیا کہ انہیں صنوبر کو یہ خبر کیسے سنائی ہے۔

☆.....☆

سلمان ابراہیم کے لیے ہر چند کہ اس کھیل کو کچھ اور دن جاری رکھنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر تک فارس کے جسم کے اندر رہے اس سے وہ سارے کام نے جو اسے صنوبر سے بہت دور لے جانے کا سبب بنیں اور پھر اس کا جسم چھوڑے اور صنوبر کے گھر پہنچ کر جائزہ لے کہ اس کے ان کارناموں کا وہاں کیا رد عمل ہو رہا ہے۔ اس وقت بھی وہ فارس کے جسم میں ہی تھا اور فارس کو سلائے کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ رخصت اس پھڑکے بعد کیا کرنے والا ہے کیا وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر سے نکال باہر کرے گا یا کوئی اور قدم اٹھائے گا۔ سلمان ابراہیم یہ نہیں جانتا تھا کہ رخصت نے رات ہی کو اپنے بیٹے کی نہ صرف شادی ختم کر دی تھی بلکہ اسے جائداد سے بھی عاق کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اگلا قدم اٹھانے میں تذبذب کا شکار تھا۔

فارس کی ماں بیگم رخصت نے جب یہ خبر دیکھی تو ان کے پیروں تلے زمین کھسک گئی ان کے شوہر نے فیصلہ کرنے میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا تھا وہ اپنے غصے پر قابو کرنے اور بہترین فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو چکے تھے انھوں نے فارس کو جائداد سے الگ کر کے اس کی شادی ختم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس نے انہیں سارے وجود سے دھلا دیا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ کر ہی بہت پریشان تھیں کہ فارس تو ابھی اس طرح سارا دن اپنے کمرے میں بند نہیں ہوتا پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا کہ وہ پورا دن سوتا رہا رات کو بس کھانا کھانے باہر نکلا اور کھانا بھی اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مقدار میں کھایا ایک ڈکاری اور واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اس نے کسی سے بات نہیں کی تو کسی اور کو اس سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اس کی بہن فرح ناز نے ایک بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی سرخ انگارہ جیسی وحشت زدہ اور ڈرا دینے والی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ فرح ناز نے مارے جہیز کے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو انھوں نے اسے جیب رسنے کا اشارہ کیا۔ فارس نے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں کو فارس کی حرکتوں پر گہری تشویش ہو چکی تھی اس لیے فارس کے جاتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور فرح ناز بولی۔

”ماما فارس بھائی نے کھانا کتنا کھایا ہے جیسے وہ کوئی مہینے بھر کے بھوکے ہیں!“

”پتا نہیں بیٹا مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آخراً فارس کو ہوا کیا ہے وہ ایسا کیوں بنی ہو کر رہا ہے جیسے ہم اس کے کچھ نہیں لگتے اور وہ یہاں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے۔ سارا دن وہ شوہر کو فون لگاتی رہی تھیں مگر رخصت صاحب نے ایک بار بھی ان کی کال اٹینڈ نہیں کی ان کا فون سائیلٹ پر تھا اس لیے انہیں خبر تک نہیں ہوئی کہ کون کون انہیں کتنی دیر سے اور کتنی بے چینی سے فون کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری معروفیات کو ترک کر کے خود کو جیم خانہ کے ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔ انہیں ایسا بھی لگ رہا تھا کہ اگر سوچوں کی یہ یلغار روکی نہ جاسکی تو کہیں ان کے دماغ کی شریان پھٹ نہ جائے۔ اس لیے انھوں نے سکون آور دوا کی دگنی مقدار کھائی اور سو گئے۔ ادھر گھر میں شدید پریشانی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب بیگم رخصت کو پتا چلا کہ ان کے شوہر تو دو پہر سے پہلے کے دفتر سے نکلے ہوئے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں کیونکہ خلاف توقع انھوں نے اپنے ذرا بیوہ کو بھی ساتھ میں رکھنے سے گریز کیا تھا اور بہت عرصے بعد خود گاڑی ذرا بچو کرتے ہوئے وہ پہلے ادھر ادھر گھومتے رہے پھر جیم خانہ چلے گئے۔ اتنے بڑے سرمایہ دار کو ادھر ادھر بلا وجہ گھومتے ہوئے اگر کسی میڈیا کے بندے نے دیکھ لیا ہوتا تو وہ آنا قاتل بریکنگ نیوز بن جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

☆.....☆

صنوبر کے گھر میں اس خبر پر صبح آصف اور ورشہوار نے تفصیل سے بات چیت کر لی تھی اور جب ان کا بیٹا سلمان نیند سے بیدار ہوا تو انھوں نے اسے بھی وہ خبر کی راز کی طرح سنائی اور سلمان کی بھی جیسے بولتی بند ہو گئی کہ خبر پڑھ کے کہیں اس کے دماغ میں بھی ایسی گھنٹیاں بجنے لگیں کہ اگر اس نے خود کو اپنے باپ کا فرماں بردار نہ بنایا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا انجام بھی فارس جیسا ہو۔ وہ چپ تھا اور اس کی سوچیں پتا نہیں کہاں کہاں کی سیر کر چکی تھیں۔

”کیا سوچنے لگے؟“ آصف نے پوچھا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیا ہوا ہوگا جو رحمن انکل نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ انھوں نے اپنی اس شہرت کی بھی پروا نہیں کی کہ جو اس خبر سے اب تک مٹی میں مل چکی ہوگی۔“

”ہم نے اب تک بھی صنوبر سے بات نہیں کی ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ اس سے کس طرح اور کیسے بات کریں۔ تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ یہ پہلا موقع تھا جب سلمان کے والد نے اس سے بات کی وہ بھی اس طرح اس لہجے میں جیسے وہ اسے واقعی کسی قابل سمجھتے ہیں۔ سلمان کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھرنے لگیں اور وہ بھی ایک قسم کی الجھن میں پھنس گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی اور پھر سلمان نے پوچھا۔

”ماما کہاں ہیں اس وقت؟“

”صنوبر جاگ چکی ہے وہ اسی کے پاس ہے۔ مجھے رحمن سے بات کرنے جانا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی ہے جو اس نے یہ فیصلہ لیا ہے مگر اس کا فون بند ہے آفس سے وہ جاتے کے ساتھ ہی نکل گیا تھا زیادہ سے زیادہ دس منٹ رکا ہوگا۔ گھر پر فون کیا تھا جو معلوم ہوا کہ فون تو اپنے کمرے میں موجود ہے لیکن وہ کسی سے کوئی بات نہیں کر رہا البتہ رحمن گھر والوں کا فون بھی نہیں اٹھا رہا جس کی وجہ سے اس کی بیگم اور بنی بہت پریشان ہیں کہ آخر رحمن چلا کہاں گیا ہے۔ اس پھولیشن میں جب کہ ہمیں خود کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہے جسے بتا کر ہم صنوبر کو مطمئن کر سکیں ہماری خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ ہم تو صنوبر کی خراب حالت کی وجہ سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ اس حالت میں اس کی رخصتی نہ ہو تو اچھا ہوگا۔ تاکہ ہمیں اس کا علاج کرانے کا وقت مل جائے لیکن یہ تو پورا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم سے زیادہ پریشانی کی خبر تو وہاں سے آگئی ہے۔“

”اب صنوبر کیسی ہے؟“ آصف کی بات ختم ہونے کے بعد سلمان نے پوچھا۔

”میں اس سے ملا نہیں ہوں۔ بس دور دیکھا ہے۔ میں یہاں تمہارے پاس چلا آیا اور تمہاری ماما صنوبر کے پاس ہیں بظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی، اس کا چہرہ پرسکون تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ویسے بھی پہلے بھی یہی ہوا تھا وہ ایک دم سے بیمار ہوئی تھی اور ایک دم ہی ٹھیک ہو گئی جب میں اسے امریکا لے جانے کی بات کر چکا تھا۔ دونوں باریک بات کا سن رہی وہ یہ کہ صنوبر کو ایک ذرا سائل بھی اپنی پیاری کایا دینا ہے اسے تو حیرت ہوتی ہے جب ہم اس کی ایکسٹرا کئیر کرتے ہیں تو۔“ آصف کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ اپنے اس نظر انداز کیے ہوئے بیٹے سے نہیں بلکہ اپنے کسی خاص انسان سے بات کر رہے ہیں جس سے وہ اپنا ہر راز و نیاز کر سکتے ہیں۔

”ڈاکٹر نے اس وقت اس قسم کی کسی بیماری کو تسلیم کیا تھا؟“ سلمان نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ آصف کو اس کی بات میں چھپی ہوئی وہ پریشانی محسوس ہو گئی جس پر وہ کسی بھی قیمت پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا تھا۔

”کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ صنوبر کسی جن دغیرہ کے قبضے میں ہے۔ کمزور عقیدے کی عورتیں اکثر اس قسم کی لغو باتیں کیا کرتی ہیں اور تمہاری ماما بھی ایک عورت ہی ہے اسے بھی ان فضول باتوں پر یقین آ جاتا ہے۔“ آصف کا لہجہ قدرے سخت ہو رہا تھا۔

”لیکن پاپا یہ تو قرآن سے ثابت ہے کہ جنات ہوتے ہیں تو پھر اس بات کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟“ سلمان نے سوچا پہلے اپنے باپ کی سوچ کا بھرپور انداز میں جائزہ لے لے تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ اسے کس قسم کی لائن آف ڈائرکشن پر کام کرنا ہے۔

”میں بھی یہ مانتا ہوں، ہر مسلمان کو مانتا پڑتا ہے کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کلام کے ایک ایک لفظ پر ایمان لانے سے ہی ایمان کامل ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے من پسند حصوں پر آپ ایمان لائیں اور باقی کو رد کر دیں۔ مجھے معلوم ہے اس کتاب کی ہر بات پتھر پر لکھی لکیر سے بھی زیادہ اہم اور ناقابل تردید ہے۔ لیکن بیٹے یہ روحانی جو معاملات ہوتے ہیں ان کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ یقین کی منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ایک ڈاکٹر کی ڈگریاں دیکھ کر آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کا علم کیا ہے اور ہم اس پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ لیکن روحانی معاملے میں بھروسہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر اگر آپ غلطی سے بھی کسی دھوکے باز کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ تو ساری عمر آپ

کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اب آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ کسی ڈاکٹر کو تو آپ اس بنیاد پر تبدیل کر سکتے ہیں کہ اس نے غلط پریشانی کے ذریعے آپ کے پختہ وقت کو نقصان پہنچایا ہے لیکن ایک روحانی عامل کو کس بنیاد پر تبدیل کیا جائے یا اسے غلط ثابت کیا جائے۔ اس لیے اس قسم کے چکروں میں پھنسنے کا مطلب یہ کہ اس کا کوئی انت نہیں ہے۔ میں ایسا کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔

”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں پایا لیکن کیا آپ کو ڈاکٹر نے ایسا کچھ بتایا کہ جو علامات صوبہ کی بیماری میں ہمیں نظر آتی ہیں وہ کسی بیماری میں ہوتی ہیں۔ جیسے اسے یہ یا اندہ ہنا کہ اسے کوئی بیماری ہوئی بھی یا نہیں یا پھر اس کا ایسے ری ایکٹ کرنا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے حتیٰ کہ اسے اپنی بیماری کے دوران ہونے والا کوئی بھی واقعہ ذرا سا بھی یاد نہیں رہتا۔ لہذا وہ اس بات پر حیران ہو رہی ہوتی ہے ہم اس کے ارد گرد کیوں جمع ہیں۔“

”میںٹل ڈس آرڈر“ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی بھی ایسا انسان جو ان تفصیلات میں دلچسپی نہ لینا چاہے اس کے لیے انھیں جاننا تقریباً ناممکن ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس بیماری کی کئی شکلیں اور قسمیں آتی ہیں کوئی مریض ایسے ری ایکٹ کرتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا وہ بالکل ٹھیک ہے اور کوئی ایسا بن جاتا ہے جیسے بیماری جس کو ہے وہ... ذہن نہیں ہے بلکہ وہ کوئی اور ہے اور یہ جو ہمارے سامنے بیٹھا ہوا ہے مریض ہے یہ کوئی اور ہے۔ یعنی دو شخصیتوں والا انسان۔ جیسے اپنی دونوں الگ الگ شخصیتیں الگ الگ انسان لگتی ہیں۔ تو اسے ایک بات دوسرے کی نہیں لگتی اس لیے وہ اسے ماننے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ اتنا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر کچھ توقف کے بعد گھبراہٹ سے بولا۔ ”اس بیماری کی ابتدا ایسے ہوتی ہے جسے صنوبر“ اتنا کہہ کر آصف نے جب سادھ کی اس کی آنکھوں میں اداسی نے ذریعے ڈال دیے تھے اور اب سلمان کو لگا کہ اس کے پایا اس سے کوئی بھی بات نہیں کر سکیں گے۔ سلمان انھیں ڈیڑھ بیٹھا چھوڑ کر صنوبر اور اپنی ماما سے ملنے جانے لگا پھر جاتے جاتے مڑا اور بولا۔

”کیا آپ نے رحمن انکل کے ہاں نہ دیا تھا کہ وہ جب اور جس وقت بھی آئیں ہمیں ضرور اطلاع کریں۔“

”ہاں کہہ تو دیا تھا مگر ہم کیا زیادہ رات ہو جانے پر اس کی طرف جا سکیں گے؟“ آصف کو لگا کہ یہ کافی مشکل ہوگا۔

”ان کے ساتھ ساتھ ہماری بھی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ ہمیں بھی جاننے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ان کو ہے اس لیے رات کتنی بھی جا چکی ہو وقت کچھ بھی ہو ہم ان کی طرف ضرور جائیں گے۔“ سلمان یہ کہہ کر چلا گیا اور آصف کے دل کو جو بری طرح بے چین اور بے قرار تھا کسی قدر سکون کا احساس ہوا۔

کیا واقعی اس کا بیٹا اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرنے کے قابل ہو چکا ہے؟ اس نے سوچا۔

☆.....☆

رحمن صاحب کی گمشدگی سے ان کی بیوی ساجدہ اور ان 19 سالہ بیٹی فرح ناز بہت ہی پریشان تھیں اور ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دلانے کے لیے ساجدہ کی چھوٹی بہن ماجدہ بھی ان ہی کے گھر میں مہم جوئی کا جدہ لاہور سے آئی تو شادی میں شرکت کرنے تھی مگر اب جو پورا کا پورا منظر بدلا تو اسے ایسا لگنے لگا کہ یہ شاید کبھی بھی ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت یہ تینوں عورتیں ایک دوسرے سے اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

”ایسا تو رحمن بھائی نے کبھی نہیں کیا وہ اس طرح کیوں کر رہے ہیں آفس میں بھی نہیں ہیں اور اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے، انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا کہ ہم لوگوں پر کیا گزر رہی ہے“ ماجدہ اپنی چھوٹی بہن کی بات سن کر ساجدہ جیمہ رحمن نے اس کی طرف ایک قسم کی بے بسی سے دیکھا اور بولیں۔

”ایسا مت کہو ساجی! پتا نہیں رحمن خود کس مشکل میں ہیں ہم سب کو صرف اپنے دکھ اپنی پریشانیوں ہی سب سے زیادہ اہم لگتی ہیں دوسرے کا درد ہمیں دردی نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے رحمن ہم سے زیادہ تکلیف میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کریں“

”مگر باجی ذرا سوچیں اس طرح الگ الگ پریشان ہونے سے تو کسی کی بھی تکلیف کم نہیں ہوگی انھیں چاہیے تھا وہ ہمارا

حوصلہ بڑھاتے اور ہم ان کی دل جوئی کرتے تو نسب کا ورہ کچھ کم ہو جاتا۔
 ”آئی ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما۔ فیڈی کو اس طرح خود کو ہم سے الگ نہیں کرنا چاہیے انھیں اس وقت یہاں ہمارے ساتھ
 ہونا چاہیے۔“

فرح نازی کی بات سننے کے بعد ساجدہ سوچنے لگی کہ میں تم لوگوں کو کیسے بتاؤں کہ فارس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا
 ہے۔ وہ اندر تک ٹوٹ کے بکھر چکا ہے، رخصت نے منع نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں بتاتی کہ فارس نے اپنے اس باپ کے منع پر پھنر
 مار دیا ہے جس سے ساری زندگی وہ نظریں ملا کر بات نہیں کر سکا۔ اتنی بڑی تبدیلی، اتنا بڑا طوفان کیسے اور کیوں آیا رخصت کی
 نہیں میری بھی عقل و نگ رہ گئی ہے۔

”رخصت بھائی نے فارس کو جامد اور اپنی وراثت سے کیوں الگ کر دیا ہے۔ ناراضگی اور جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔
 لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے سب رشتے ایک جھٹکے میں ختم کر دے اور تو اور اسے اس کے سارے
 حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے آپ کے کون سے سات آٹھ وارث ہیں کہ ایک کو عاق کر دیا تو دوسرا اس کی جگہ لے لے
 گا اللہ اسے لمبی عمر دے ایک فارس ہی آپ لوگوں کی کل کائنات ہے اور وہ ہی ہر قسم کی میراث کا مالک ہے۔ اسی کو کچھ
 نہیں دینے گئے تو کسے دیں گے؟“

”تم چپ کر جاؤ ماجدہ پلیز چپ کر جاؤ۔ تم کچھ نہیں جانتیں کہ کیا قیامت نوٹی ہے ہمارے گھر پر۔۔۔۔۔ رخصت کو اس قیامت
 نے جڑوں تک سے ہلا کے رکھ دیا ہے۔ انھیں سنبھالنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ رخصت کو
 ہمت دے حوصلہ دے کہیں وہ جذبات میں آکر کوئی غلط قدم نہ اٹھالیں۔“

”لیکن باجی بات کیا ہوئی ہے۔ آپ تو نے تو کہا تھا کہ فارس نے بدتمیزی کی ہے جس کا رخصت بھائی کو بہت صدمہ پہنچا
 ہے اور اب آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ ضرور کوئی اور بات ہے جسے آپ چھپا رہی ہیں آپ کس قیامت کا ذکر کر رہی
 ہیں۔ پلیز باجی مجھے ضرور بتائیں تو میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔“ ساجدہ نے ایک بھیگی اور گہری نظروں سے
 ماجدہ اور فرح نازی دیکھا اور ساری بات سارا واقعہ جو رخصت صاحب نے انھیں سناتے ہوئے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا وہ
 سب کا سب ان دونوں کو بتا دیا جیسے وہ مجبور ہو گئی ہوں۔ بتانے پر ان کی بات جیسے ہی ختم ہوئی ماجدہ کی ایک فلک شکاف چیخ
 نکلی اور وہ بے ساختہ بولی۔

”اوہ میرے اللہ۔۔۔ فارس نے اتنی بدتمیزی کی۔ میں تو اس حد تک فارس کے آگے بڑھ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس
 نے تو رخصت بھائی کا سارا غرور، سارا مان اور ان کی ساری عزت جیسے پاؤں تلے کچل ڈالی۔ میں فارس کو اتنا بے ہودہ اور بدتمیز
 نہیں سمجھتی تھی۔ سچ کہا آپ نے باجی فارس نے تو حد ہی کر دی۔“

”لیکن ماما انھوں نے ایسا کیا کیوں؟ وہ بھی اس وقت جب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ صنوبر سے تو شادی کرنا
 ان کا خواب تھا پھر اپنے ہی ہاتھوں سے وہ اس خواب کو کیوں چھٹا چور کریں گے؟؟“ فرح نازی کی بات سن کر دونوں
 بہنیں چونکیں ضرور مگر ان کی سمجھ میں یہ بات بھی اسی طرح نہیں آئی جیسے وداب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ آخر فارس
 نے ایسی حرکت کی تو کی کیوں؟

”اب ہوگا کیا باجی!“ ماجدہ کے لہجے میں ایک مہیب یاسیت کا شور سنائی دیا۔
 ”پتا نہیں کیا ہوگا۔ صبح سے صنوبر کے والد اور بھائی کا مسلسل فون آرہا ہے وہ رخصت کو پوچھ رہے ہیں میری تو خود کچھ بھی
 سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں انھیں کیا جواب دوں۔“ ساجدہ نے مسلسل لہجے اور ڈھیروں پریشانیوں کے اس پار سے کہا۔
 ”ظاہر ہے وہ لڑکی والے ہیں جب انھوں نے یہ ایک اس قسم کی نیوز ویسٹی اور پڑھی ہوگی ان کے تو پیروں تلے زمین
 کھس گئی ہوگی۔ آخر اس طرح اچانک بھی کوئی شادی ختم کرتا ہے وہ بھی شادی سے چند دن پہلے۔“ ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا
 تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ خاموشی اس وقت اس گھر اور اس کمرے کے لیے زہر قاتل تھی کہ سناٹا ایسے مگر بنے لگتا تھا کہ دل
 دھڑکنے کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔

"ہمیں صنوبر کو ساری صورت حال بتا دینا چاہیے" سلمان نے در شہوار سے کہا۔

"اس کی طبیعت کہیں یہ سب سن کر کہیں اور بھی خراب نہ ہو جائے" در شہوار نے جیسی آواز میں کہا۔ وہ دونوں صنوبر کے کمرے کی راہداری میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے اس کی طبیعت پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے۔" سلمان کی بات سن کر در شہوار نے اسے اجنبیت سے دیکھا۔

"کیا... کیا کہتا چاہتے ہو؟"

"بس اتنا کہ شاید اس کی طبیعت کی خرابی کی وجہ فارس سے شادی ہی ہے۔ وہ اپنے دل پر جبر کر کے یہ شادی کر رہی تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ خوشی سے یہ شادی نہیں کر رہی تھی۔ ممکن ہے اسی دباؤ کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہوئی ہو۔ وہ چونکہ یہ فیصلہ کر چکی ہے اس لیے اب اس سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتی اور پھر بٹے بھی کیوں اور کس لیے جس انسان کے لیے وہ اپنی زندگی کو روک لگا چکی ہے وہ اسے ایسے چھوڑ کر چلا گیا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی بھی ہی نہیں۔" سلمان کی بات ختم ہوئی تو در شہوار نے کچھ اس طرح یہ الفاظ ادا کیے جیسے وہ کسی اثر میں ہوں۔

"کہیں تمہارا خیال صحیح نہ ہو۔ تو کیا ہمیں صنوبر کو سب کچھ بتا دینا چاہیے؟" پتا نہیں وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں یا سلمان سے پوچھ رہی تھیں سلمان نے یہ سنا اور بولا۔

"پاپا سے مشورہ کرتے ہیں۔ اگر وہ بھی میری اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی ہوئے تو ہمیں پھر ایک منٹ اور دیر نہیں کرنی چاہیے صنوبر کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔" سلمان نے قدم آصف کے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

"رو....." در شہوار نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ "تمہارے پاپا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کافی متاثر ہوئی ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو صنوبر کی خوشی انھیں کتنی پیاری رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس فیصلے میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ انھیں ایک فیصد بھی اس بات میں رسک معلوم ہوا تو وہ انکار کر دیں گے اور وقت کے فیصلے کا انتظار کرنے کو کہیں گے۔ میں جانتی ہوں آصف کو اپنے بچوں کے معاملے میں رسک جیسے لفظ کو وہ اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہتے اور اس معاملے میں رسک چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو ہے تو....." در شہوار کی بات سن کر سلمان پھر سے اپنی پرانی پوزیشن پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس نے ڈھیلا ٹرائزر اور شرٹ پہن رکھی تھی یہ اس کا سونے کا لباس تھا۔

"تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر آ جائے گی اور آپ سے کہے گی کہ آپ نے جو جیولریز اور بازار جانے کو کہا تھا تو اب چلیے۔ تب آپ کیا کریں گی تب آپ کیا کریں گی؟" سلمان کی بات سن کر در شہوار کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہوید ا ہوئے۔ سلمان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس حالت میں صنوبر کو بازار لے جانا بھی فضول تھا اور نامناسب بھی جبکہ اسے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے تھی۔ در شہوار کو لگا کہ اب سلمان کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسے صنوبر کو اصل بات اور پوری حقیقت بتا دینا چاہیے۔

"ٹھیک ہے پھر میں صنوبر کو حقیقت بتا دیتی ہوں۔ اس کی شادی ختم ہو چکی ہے اور اس کے گھر کے باہر رخصت کے گھر میں کوئی ایسا طوفان برپا ہے جس کا صرف شور ہی باہر کی دنیا کو سنائی دے رہا ہے۔ ہوا کیا ہے۔ یہ تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں جانتا۔ تم ایسا کر اپنے پاپا کے پاس جاؤ اور ان سے کہو رخصت کو فون کرتے رہیں شاید کوئی لمحہ کوئی وقت ایسا ہو جسے بات معلوم ہو سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے" نہ کہہ کر سلمان آصف کے کمرے کی طرف چلا گیا اور در شہوار صنوبر کے کمرے میں آ گئی۔

صنوبر فریٹ ہو چکی تھی مگر اس کے چہرے سے اب بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ پتا نہیں کب سے بیمار ہے، اس کی ساری خوبصورتی اور شادابی کو کسی مہلک غم نے مہلا کے رکھ دیا ہو۔ در شہوار کو دیکھ کر وہ جیسے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ دجاتے ہوئے بولی۔

”میں بالکل تیار ہوں مانا ہم لہجہ کر کے بازار جائیں گے یا ابھی فوراً“

”تم تو ابھی جاگی ہو۔ تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا پہلے ناشتا کر لو پھر بتاتی ہوں کہ کس وقت چلنا ہے۔“ در شہوار نے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے ماما“ صنوبر نے وحشی گراواہی میں لپٹی آواز میں کہا۔

”بھوک نہیں ہے مگر کیوں بیٹے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا پھر بھی تم نے اس شادی کے لیے ضد کی اور اب جب سے شادی کی بات پکی ہوئی ہے تم ہر روز زندگی سے اپنا رشتہ کمزور کرتی چلی جا رہی ہو۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے تم نے زندہ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب تم صرف اس گھڑی اور لمحے کی منتظر ہو جب اپنی زندگی کا چراغ گل کر دینا تمہارا مقصد ہے“ در شہوار پتا نہیں جذبات میں کیا کیا بولتی چلی گئی ایسی باتیں بھی جو ایک ماں کو زیب نہیں دیتیں۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ میں ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ میں اس میں دانستہ کچھ بھی نہیں کر رہی۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا جب کھانے کو دل نہ چاہے کوئی بات کرے تو اچھا نہ معلوم ہو چپ رہے کو دل چاہتا ہے۔ یہ سب تو کسی کے ساتھ بھی اور بھی ہو جاتا ہے اس میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ میں خود کو مارنے کا کوئی منصوبہ بنا رہی ہوں۔ کسی ایسے وقت اور لمحے کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ مجھے لے کر کچھ زیادہ ہی فکر مندی ظاہر کر رہی ہیں۔ میں ٹھیک ہوں ماما ویکھیں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے اپنا آپ انھیں دکھانے کی کوشش کی۔ در شہوار سے برداشت نہیں ہوا اور وہ بے ساختہ رو پڑی۔

”پتا نہیں میری بچی تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ہمیں اس امتحان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔“ در شہوار کی باتوں نے صنوبر کو الجھا سا دیا وہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کی ماں کو کسی نئے صدمے نے اتنا پریشان کیا ہے یا انھیں اس کی ناخوشی سے ہونے والی شادی نے پھر سے از حد دکھی کر دیا ہے۔

”کیا بات ہے ماما آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ بتائیں کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟“ صنوبر پوچھتی رہی اور در شہوار اسے ایسے سمجھاتی رہی جیسے بچوں کو بہلایا جاتا ہے۔

”کچھ نہیں ہوا تم یہاں بیٹھو۔ کھڑی مت رہو۔“ در شہوار نے اسے بیڈ پر پکڑ کے بٹھایا اور اپنی آنکھیں رگڑ کے صاف کیں۔

”تمہاری شادی ٹوٹ گئی ہے۔ دو دن بعد جو شادی ہونا تھی وہ اب کبھی بھی نہیں ہوگی۔ میری بیٹی کبھی بھی نہیں۔“

”کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ماما آخر آپ کو ہوا کیا ہے۔ کیوں ایسی عجیب عجیب باتیں کر کے میرا امتحان لیتی رہتی ہیں، میں کب سے تو آپ کو یقین دلا رہی ہوں کہ یہ شادی میں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ اور بہت خوش ہوں“ صنوبر جیسے چیخ ہی تو پڑی۔

”تم اگر آرام سے اور بہت حوصلے سے میری بات سنو گی تو میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ چھٹایا جذبات میں آکر کچھ بھی بولنا تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔“ در شہوار کی بات سننے کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک ایسی شائقی سی تیرنے لگی جیسے وہ خود کو دھیرے دھیرے نارمل کر رہی ہے۔

”میں ٹھیک ہوں اب کہیں کیا کہنا ہے آپ کو۔“ جواب میں در شہوار نے وہ اخبار پاس ہی کے وارڈروب سے نکالا اور اسے صنوبر کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”لو خود ہی پڑھ لو مگر بہت اطمینان کے ساتھ۔“ صنوبر نے وہ اخبار ایسے لیا جیسے اسے کوئی ایسی چیز دی جا رہی ہے جس کے اندر کوئی جان لیوا جانور جیسے سانپ وغیرہ چھپایا گیا ہو۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اخبار کھولا تو کوارٹر جج کے اس اشتہار پر در شہوار نے انگلی رکھتے ہوئے کہا ”اسے پڑھو“ صنوبر نے پڑھنا شروع کیا اور پڑھنے کے بعد جو کچھ در شہوار نے دیکھا وہ اس کے لیے کسی بھاری اچھٹے سے کلم نہیں تھا۔ پہلے تو صنوبر ایسے منہ مٹاتی رہی جیسے اسے کوئی چیز اپنے وجود میں اچھلتی کودتی محسوس ہو رہی ہو۔ پھر ایسا لگنے لگا جیسے وہ منہ سے کچھ بھی خارج کرنے کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے قے آرہی تھیں شاید اور... پھر یوں ہوا کہ صنوبر نے بے تکان ہنسا شروع کر دیا۔ اور ہنستے ہنستے وہ بستر پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ در شہوار کے ہاتھوں پیروں سے جیسے جان ہی نکل گئی یعنی جو خدشہ اسے روک رہا تھا صنوبر کو کچھ بھی

بتانے سے وہ درست ثابت ہوا اور صنوبر اسی دورے میں چلی گئی جو اس کی طبیعت کو خراب کرنے کا ایک اشارہ ہوتا ہے۔ وہ شاید اپنے ہوش و حواس سے بے گمانہ ہو چکی تھی۔

”یا اللہ اب میں کیا کروں گی۔ آصف تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ اب کیا کروں۔ میں ماں ہوں اس کی میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ مجھے بھی اتنی ہی پیاری ہے میری جینی جتنی اسے پیاری ہے۔“ اور شہوار اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ آصف کے سامنے کھڑی ہوئی صغائیہ پیش کر رہی ہو۔ اس کے چہرے سے حیرانہ ظاہر ہونے لگی اسے لگنے لگا کہ اس کی جینی اب نارمل نہیں رہی۔ اسے فکر ستانے لگی کہ اگر بے ہوشی سے واپس آنے کے بعد وہ اسے پہلے کی طرح کچھ بھی یاد نہیں رہا تو وہ کیا کرے گی۔ کیا پھر سے سب کچھ بتانا ہو گا۔ اور کیا وہ پھر یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ کتنے ہی سوال تھے جو اسے سانپ کی طرح ڈسنے لگے۔ اور وہ بے بسی سے رو پڑی۔ لیکن رہنے سے کیا ہونے والا تھا۔ اسے آصف کو جا کے بتانا ہی ہو گا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے کہ یہ سب میرا قصور ہے۔ میں نے ہی اسے اتنی جلدی وہ منہوں خبر پڑھوائی نہ پڑھوائی تو اسے تم سے کم اس بے ہوشی اور اس پر اسرار پیاری سے تو بچا سکتی تھی۔ اب اگر آصف نے اسے ان حالت میں دیکھ لیا تو اسے یقین ہو جائے گا صنوبر کو علاج کے لیے بیرون ملک ضرور لے جاتا ہو گا۔ بتائیں اور کیا کیا سوچا کرو۔ ابھی اور آصف کو بتانے کے لیے جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے کا ہینڈل پھرنے بھی نہیں پائی تھی کہ اسے صنوبر کی آواز سنائی دی اور وہ واپس چلی۔ کچھ دیر اس کے چہرے پر پانی کے پھینسنے مارنے سے وہ ہوش میں آ گئی۔ در شہوار کی تو خوشی کا کوئی ٹکڑا نہ نہیں رہا وہ میری صنوبر کہہ کر اس سے چمٹ گئی۔

”آپ و میری شادی کے ٹوٹ جانے کا بہت رنج ہوا ہے ماما؟“ اچھے ذرا اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔ در شہوار نے یہ سن کر اسے اپنے بازوؤں سے آزاد کیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں سب کچھ یاد ہے میری صنوبر؟“

”جی مجھے سب یاد ہے ماما“ صنوبر کی بات سن کر در شہوار کو تو جیسا ساری دنیا کی سب سے بڑی خبر سننے کو مل گئی تھی یعنی صنوبر اب پوری طرح ٹھیک ہے۔ اور اسے سب معلوم بھی ہے۔

”آپ نے پوچھا نہیں انھوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟“ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھنے کے بعد در شہوار کو یہ یقین ہونے لگا کہ صنوبر کے دماغ پر اس شادی کی ججہ سے بوجھ ہے۔ یہ بوجھ اتارنا چاہتی ہے مگر اب اسے خود ایسا لگنے لگا ہے کہ اس شادی کا بوجھ اتارنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اور اب شادی ہونے کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہیں بچا، اور اب جو یہ بوجھ خود بخود کسی انہونی کے سے انداز ہے ہو گیا ہے تو صنوبر کا سارا بوجھ اعصابی تناؤ ختم ہو گیا ہے اور وہ نارمل معلوم ہو رہی ہے۔

”پہنچنے کے لیے ہم صبح سے مسلسل فون کر رہے ہیں مگر ان لوگوں کے گھر میں تو جیسے ماتم ہو رہا ہے، رحمن کہیں چلا گیا ہے۔ کہاں؟ کوئی نہیں جانتا۔ اس نے موبائل فون بھی بند کیا ہوا ہے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا۔ اپنے آفس میں بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ فارس مسلسل سو رہا ہے اور اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکل رہا سوائے ناشتا اور کھانے کی حاجت کے۔ تین عورتیں اس گھر میں اس وقت بھٹکی ہوئی روتیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے کے علاوہ ایک ہی جگہ ایک ہی کمرے میں ایک دوسرے کا سہارا بننے کا کوشش کر رہی ہیں۔“ در شہوار کی بات ختم ہوئی تو صنوبر کسی گہری سوچ میں چلی گئی۔

”کیا سوچ رہی تھیں؟“ در شہوار اس وقت صنوبر کے اندر کیا چل رہا ہے سب جاننا چاہتی تھی۔

”سوچ رہی ہوں کہ یہ تو کوئی انہونی ہے، فارس نے ایسا کیا ہے جو رحمن انکل نے اتنا برا قدم ایسے اٹھایا جیسے وہ اب فارس کی صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔“

”صحیح کہتی ہو تم... کچھ تو ایسا ضرور ہوا ہے جو رحمن جیسے ہوشیار اور عقل مزاج آدمی نے ایسا عجیب و غریب فیصلہ لیا ہے، صاف لگ رہا ہے اتنا برا قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کسی سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اسی لیے کسی کو کچھ پتا نہیں اور صبح ہی صبح پھر سے آفس جانے کی طرح گھر سے نکل گیا ہے۔“

”کیا پاپا کو پتا چل گیا ہے اس خبر کا؟“ صنوبر نے دھیمی اور نیچی آواز سے پوچھا۔

"ہاں وہ تو اسی لیے آفس بھی نہیں گئے۔ یہ جانے بغیر کسی کو بھی فیس کرنا آسان تو نہیں ہے۔ صبح سے فونز کا بھی سامنا بندھا ہوا ہے۔ لیکن ہم کوئی بھی فون نہیں سن رہے سب پر میسج لگا دیا گیا ہے اس وقت انہیں ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ رحمن کے کونٹیکٹ میں آنے سے پہلے کچھ بھی بتانا مشکل ہے۔ کئی لوگوں کو تو جو کیدار نے یہ کہہ کر واپس کیا ہے کہ اس وقت صاحب لوگ گھر پر نہیں ہیں۔ گھر تک پہنچ رہے ہیں لوگ۔ اور ہماری بے بسی دیکھو ہم کچھ بھی نہیں جانتے کہ رحمن نے ہمیں دوسروں کے سامنے کبھرے میں کھڑا کر دیا ہے وہ بھی اس طرح کہ ہمارے پاس تو ایک گواہ جتنی باتیں بھی نہیں ہیں کسی کو بتانے کو اور تماشا یہ ہے کہ ہم گواہ نہیں بلکہ اس مقدمے کا دوسرا متاثرہ فریق ہیں۔"

"فارس گھر میں گھسنا ہوا کیا کر رہا ہے وہ اپنے پایا کو تھلاش کرنے کیوں نہیں گیا۔" صنوبر کو فارس کی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے یاد آنے لگا کہ اس کا شریفل تو سب کچھ تھا پر وہ ایسا بے حس نہیں تھا۔ اس کو سوچوں میں پھر سے جاتے و گھومتے درشہوار نے اسے کہا۔

"آؤ باہر نکلو یہاں سے ناشتا کر دیا لچ کر لو۔ آصف کو میں بتا کر آتی ہوں کہ تم بیدار ہو چکی ہو۔"

"کیا پایا بہت پریشان ہیں؟" صنوبر کے سوال پر جاتے جاتے درشہوار نے اپنی بیٹی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے لگا جیسے یہ تو وہ پرانی والی صنوبر ہے۔ جو ہمیشہ اسی طرح سے بات کیا کرتی تھی۔

"ہم صرف تمہارے لیے پریشان ہیں بیٹے۔ تم اگر یہ کہو گی کہ تم ایک دم نمٹیک ہو تو ہزاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔" درشہوار کی بات نے صنوبر کو ایک ایسے احساس سے روشناس کرایا جو اس سے پہلے اس کے دل میں جان مزیں تھا تو اسے اس کا اس شدت سے احساس نہیں تھا۔ اسے لگا اس کے والدین اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک ایسی محبت کہ اس وقت جب دنیا کے سامنے ان کی رسوائی ہو رہی ہے۔ عزت خاک میں مل رہی ہے اور ایسے وقت میں بھی انہیں اپنی اس بیٹی کی فکر ہے جس کی وجہ سے وہ ان مصیبتوں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ درشہوار کے پیچھے ہی صنوبر بھی کمرے سے نکل آئی۔

بچپن میں سہیلی کام کر رہی تھی وہ شاید بچ کا انتظام کرنے میں مصروف تھی۔ درشہوار بچن کے پاس آ کر خاموشی سے کھڑے ہو کر سہیلی کو کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی جیسے وہ دیکھ کچھ رہی ہے اور سوچ کچھ رہتی ہے ایسی حالت میں اکثر نظریں جس طرف کو ہوتی ہیں اور سب جو یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں لگا ہیں وہیں دیکھنے والا کچھ بھی رہا ہے تو یہ نمٹیک نہیں ہوتا سوچوں کی طاقت اتنی زیادہ ہوتی ہے بیٹائی اس معطل ہو کے رہ جاتی ہے اور دکھائی کچھ بھی نہیں دیتا۔ ایسا ہی کچھ اس وقت صنوبر کے ساتھ بھی تھا۔ وہ دیکھ تو سہیلی کی طرف رہی تھی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ سوچوں کی چار طرف سے ہونے والی یلغار نے اس کی دیکھنے کی صلاحیت پر قبضہ کر لیا تھا یا اسے معطل کر دیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اگر اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو شاید وہ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی یہ کہ اس کی زندگی اور قسمت اتنی عجیب ہے کس طرح اسے یہ درپے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بھی شریفل کا باپ اسے صنوبر سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے ملک سے باہر بھیج دیتا ہے اور جب وہ واپس آتا ہے تو صنوبر کو اس کے یوں اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ بتا چلتی ہے اور ان سب دنوں میں وہ کسی اندھے کی طرح یہاں وہاں بھٹکتی رہتی ہے کوئی نہیں بتاتا کہ اس کا شریفل کہاں چلا گیا ہے۔ پھر جب وہ واپس آتا ہے تو وہ اس کے ملنے کی خوشی میں اسے وہ سب کچھ معاف کر دیتی ہے اور جس نے اسے پہروں تڑپایا اور وہ بھی بے نام و نشان.... پھر شریفل اپنے باپ کے، فارس کے اور رحمن صاحب کے سامنے مضبوطی سے کھڑا ہو جاتا ہے خاندان کی تباہی با کوئی بھی اور دھمکی اسے صنوبر سے دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ محبت کی وہ مثال بن جانے کو تیار ہو جاتا ہے جہاں اچھے اچھوتوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر اس پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور پھر ایک دن وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے جیسے پہلے گیا تھا۔ وہ اس بے عزتی کے رد عمل میں فارس سے شادی کرنے کو ہاں کر دیتی ہے مین شادی سے دو دن پہلے اسے خبر مل رہی ہے کہ اس کی شادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ فارس کے باپ نے اسے اپنی وراثت سے بے دخل کر دیا ہے اور شریفل کا کہیں کچھ پتا نہیں۔ وہ شریفل کو یہ دکھ بھی نہ دے سکی وہ رد عمل میں چاہتی تھی جس طرح شریفل نے ایک بار نہیں دوبار اسے اس طرح اکیلا چھوڑ دیا کہ وہ یہ تک نہیں جانتی کہ وہ کہاں گیا ہے اور کیوں گیا ہے کب واپس آئے گا آئے گا بھی یا نہیں۔ بس

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا با نور اول کہتا تھا کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔ پتا نہیں کب لیکن آئے گا ضرور..... سوچوں بسے الجھ رہی تھی کہ سلمیٰ نے ان کے قریب آکر پوچھا۔

"اب یہی طبیعت ہے آپ کی صنوبر بی بی؟"

"میری طبیعت.....؟" تجھے کیا ہوا ہے۔" وہ ایک مختصر سا سوال کر کے خود سے ہی پوچھنے لگی اسے یا آگیا کہ ایک بار اسے سلمیٰ نے ہی بتایا تھا کہ اس پر عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے جس کے لیے اسے کسی روحانی علاج والے کو دکھانے کے بارے میں سوچا جاتا رہا تھا اور ہوسٹل بھی لے جایا گیا تھا لیکن اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ بات جیسے اسے ختم کرتا ہی بڑی کہ ان بات کو نہ دیکھتا تھا۔ لیکن اب سلمیٰ نے پھر ایسا انداز سے پوچھا تھا۔

"تجھے کیا ہوا تھا سلمیٰ؟" صنوبر کو لگا کہ اس کے اس سوال پر سلمیٰ گھبرانے لگی اور جان چھڑانے کو کھانے کے بارے میں بتانے لگی کہ اس نے آج کیا بتایا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ جبراً امت میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی" صنوبر کو تجسس ہونے لگا۔

سلمیٰ کو صنوبر کے سوال کا جواب میں بتانا ہی پڑا کہ اس پر پھر اسی نوعیت کے دورے پڑے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ نوک تو بہت پریشان ہیں لیکن اس کی بات کوئی بھی نہیں مان رہا آپ کو پیر معصوم علی شاہ کے مزار پر لے جانے اور تعویذ پلانے بہت ضروری ہیں۔ دیکھنا آپ بس دونوں میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔" سلمیٰ اس کے آگے بھی جانے کیا کچھ کہتی رہی مگر صنوبر تو جیسے الجھ چکی تھی۔ ان دونوں کا کیا مطلب ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے ایسا کیا نام ہے اس بیماری کا۔ کیا میں کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو چکی ہوں۔ سوچوں کے سمندروں میں ابھرتی ڈوبتی صنوبر اور پتا نہیں کب تک خود سے کیا کیا پوچھتی رہتی کہ اسے اپنے قریب ہی اپنے پاپا کی آواز سنائی دی۔

"کیوں بیٹے کیا یونہی کھڑی رہو گی۔ آؤ بیٹھو کھانا کھاتے ہیں" وہ چونگی اور اس نے ایک بہتر دائرہ نظر اپنے باپ پر ڈالی اس کے پیار بھرے لہجے میں جو مٹھاس بھی اس کا تھما ہل دنیا کی ساری دولت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ کھانا شروع ہوا۔ سلمان بار بار کن اکھیوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک دو بار صنوبر نے نوٹ کیا پھر پوچھ ہی لیا۔

"سلمان تم آج اپنی پونیورسٹی نہیں گئے؟" سوال غیر متوقع تھا اس لیے وہ یکتخت چوبک سا گیا۔ لیکن جواب میں بس ایک چھوٹی سی نہیں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس کے پاس جس وجہ سے وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا وہ وجہ خود صنوبر ہی تھی لیکن یہ بات کہی تو نہیں جاسکتی تھی۔ کھانا ختم ہوا اور یہ چاروں ایک بڑے سے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ چاروں جیسے یہ انتظار کر رہے کہ کوئی اور بات شروع کرے تو خاموشی کا قتل نوٹے۔ لیکن سب کے سب یہ سوچ رہے تھے کہ کیا بات کی جائے۔

آصف نے یونہی صنوبر سے پوچھا "آپ ٹھیک ہو پاپا صنوبر؟"

"جی پاپا میں ٹھیک ہوں" مختصر جواب ہی توقع کی جا رہی تھی۔

"کیوں نا ہم رحمن صاحب کے گھر جا کے اندر جانے کا گھر میں بیٹھنے کا مطالبہ کریں۔" سلمان کو انھوں نے دونوں بار باہر سے ہی واپس بھیج دیا تھا۔ سلمان کو ایسا لگا بھی جیسے اندر کوئی گڑ بڑ ہے لیکن یہ صرف کا شبہ تھا شے کی بنیاد پر کسی کے بھی گھر میں گھسا نہیں جاسکتا تھا۔ آصف نے در شہوار کی بات سنتے ہوئے صنوبر کی طرف دیکھا اور جیسے سی ان منی کر دی۔ اچانک اس کے ذہن میں ان سوال کی گونج سنائی دی کہ صنوبر ایک رات پہلے جب یہ کہہ رہی تھی کہ اس نے ہم تینوں سے الگ الگ بات کی تھی اور تینوں نے اسے اسی ایک مسئلے پر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ فارس سے شادی نہ کرے تو کیا صنوبر کسی بھی تصور کو اتنا سٹرینٹ بنا سکتی ہے کہ اسے سامنے بٹھا کر اس سے بات چیت کر سکتی ہو؟ اس نے صنوبر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"صنوبر بیٹے یہ بتائیں کیا آپ کو خواب نظر آتے ہیں؟" سوال سن کر در شہوار بھی چونکی تھی کہ یہ عجیب سا ہی سوال تھا۔ خواب تو سب ہی نظر آتے ہیں۔

"جی پاپا" صنوبر نے پھر اختصار سے کام لیا۔

"اچھا تو پھر تمہیں اگر کوئی خواب یاد ہو تو ہمیں بھی سناؤ" آصف کی بات سب کر باقی دونوں کی دلچسپی بھی باپ بیٹی کی

گفتگو میں بڑھنے لگی۔ درشہوار سوچ رہی تھی کہ ان باتوں سے آصف آخر کیا جانتا چاہتا ہے۔ صنوبر جیسے کسی سوچ میں گم ہو چکی تھی وہ شاید کوئی خواب سوچ رہی تھی جو سنانے لے قابل ہو اور اسے ٹھیک سے یاد بھی ہو۔
 ”عموماً خواب یاد نہیں رہتے“ جیسے درشہوار نے بنی کی حمایت میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے آصف کی طرف دیکھا کہ اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ آصف کیا سوچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔

پورا دن تقریباً گزر چکا تھا۔ رحمن کی اب تک بھی واپسی نہیں ہوئی تھی اور سلمان ابراہیم۔ فارس کو قابو کیے کیے تھک چکا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فوری طور پر یہاں سے نکلے اور اپنی صنوبر کی طرف جا کے یہ دیکھے کہ وہ کیا کر رہی ہے اور ان سب واقعات کے رونما ہونے کے بعد وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا جب تک فارس کے گھر میں سب کچھ نو ریٹرن پر نہیں آ جاتا اسے یہیں رہنا ہوگا۔ اسے اپنے ہم زاد کا بھی خیال آیا لیکن پھر اس خواب کو اس نے خود ہی مہزورک دیا۔ پچھلی بار اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس ہمزاد دھیرے دھیرے ایسی شکلیوں کو اپنے قابو میں کرتا جا رہا تھا کہ اگر اسے دو چار بار اور وجود عطا کیا تو ہو سکتا ہے وہ ایک الگ جن بن کر سامنے آ جائے۔ اس کی نیت میں بھی فتور آنے لگا تھا وہ شاید مستقل وجود پانے کے بارے میں سوچتے ہوئے صنوبر پر بھی بری نظر رکھنے لگا تھا اس لیے سلمان نے سوچا کہ اسے ایسے حالات میں وجود عطا کرنا خطرناک ہو سکتا ہے کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی مقصد برابری میں کوئی ایک مصیبت کے نیچے آ جائے۔ پھر اسے کنعان کا خیال آیا۔ ہمزاد کو اب کبھی بھی وجود عطا کرنے کے ارادے سے وہ باز آ گیا۔ پہلے ہمزاد اس کا وفادار تھا اور اس کے اشاروں پر چلا کرتا تھا اب ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اسے عدم سے وجود میں لے آیا گیا تو کہیں وہ کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ اسے صابو سے بھی حساب چکنا کرتا تھا جس کی وجہ سے شرجیل کو یہ دنیا چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ پھر بہت ہی کمینگی سے ایک خیال اس کے ذہن کے پردے پر طلوع ہوا کہ اگر شرجیل زندہ رہتا تو وہ صنوبر کو پانے کا خواب ہی دیکھ سکتا تھا اسے حاصل تو نہیں کر سکتا تھا اور اب بھی اسے صنوبر کو پانے کی خاطر اسے شرجیل کا ہی روپ دھارن کرنا ہوگا۔ ورنہ صنوبر کو ساری زندگی کے روگ سے نجات دلانا ناممکن نہیں ہوگا۔ کنعان نے اس کے لیے بڑی لازوال قربانی دی تھی نہ صرف وہ سردار سے اس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا لگا کر جنگ کرتا رہا اور پھر اپنا سب چھوڑ کر کوئی بھی جن اپنا قبیلہ کسی کے لیے بھی نہیں چھوڑتا مگر کنعان نے یہ بھی کر دکھایا تھا۔ پتا نہیں بابا کیسے ہوں گے اور کیا سوچتے ہوں گے۔ ضرور بے چین اور پریشان ہوں گے اور اس صورت میں تو وہ اور بھی بے چین ہو رہے ہوں گے کہ میں انھیں چھوڑ کر وہ بھی ایک بیابان میں یہاں چلا آیا جہاں آنے میں اس سے ایک دن کی اور تاخیر ہو جاتی تو اس کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا۔ صنوبر فارس کی دہن بن کے اس کی زندگی میں جا چکی ہوتی۔ سوچتے سوچتے اس نے محسوس کیا کہ فارس کا جسم اب اور سونا نہیں چاہتا تھا وہ کسمساہٹ کا شکار ہو چلا تھا اور اب اسے زیادہ دیر قابو رکھنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سلمان نے سوچ لیا تھا کہ اگر فارس نے کچھ بھی گڑ بڑ کی تو اسے جان سے مارنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ صنوبر کو پانے کا تصور ہی کس قدر فرحت انگیز تھا سارے جسم اور روح میں ایک ایسی شانتی اور مستی سرایت کرنے لگتی تھی جسے دنیا کی کوئی بھی زبان بیان کرنے سے عاجز تھی۔ الفاظ جہاں اپنی قدرت کی بے بسی کا اظہار کریں وہاں سے شروع ہوتا تھا وہ احساس سے جس نے سلمان کے دل میں کوئی نرم نرم بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا اس احساس سے باہر نکلنا جیسے جنت سے نکالے جانے والے واقعے سے بھی زیادہ درد انگیز سا محسوس تھا۔ اب منزل قریب ہے سب سے بڑی رکاوٹ اس نے اپنی ساری شکلیوں کو پروئے کا رلا کر سامنے سے ہٹا دی تھی۔ وہ سرور ہو رہا تھا اس کے من مندر میں جیسے چمچڑیاں ہی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد اس جنجال پورے سے نکل کر اپنی صنوبر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی ذی نفس جو چاہتا ہے وہ ایسے ہی کب ہوتا ہے جیسے اس نے چاہا زندگی تو جبر و قدر کی بندشوں کا ایک قید خانہ ہے بالکل ایسا ہی جیسے اس وقت وہ قید تھا فارس کے بے ایمان اور تکلیف دہ جسم میں قید اور صعوبتیں سہتا ہوا۔ اس ساری دلچسپی میں ایک بار بھی نہیں سے اسے یہ آواز سنائی نہیں کہ صنوبر ایک انسان تھی اور وہ ایک جن تھا... جن...

کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان لڑکی کا ایک جن سے بیاہ ہو جائے اور وہ وہ پریمیوں کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزار سکیں۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ شرجیل کا روپ بننے کے بعد بھی وہ شرجیل جیسا بن تو نہیں جاتا تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ اگر اسے صنوبر مل بھی گئی تو کیا اسے وہ خوشی بھی مل سکے گی جس کی چاہ میں وہ یہ سب کر رہا تھا کیا صنوبر اس کے ساتھ ایک شادی شدہ زندگی خوشی خوشی گزار سکے گی۔ مخلوق تو خدا کی ہیں دونوں پر جیسے زمین اور آسمان جنہیں اسی خدا نے تخلیق کیا تھا جس نے اسے اور صنوبر کو بنایا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے ٹکرائیں دوسرے سے اتنا دور کہ چاہ کر ایک دوسرے کو چھو تک نہیں سکتا اسی لیے وہ دونوں کا ملاپ بھی ناممکن تھا۔ ناممکن ہے۔ ایسی باتیں کوئی بھی اس وقت کیسے سوچ سکتا ہے جب زندگی اپنی منزلوں مرا دونوں سے ہمکنار ہونے والی ہو۔ ایسی بات تو کوئی قصداً بھی سمجھانے کی کوشش کرے تو ذی نفس اس کا منہ توڑ ڈالے سوسلمان نے بھی ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ آنے والا وقت اس کی جھولی میں کیا ڈالنے والا تھا۔ ساری زندگی کی خوشی یا ساری زندگی کا روگ۔۔۔۔۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ اس کا اور صنوبر کا عشق صرف عشق نہیں تھا بلکہ یہ زہر عشق تھا۔۔۔ زہر عشق۔۔۔!

☆.....☆

”مجھے ہمیشہ ایک ایسا خواب نظر آتا ہے جسے میں ایک وسیع قید خانے میں پکڑ کر لائی گئی ہوں۔ وہاں سے نکلنا چاہتی ہوں یا نہیں نکلنا چاہتی اس سوال کا جواب نہیں ملتا کبھی اس خواب میں۔ کتنی ہی بار وہ خواب میری آنکھوں میں اترتا ہے اور ہر بار اس ٹھنکشی کو ہوا دے کر رخصت ہو جاتا ہے، میں نے اس خواب کا شرجیل سے بھی ذکر کیا تھا۔“ صنوبر نے خواب سناتے ہوئے رک اپنے پایا کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ جاننا چاہتی ہو کہ اسے شرجیل کا ذکر کرنا چاہیے یا اب اس آدمی کا نام لیتا بھی اس کے لیے کسی زخم کے اندر اٹھنے والی نیسوں جیسا ہے۔

”تو کیا کہا شرجیل نے؟“ آصف کی آواز کے خنجر اڑ کو محسوس کر کے ہر شہوار کو لگا جیسے آصف کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح ہنس یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ جس جنگ میں اسے زبردستی اترنا پڑا ہے وہ کب ختم ہوگی اسے خود یقین نہیں ہے کہ اس جنگ کا کوئی انت ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے اب تو یہ جنگ عمر بھر کے لیے مننے والا ایسا ٹھنڈ ہے جس کے ساتھ جیتے رہنے کی اسے عادت ڈالنی ہوگی۔

”شرجیل نے کہا خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جو خوابوں کی صحیح تعبیر و تشریح بتایا کرتے تھے۔ اب نہیں ہوتے ایسے لوگ۔ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خواب کی درست تعبیر بتا سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے اور ہم سب اس وقت جھوٹوں کی دنیا میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ ہمیں دوسروں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ کوئی نہیں جس سے ہم زندگی کے اصل معنی معلوم کر سکتے ہوں، ہر ایک کے پاس اپنے ہی معنی ہیں اور جتنے منہ اتنی باتیں۔ بے شمار معنوں کی موجودگی میں بھی زندگی بھٹک رہی ہے اسے اب تک بھی یہ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا اصل چہرہ کون سا ہے۔ ہر گاہ پر ایک آئینہ لگا ہوا ہے اور اس کے آس پاس بہت سارے چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں سمجھو جو بھی ان آئینوں میں اپنی اصل صورت تلاش کر سکتا ہے صرف وہ جانتا ہے کہ زندگی کا اصل چہرہ کون سا ہے۔“ وہ چپ ہوئی تو سلمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بیکجیں تو ذرا پایا اس صنوبر کو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ کتنی مشکل مشکل باتیں کرنے لگی ہے ایسی باتیں جو ہم جیسوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ صنوبر نے ایک نرم سی نظر سلمان پر ڈالی اور اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ تیر گئی۔

”تو کیا یہ ممکن ہے شرجیل واپس آجائے اگر تو تم اس سے شادی کرنے کو مان جاؤ گی؟“ عین اسی کی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نے ان کی محویت کو دور برہم کر دیا۔ آصف نے ایسے لپک کر فون کو پکڑا جیسے ذرا بھی دیر ہوئی تو فون بند ہو جائے گا اور وہ اس خبر سننے سے محروم ہو جائے گا جس میں اس کے سارے مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

فون سنتے ہوئے اس کا چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں موجود لبو میں کوئی طغیانی آگئی ہو۔ دوسری طرف جو بھی تھا اس نے آصف کو جیسے کچھ بھی پوچھنے اور سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا سب کچھ خود ہی کہتا رہا۔ آصف نے فون رکھا تو ان تینوں کے چہرے بے بسی کی علامت بنے ہوئے تھے۔ آصف نے انہیں زیادہ لمبے سسپنس میں نہیں رکھا اور فوراً ہی بتا

"رحمن تھا وہ کچھ دیر تک ہمارے گھر آ رہا ہے۔ ابھی وہ اپنے گھر نہیں گیا اس کا کہنا ہے کہ اسے پہلے ہم سے بات کرنی چاہیے کیونکہ اس نے ہمارے ساتھ غلط کیا ہے۔"

"کچھ اندازہ ہوا وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" در شہوار نے کہا۔

"یہ تو اس کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" آصف کو در شہوار کا یہ سوال فضول معلوم ہوا۔

"اگر انہوں نے پھر سے اس رشتے کو بحال کرنے کی بات کی تو آپ لوگوں کا کیا جواب ہوگا؟" اس قدر اچانک پوچھے گئے اس سوال کے لیے تو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ آصف اور در شہوار دونوں نے وقفے سے صنوبر کی طرف دیکھا۔ صنوبر کو اپنے چہرے پر چھ آنکھوں کی چیمیں محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے کچھ گہرے سانس لیے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی جیسے الجھنے لگی۔

"میں سمجھ گیا تم سوچ رہی ہو ابھی کچھ دیر پہلے تم سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اگر ایسے میں شریل آ جاتا ہے تو کیا تم اسے معاف کر کے اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤ گی۔ اور اب تم سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا تم اس رشتے کو بحال کرنے پر راضی ہو؟ صنوبر تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسے ہی الجھ کے رہ جاتا جیسا کہ تمہاری زندگی کو متاثر بنا دیا ہے میری بہن مگر تم سے میں ایک ہی بات کہوں گا۔ تم جو بھی جواب دو اس میں صرف اپنا فائدہ دیکھنا، یہ دیکھنا کہ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔ اب ویسے بھی تمہیں مانا یا پایا لوگوں کی پروا کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے اب تو سارے شہر میں جو بدنامی ہوئی تھی اب ہو چکی ہے۔ تمہیں اب کسی کی بھی پروا نہیں کرنی جو بھی جواب دو اسے ٹھیک سے سوچ کر دینا میں تو کہوں گا صرف اپنے دل کی بات سنو وہ کیا کہتا ہے۔" سلمان کی اس لمبی تقریر کو سننے کے بعد در شہوار نے جھٹ سے اٹھ کر ایسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور بولی۔

"تم میرے بیٹے اتنے سمجھدار کب ہوئے میں تو سوچتی تھی تم کوئی بہترین بات کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ میں یہ جان کر بھی خوشی سے مرنے والی ہوں کہ تم اپنی بہن سے اتنی محبت کرتے ہو۔" سلمان نے اپنی ماں کو اور زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"اب آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی مانا۔ صنوبر کی زندگی کے ان سارے دکھوں نے مجھے بہت حساس بنا دیا ہے۔ میری بہن آندھیوں میں رکھے چراغ کی طرح جل رہی، لرز رہی ہے اور کچھ پتا نہیں چل رہا ہے وہ کب تک ان مخالف ہواؤں کا مقابلہ کر سکے گی۔ پتا نہیں اس کے دل پر کیا گز رہی ہے ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔" سلمان کی بات سن کر صنوبر نے ایک ہلکی سی اور رونے لگی۔ آصف نے جلدی سے اپنی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگا۔

"تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمیں اس سر جھکانا ہے میرے بچے میں جانتا ہوں تم اس وقت پل صراط کے پھوس چھوٹی ہو تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے اترو۔ ایک طرف تمہاری محبت ہے تمہارا شریل ہے جسے پانا پہلے ناممکن لگتا تھا اس کی وجہ رحمن کا سرفراز کے کاروبار پر ہونے والا قبضہ تھا۔ سرفراز اپنے بیٹے سے ہمیشہ یہی چاہتا کہ وہ اپنی محبت قربان کر کے اپنے خاندان کو بچالے۔ لیکن اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اب رحمن سرفراز کو مجبور کرنے اور باؤ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اب شریل بھی زیادہ آزادی سے اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس لیے میرے بیٹے تم بھی پوری آزادی سے فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا چاہیے۔" آصف نے بیٹی کو دلاسا تو دیا مگر اسے یہ ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی محبت کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو کیا شریل واقعی واپس آئے گا۔ اس کے بارے میں تو کسی کو کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ وہ اگر واپس نہ آیا تو کیا ہوگا۔ تب کیا صنوبر کو ساری زندگی اس کے نام پر گزارنے کا حق دیا جائے گا۔ شریل اگر اسے اعتماد میں لے کر اسے بنا کر گیا ہوتا تو وہ غار کے لیے کبھی نہ مانتی و محبت کے سبب مخالفتوں سے اکیلے ہی مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی۔ مگر اب جبکہ اس کے محبوب نے اسے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اسے اپنے بارے میں ایک فون ہی کر دیتا، اتنا دیتا کہ وہ کہاں ہے بھٹے ہی ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتا کہ صنوبر کسی کو کان و کان خبر بھی نہ ہو کہ میں کہاں ہوں۔ تو میں مرجانی مگر کبھی کسی کو نہ بتاتی کہ

شرجیل کہاں ہے۔ پر اس نے تو..... اب سوچ کر صنوبر کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شرجیل تم مجھے بتا کے جاتے یا جا کے بتا دیتے تو میں اس صورت میں بھی تمہارے نام پر زندگی گزار دیتی اب کیا کروں۔ تمہارے لیے فارس کو منع کرتی ہوں۔ اور تم نہ آئے تو میں ساری دنیا کے سامنے صرف تماشائی نہیں بنوں گی بلکہ لوگ مجھ پر ترس کھانے لگیں گے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہا کریں گے ”دیکھو وہ رہی وہ بے چاری جسے اس کا محبوب دھوکا دے کر چلا گیا اور یہ بے وقوف اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہے“ کیا کروں شرجیل کیا کروں..... یہی ماں باپ جو آج مجھے فیصلے کا حق دے رہے ہیں چند سال بعد ہی میرے سامنے بیٹھے مجھے سمجھا رہے ہوں گے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے اس طرح ساری زندگی میں کیسے گزاروں گی۔ اس وقت میں اپنے انھی ماں کی آنکھوں میں اس پیار کو مدھم پڑتے دیکھوں گی۔ جس کی روشنی سے آج صرف میرا دل ہی نہیں یہ سارا گھر منور ہو رہا ہے۔ وہ سوچتی رہی پر کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

”جینے صنوبر تمہیں رحمن کے آنے سے پہلے فیصلہ کرنا ہو گا ورنہ اس نے بھالی پر زور دیا تو تمہارے پاس اسے دینے کے لیے کوئی جواب نہیں ہو گا۔“ در شہوار اس کے پاس آئی اور محبت سے اس کے گالوں پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرنے لگی۔

”میں اگر آپ دونوں سے ایک بات کہوں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے!“ کچھ توقف کے بعد صنوبر نے پوچھا اپنے دونوں ماں باپ سے اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی بیٹی ایسا کیا کہنے والی ہے جس کے لیے اسے ڈر ہے کہ اس کے ماں باپ مائنڈ کر سکتے ہیں۔

”تم بلا جھجک کہو میرے بچے ہم تمہاری ہر بات کو تسلیم کرنے کی کوشش کریں گے۔“ آصف نے کہا۔

”مجھے سلمان کے ساتھ کچھ دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ میں اپنے بھائی سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“

سلمان چونکا اور آصف اور در شہوار کے چہروں پر حیرانی تھی کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جو ان کی بیٹی اپنے ماں باپ سے نہیں اپنے بھائی سے کرنا چاہتی ہے۔ آصف نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اپنے قدم لاؤنج کے داخلی راستے کی طرف بڑھا دیے۔ در شہوار نے جاتے جاتے اپنے جینے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

”خدا میرے بچے کو ہر امتحان میں پاس ہونے کی طاقت دے“ ماں کی یہ بات سن کر سلمان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھیننے لگیں اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں کہ صنوبر نے اسے کسی بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اس نے تو ابھی جینے کا قرینہ سیکھا تھا اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ کیا کرے گا اگر صنوبر نے اس کے سامنے کوئی مشکل پہنچ رکھ دی جس کا اسے جواب نہ آتا ہو۔ دونوں حلقے گئے اور وہ بلند دھڑکنوں کے ساتھ صنوبر کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے قریب کھڑا کوئی بھی انسان اس کی دھڑکنوں کی آواز سن سکتا تھا۔ صنوبر نے اسے بیٹھ جانے کو کہا وہ کسی رو بوٹ کی طرح کسی حکم کے بندے کی طرح میکا کی انداز سے بیٹھ گیا۔

”تم کیا چاہتے ہو سلمان میں فارس سے شادی کروں یا انکار کر دوں؟“ سوال سن کر سلمان کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی وقت پیش نہیں آئی کہ یہ صنوبر کا آخری سوال نہیں ہے۔

”تم اے پسند نہیں کر میں تو جب پایا اور مانا تمہیں انکار کا حق دے رہے ہیں تو تم کیوں ایسے بندے سے شادی کرنے پر خود کو مجبور کر رہی ہو۔“ سلمان نے جیسے پہلا مرحلہ سر کر لیا تھا۔

”میں تمہارا جواب پوچھ رہی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے یہ نہیں، یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو میں انکار کروں یا ہاں کہوں؟“

سلمان کے ماتھے کی سونٹیں گہری ہوئیں اس کی آنکھوں میں ایک انجانی پریشانی نظر آنے لگی وہ سوچنے لگا۔ میں تو سمجھ رہا تھا میں اس کے سوالوں کا جواب دے پاؤں گا۔ لیکن اس کا تو پہلا ہی سوال اتنا مشکل ہے۔ اب کیا کہوں... وہ سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر بعد جب صنوبر نے اس پھر سے متوجہ کیا تو وہ بولا۔ ”منع کر دو“

”منع کر دوں۔ فارس سے شادی کرنے سے منع کر دوں۔ یہی کہا ہے نا تم نے۔“ سلمان نے گردن ہلائی جیسے ڈرتے ڈرتے وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ جواب غلط تو نہیں ہے۔

”گردن مت ہلاؤ سلمان زور سے با آواز بلند کہو کہ تم کیا کہتے ہو؟“ صنوبر کا یہ روپ اس کے لیے بہت ہی اجنبی تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



جانے وہ کیا کرنے والی تھی کیا کہنے والی تھی۔

”ہاں میں یہی چاہتا ہوں تم فارس سے شادی مت کرو! سلمان نے اتنی زور سے کہا کہ دوسرے کمرے میں موجود در شہوار کو بھی اس کی آواز سنائی دی۔ اب در شہوار کے لیے اس گفتگو کو سنے بغیر رہنا مشکل ہی ناممکن تھا۔ آصف اپنے کمرے میں جا چکا تھا وہ دھیرے اور دبے پاؤں چلتی ہوئی لاؤنج کے قریب دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اپنے دونوں بچوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

”میں نے فارس سے انکار کر دیا۔ شرجیل بھی کبھی واپس نہ آیا تو؟“ سلمان تو سلمان یہ سن کر تو در شہوار کے بھی ذہن کے پرچے اڑ گئے۔ ایسی بات تو کوئی بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ سلمان منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب صنوبر کی آواز در شہوار کو سنائی دی۔

”سنو میرے بھائی۔ میں نے ماں باپ کی موجودگی میں تم سے بات کیوں کرنا چاہی۔ میں فارس کو انکار کرتی ہوں اور شرجیل بھی واپس نہیں آتا تو میں چاہتی ہوں تم میرے ساتھ کھڑے رہو گے۔ ہمیشہ میں ساری زندگی شرجیل کے نام پر گزاروں گی مگر آج میرے ماں باپ میری محبت میں مجھے ہر فیصلہ خود کرنے کا اختیار دے رہے ہیں پھر ان سے میرا کیلا جیون دیکھنا نہ جائے گا۔ وہ میری کسی سے بھی شادی کرنا چاہیں گے تب ضرورت ہوگی مجھے تمہاری تم میرے ساتھ کھڑے رہو گے اور ہر دباؤ کے سامنے مجھ سے پہلے خود ڈٹ کے کھڑے رہو گے اور کہو گے کہ صنوبر کی شادی ہوگی تو شرجیل سے ہوگی ورنہ کسی سے نہیں ہوگی۔ بولو کیا تم یہ کرو گے؟“ در شہوار کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لکیریں ابھرنے لگیں۔ اس کی بیٹی جوگ لینا چاہتی تھی اور اسے ماں باپ پر اس معاملے میں بھروسہ نہیں تھا کہ وہ اسے جو ممکن بننے لگیں دیں گے۔

سلمان میرے بیٹے تم اس کہ یہ بات مت ماننا وہ بچی بھی نہیں جانتی کہ کتنا سخت فیصلہ کرنے جا رہی ہے۔ ابھی سلمان نے جواب دیا بھی نہیں تھا کہ در شہوار کو پھر صنوبر کی آواز سنائی دی۔

”موت اور زندگی کا کسی کو پتا نہیں ہے لیکن جو ریت ہے اس کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں کو دنیا میں اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ خدا خواستہ ایسا ہوا تو تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے۔ اپنی بیوی اپنے بچوں اور ایسے ہر مخالف طوفان میں میرے ساتھ کھڑے رہو گے جو مجھے میرے راستے سے ہٹانے یا میری زندگی کو مشکل بنا سکتے ہیں۔ بتاؤ کیا تم ایسا کرو گے؟ جھاؤ گے اپنا وعدہ؟“

در شہوار وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ گئی اور اسے اپنی بیٹی کی زندگی برباد ہوتی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر والے کے سامنے پھیلا دیے اور دعا مانگنے لگی۔ اس سے تو اچھا ہے وہ فارس سے شادی کر لے۔ یہ کس مشکل اور لہو لہان کر دینے والے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ ماں باپ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد کا بندوبست بھی کرنا چاہتی ہے۔ بھائی کو قابل اعتبار نہیں جانا اس نے بلکہ اسے اپنا سیف کا زو بنایا ہے۔ تمہاری محبت کو سلام کرتی ہوں میں صنوبر تم عورت کے نام پر ایک ایسی آبرو ہو جو محبت کو زندگی دے کر خود کی زندگی کو داغ کر دیتا چاہتی ہو۔ در شہوار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بیٹی میں ایسی گمن ایسی ٹھنکی آئی کہاں سے۔ وہ ولی سے سلمان کے انکار کی متنی تھی۔ اس کی آواز در شہوار کی سماعتوں کو زندگی بھی دے سکتی تھی اور موت بھی۔ اسی وقت آصف اس طرف آگیا۔ اس نے کو در شہوار کو ایسے دیوار سے چہرہ گزر گزر کے روتے دیکھا تو وہ ایک دم لرز کر رہ گیا۔ لپک کر اس کے پاس آیا۔

”کیا بات ہے در شہوار تم اس طرح کیوں رو رہی ہو بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

”اس نے بھائی کو کیوں روکا ہمیں کیوں نکالا اس کمرے سے جانتے ہو کیوں؟ آصف نے اس کی بات پر نفی میں سر ہلایا۔

”وہ جو گمن بنا چاہتی ہے اور بھائی کو اپنا محافظ بنانے کا وعدہ لے رہی ہے“ اور شہوار نے کہا اور آصف کو ایک زور کا جھنکا پڑا وہ فرش پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ در شہوار کی چیخ صنوبر اور سلمان کے کانوں تک بھی پہنچی۔ سلمان باہر کی طرف لپکا تو صنوبر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سلمان کی آنکھوں میں حیرت اور ہزاروں سوال تھے۔

☆.....☆

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے اسرار بھری مشق کی دنیا میں لے جانے والے
سطر سطر ہر مشق لہو میں دوڑاتے اس ناول کی اگلی کڑی ماہ جنوری میں پڑھیے)

مسلم ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان اسی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپروڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمان و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعاے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعاے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپروڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/- روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II-C-88۔ خیابان جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

کروں۔ یقیناً تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے جس کے بعد اللہ بندے کو فروس عطا فرماتا ہے۔ ہمیشہ خوش اور آباد رہو، نماز کی پابندی اور ترجمہ کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور خلق خدا کی خدمت جاری رکھو۔ روزِ محشر اپنے چہرے چاند کی طرح روشن پاؤ گے، آمین۔

□ مریم بنت عاتکہ۔ کراچی

○ بابا جی! میرے بچے آپس میں بہت لڑتے ہیں۔ باہر سے بھی شکایت آتی ہے خاص کر لڑکیوں کی جن میں میری بڑی بیٹی عتیقہ بنت مریم اور عفیرہ بنت مریم ہیں۔ ان کو دیکھ کر اب بھائی بھی گزر رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں سنتیں اپنی ہی چلاتی ہیں۔ ابھی چھوٹی ہیں بڑی ہوں گی تو کیا ہوگا..... ڈر لگتا ہے۔ مجھے بھی بہت پریشان کرتی ہیں کام کر داتی ہیں مگر جب تک میں چلاؤں تاں میرا اپنا بھی تصور ہے کہ میں ان کے ساتھ صحیح نہیں پیش آتی۔ کچھ گھر کے مسائل تھے۔ بچوں پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ کبھی ڈانٹ دوں تو سانس سسر ان کے سامنے ہی مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔ جس سے بچوں کو شیل گئی اب بچے گز گئے تو سارا الزام مجھ پر کہ ماں صحیح ماحول میں پرورش نہیں کر رہی۔ میری چچا زاد بہن طاہرہ بنت سگینہ کی بیٹی ادیبہ بنت طاہرہ وہ ہر جگہ میری بچیوں کو ڈی گریڈ کرتی رہتی ہے۔ وہ میری بچیوں سے دور رہے۔ میں چاہتی ہوں میری بیٹیاں گھر میں ہی رہیں۔ باہر کھینے نہ جائیں۔ یہاں ماحول خراب ہے۔ عورتیں اپنی بچیوں کو چھوڑ دوسروں کی بچیوں کی باتیں کرتی ہیں۔ میری بیٹیاں بھی اسی ماحول کا حصہ نہ بنیں۔ برابر میں اوپر

میرے بچو! اللہ تم سب کو اچھا رکھے۔ میں پچھلے 15 سالوں سے کچھ ادویات پر کام کر رہا تھا جو الحمد للہ اب تیار ہیں ان میں ایک دوا دانتوں کی ہے جو ہر قسم کی دانتوں کی تکلیف میں سود مند ہے اور دوسری دوا ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کی ہے۔ زخم چاہے چوٹ کی وجہ سے ہو یا آپریشن کا زخم یا پھر چھالایا پیپ سب کو ایک ہفتے میں خشک کرتی ہے اس کے علاوہ چھوٹے بچے اکثر بستر سے گر جاتے ہیں یا کھیل گود میں سر پر چوٹ لگتی ہے، ایسے میں اس دوا کے چند قطرے سو جن نہیں ہونے دیتے اور بچہ ہویا بڑا سر پر لگنے والی چوٹ کے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ادویات 1 سال سے لے کر 100 سال تک کے انسان کو استعمال کروائی جاسکتی ہیں۔ میں نے یہ سب بتانا اس لیے ضروری سمجھا کہ بعض اوقات غلط علاج کی وجہ سے معمولی تکلیف بہت بڑی ہو جاتی ہے اور وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ ساتھ مریض کو آرام بھی نہیں آتا ایسے میں انسان ہر در کھٹکھٹاتا ہے۔ تم لوگوں کو پتہ ہوگا تو سچی کہانیاں کے دفتر سے یہ ادویات منگوا سکو گے۔

میں کچھ بچوں کا نام لے کر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو میرا مان رکھتے ہیں اور بہت پابندی سے کچھ کنبوں کی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔ بیٹی ارم کراچی، بیٹی افشاں لندن، بیٹا حسن شیم پنڈی، بیٹا فہید، بیٹی فرہاد اور سدرہ لاہور، بیٹا علی ڈنمارک، بیٹا کامران USA، بیٹی طاہرہ زینب، فرزانہ کراچی، تم سب اپنے نام صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے مگر یہ میرا فرض ہے کہ میں تم سب کا شکریہ ادا

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جای کرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

باباجی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں، میرا مسئلہ بھی حل کر دیں، میں اور میرے بچے بھی آپ کو دعا میں دیں گے۔

✽ بی بی پروین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرد شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہر حال جو ہوا، سو ہوا، اب تم نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے جہاں جہاں لفظ "یٰسین" آئے وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ غلطی کریم۔ کراچی

○ میرے اچھے بابا جان اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے پیروں پر سلامت رکھے۔ میں جس تکلیف سے گزر رہی تھی وہ میں کسی کو بتا نہیں سکتی مگر آپ کی وجہ سے میری زندگی ہی بدل گئی ہے۔ تین ماہ قبل آپ سے دانتوں کی دوا لی تھی۔ میرے دانتوں سے خون اور پیپ رس رہی تھی ڈاکٹروں پر پیسہ خرچ کر کے گھر کا بجٹ مکمل طور پر ہلا ہوا تھا آپ کی دوا استعمال کرنے کے پانچویں دن خون آنا بند ہو گیا پھر پیپ اور دھن سب غائب اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں بلکہ مجھے لگتا ہے کہ جن دانتوں میں خلا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں تکلیف دیتی تھیں وہ بھی ٹھیک ہو گیا ہے۔ بابا جان میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں اتنے معمولی ہدیہ والی دوا ایسا کرشمہ کر سکتی ہے مجھے یقین نہیں آتا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ مستقل یہ دوا استعمال کروں آپ مجھے ہر ماہ 5 بوتلیں تیار کرویں۔ میں دفتر چکی کہانیاں سے منگوا لوں گی۔

✽ بی بی عظمیٰ! شفا تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ہاں یہ درست ہے کہ دانتوں کی یہ دوا بہت فائدہ مند ہے ہر قسم کی دانتوں کی تکلیف کے لیے اور ہر عمر کے افراد کے لیے بہترین ہے۔ میں پچھلے 15 برس سے اس پر اور زخموں کی دوا پر کام کر رہا تھا الحمد للہ دونوں تیار ہو گئیں۔ میری یہی خواہش تھی کہ اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ خلق کو پہنچا سکوں۔ تو اللہ نے میری دعا قبول کی۔ تم اب دانتوں کا بہت خیال رکھنا اور دوا استعمال کرنی رہو

میری بچیاں رہتی ہیں آس پاس کزنز بھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں میرے گھر کوئی زیادہ نہ آئے نہ میں کسی کے گھر جاؤں کیونکہ جہاں دو خواتین ہوتی ہیں وہاں غیبت ضرور ہوتی ہے۔ جن سے نیکیاں ضائع اور روزگار تنگ ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے پر بھی میری مدد کریں اور کوئی آسان وظیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کے بہت سارے وظائف پڑھے اور مقاصد بھی حاصل ہوئے ہیں دوسروں کو بھی بتاتی ہوں اُن لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو اپنی امان میں رکھے اور مجھے غیبت جیسی گندی بیماری سے محفوظ رکھے۔

✽ بی بی مریم! حالات چاہے جیسے بھی ہوں اولاد پر بھرپور توجہ مانا کا فرض ہے۔ تم اللہ سے مدد مانگو کہ وہ تمہیں توفیق عطا فرمائے کہ تم اپنی اولاد کی بہترین تربیت کر سکو۔ بی بی نماز فجر اور عشاء کے بعد 1-1 بار سورۃ رحمن پڑھو اور دُعا کرو۔ بچیوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دم کرتی رہا کرو اللہ انہیں محفوظ رکھے گا۔

□ پروین۔ جیکب آباد

○ باباجی! میں بہت بد نصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہو گئی۔ گھر میں بھائی بھابھ کا رویہ بہت خراب تھا اس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کرنی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی تھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے مرنے لگتے ہیں بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ باباجی! میں بہت غریب گھر سے ہوں پلٹ کر واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر میرے نام کرویں۔ وہ بہت پیسے دالے ہیں مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہو جائے۔

درمیان میں کچھ وقت کے لیے چھوڑ دو پھر دوبارہ شروع کر دو یہ دانتوں کو زندگی کی آخری سانس تک اپنی جگہ مضبوط رکھے گی۔ تم دوا دفتر سے منگوا لیتا۔
□ رحمت بی بی۔ بلوچستان۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ باباجی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں! اس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ باباجی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ باباجی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ باباجی! آپ ہمیں ایسا تعویذ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دعائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن کوٹر کو بھی تعویذ دیا تھا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوئی۔ شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف فرمائیں۔

بلا جی رحمت.....! تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔ بس خیال رہے نماز قضا نہ ہو۔ حاجی پوری ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔
□ صفیہ۔ بنوں۔

○ باباجان! میرا مسئلہ حل کروں! میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا اُن کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ اب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوا لیا۔ باباجی! پلیز! مجھے بھی تعویذ تیار کروں تاکہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقہ کار سب پتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا 'آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہذا پہلے اجازت لے لو۔ باباجی! میں بھی آپ کی جینی ہوں' میری بھی مشکل حل کر دیں تاکہ میں اپنے سسرال میں خوش و غرم رہ سکوں۔

بلا جی صفیہ! اللہ سے مدد مانگو وہ ضرور تمہاری دعا

قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا! بس خیال رکھنا! تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ کلام الہی کی برکت سے ضرور شرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف ارسال کرنا۔

□ شیریں انعم۔ کراچی
بلا جی شیریں! تمہارا خط شائع کرنا مناسب نہیں۔ میں بار بار یہ بات کہتا ہوں کہ علاج درست سمت میں ہونا بہت ضروری ہے بلا وجہ گولیاں کھانا انسان کی صحت کو پر باد کر دیتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوا لو معاملہ اب گھمبیر ہو چکا ہے۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔
□ شہلا احمد۔ راولپنڈی۔

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے وہ شادی شدہ ہے کچھ عرصے سے اُس کی کمرہاتھ کی انگلیاں پیر کی انگلیاں ان سب حصوں میں بہت سخت درد رہتا ہے۔ رات میں سو کر جب صبح اُٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ پیٹ اور کولہ کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں! آپ کی دوا سے ضرور فائدہ ہوگا۔ اُس کے جسم میں چربی بہت ہے۔ میری بہن کی ساس بھی بہت زیادہ بیمار ہیں اپنے لیے تو وہ مر چکی ہیں لوگوں کے لیے زندہ ہیں۔ میری بہن اپنی ساس کی بہت دیکھ بھال کرتی ہے لیکن میری بہن اپنی جسمانی بیماری کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کر رہی ہے۔ باباجی! آپ میری بہن کے لیے دعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہو جائے۔

بلا جی شہلا! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا مجھ سے وزن کم کرنے کی دوا منگوا لو۔ انشاء اللہ مکمل افادہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جاسکے۔

□ صنم۔ کھاریاں
○ باباجی! آداب! باباجی! میں اپنے دیور کی

بھلا بیٹی ارجمند! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُور دُور شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو بار بار بناسنافی پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ شمیمہ خان۔ کراچی

☆ بیٹی شمیمہ! تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوگا مجھے اب محسوس ہوتا ہے شدید رکاوٹیں ہیں اسی لیے تعویذ کے لیے کہا تھا جو شخص تعویذ کے ہدیے کے لیے تیار نہیں وہ زندگی بھر تمہاری ذمہ داری کیسے سنبھالے گا یہ بات تمہیں خود سوچنی چاہیے۔

□ شاہد اللہ۔ الگ

○ بابا صاحب! آپ کو بے حساب لوگ خط لکھتے ہوں گے مجھے آپ کہاں یاد رکھیں گے اس لیے آپ کو یاد دلا دوں کچھ عرصہ قبل میرا والد شدید بیمار ہو گیا تھا وہ ادھر کراچی میں مزدوری کرتا تھا۔ چھت سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسپتال لے کر گئے ٹیسٹ کروائے ڈاکٹر نے کہا دماغ میں سوجن ہے آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگی۔ مہنگی دوا میں بار بار دی گئی۔ ابھی والد صاحب ٹھیک بھی نہیں بیٹھے بیٹھے بے ہوش پھر دوست نے آپ کا بتایا آپ نے مجھے دوا بھجوائی ابھی بابا صاحب اللہ کا بڑا احسان ہے کہ دوا کے استعمال کے بعد سے والد صاحب ٹھیک ہیں۔ اب نے ڈاکٹر کی دوا چھوڑ دی کیونکہ بہت مہنگی تھی اور قاعدہ بھی نہیں تھا۔ والد صاحب اب بالکل ٹھیک ہے کیا دوا کا استعمال جاری رکھیں یا روک دیں؟

بھلا بیٹے شاہد! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ نے تمہارے والد کو صحت کملی عطا فرمائی یہ درست ہے کہ والد کے سر کے اندرونی حصے پر سوجن تھی میں نے جو دوا دی تھی وہ اندرونی چوٹوں اور بیرونی زخموں کو دونوں میں ٹھیک کرتی ہے اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے اپنی کوششوں میں کامیاب کیا۔ تم اب دوا کا استعمال ترک کر دو اور کچھ رقم خیرات کرو۔ جب اللہ غم اور دکھ سے

شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا اور ان کی ازدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور ان کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑے گا؟

☆ بیٹی صنم.....! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُس کو اُس کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ دُریہ علی۔ لاہور

○ بابا جی میں نے دو ماہ قبل آپ سے تعویذ منگوا یا تھا اپنے بھائی کی شادی کے لیے ابھائی شادی پر تیار ہو گئے ہیں میں آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اب تعویذ کا کیا کرنا ہے۔ اور بابا جی ای اور خالہ آپ کو کچھ رقم ارسال کرنا چاہتی ہیں۔ سچی کہانیاں کے نام منی آرڈر کر دیں یا بینک ڈرافٹ بھیجیں رہنمائی فرمائیں۔

☆ بیٹی دُریہ! اللہ تمہیں خوش رکھے تعویذ ابھی جہاں رکھا ہے رہنے دو رشتہ طے ہونے پر تلف کر دینا۔ والدہ سے کہو ورد جاری رکھیں اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ بیٹے نے ضد چھوڑ دی۔ رقم سچی کہانیاں کے نام منی آرڈر کر دو مجھے آسانی سے مل جاتی ہے۔

□ ارجمند۔ گھوٹکی

○ پیارے بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہو میو پیٹھک علاج کر دیا رانی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کر دانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا درد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میری بڑی بہن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کر دانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دعا میں دیں گے

نجات دے تو شکرانے کے طور پر اُس کی راہ میں ضرور کچھ نہ کچھ نکالنا چاہیے۔

□ راشد و قمر۔ مہجرات

○ باباجی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ والدین حیات نہیں بھائی بہن تو آج کل سکے بھی سکے نہیں۔ بزرگوار میرا شوہر بہت پیسے والا آدمی ہے۔ مگر عیاشی میں پڑا ہوا ہے۔ میری 4 بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ سب ابھی چھوٹے ہیں۔ یہ ان کے سامنے شراب بھی پیتا ہے اور مجھے مارتا بھی ہے۔ ماں باپ ہوتے تو شاید اُن کے پاس چلی جاتی میرے سکے بھائی میرے شوہر سے پیسے لیتے رہتے ہیں اسی لیے اُس کی طرف واری کرتے ہیں۔ آپ اللہ والے ہیں میں پڑھتی ہوں لوگوں کے مسئلے حل ہوتے ہیں میرا بھی مسئلہ حل کر دیں میرا شوہر نیک ہو جائے اور مجھ پر ہاتھ اٹھانا چھوڑ دے۔ میں وظیفہ نہیں کر سکتی بچے چھوٹے ہیں تعویذ دے دیں آسان ہوگا۔

✽ بیٹی راشدہ! اللہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ صبر، ہمت اور استقامت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ بیوی پر ہاتھ اٹھانا نہایت بری حرکت ہے۔ میں تمہارے لیے دو عدد تعویذ تیار کروں گا طریقہ استعمال بھی تحریر کروں گا۔ بس تم معاملات میں خاموشی رکھنا اور بنی مسائل تو رب العزت کی ذات حل کرتی ہے میں تو بہت ادنیٰ سا انسان ہوں بس جو لوگ مستقل مزاجی سے رابطے میں رہتے ہیں ان کی زندگیوں اور گھروں میں برکت رہتی ہے۔ تم بھی پختہ ایمان کے ساتھ دعائیں کیا کرو ضرور کرم ہوگا۔

□ عروہ خان۔ کراچی

✽ بیٹی عروہ! نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم صبح و شام نیم گرم پانی میں دو چائے کے چمچے اسپغول گھول کر پی لیا کرو۔ استحانی کمرے میں داخل ہوتے وقت نصر من اللہ صبح قریب پڑھا کرو۔ بسم اللہ پڑھ کر پرچہ شروع کر دو گی تو کبھی ناک کای نہیں ہوگی۔ استحانوں سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے پھر خط لکھنا میں دانوں کا بھی علاج بتا دوں گا۔ مگر ابھی ساری توجہ پڑھائی پر رکھو۔

□ علیمہ۔ کراچی

○ باباجی! السلام علیکم! میرا نام "علیمہ"

ہے۔ میری والدہ کا نام فہمیدہ ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔ باباجی! دو سال ہوئے مجھے نزلے کی شکایت ہے۔ میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کر دیا اور آب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہو گئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ باباجی! مہربانی فرما کر مجھے حل بتائیے میں بہت پریشان ہوں۔ باباجی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآن پاک ابھی پڑھ رہی ہوں۔ پلیز باباجی! مجھے دسمبر کے شمارے میں جواب دیں۔

✽ بیٹی علیمہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولنا ہوا پانی لو اور اُس میں خوب سارا نمک ملا کر بھاپ لو۔ یہ عمل 7-8 منٹ روز کرو۔ نہار منہ اور کئے لیے لے لکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 3-4 لکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھا لو۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ اسرار احمد۔ جہلم

○ باباجی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت ہے ہوں گے۔ میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کر سکتا لیکن ان میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کر رہا ہوں۔ ان کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظ قرآن ہوں لیکن میں صحیح روانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ باباجی! بات یہ ہے کہ ہمارے محلے کے چند لوگوں نے مجھے بدنام کر دیا ہے جس کی وجہ سے میں پچھلے رمضان میں بھی قرآن پاک نہیں سنا سکا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اگر مجھے قرآن پاک سنانے کے لیے جگہ نہیں ملی تو میں رمضان میں چالیس دن کے لیے جماعت پر چلا جاؤں گا۔ باباجی! آپ مجھے ایسا کوئی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے مجھے جگہ مل جائے اور آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ غیب سے کوئی بندوبست فرمادیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں میرے باپ اور میرے چچا حج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ

ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتادیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا ہندوستان ہو جائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے اسرار! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۃ یسین کی آواز بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو اللہ سے دعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔

□ فاطمہ۔ میرے والا

☆ بیٹی فاطمہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھوج کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تاکہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینان قلب رہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شمن شیرازی۔ بہاولپور

○ بابا جان میرا بیٹا چھ ماہ قبل آپریشن سے ہوا ہے۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر میرا زخم بہت دکھتا ہے بچے کو بہت مشکل سے دودھ پلا پاتی ہوں۔ ڈاکٹر کوئی بار دکھایا کہتی ہے سب ٹھیک ہے۔ بابا جان پلیز کوئی دوا دے دیں جس سے میں جلدی سے نارمل ہو جاؤں۔

☆ بیٹی شمن! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے تمہارا زخم اوپر سے ٹھیک ہو گیا ہوگا مگر اندر سے تو ابھی کچا ہی ہوگا۔ مجھے تمہاری تکلیف کا اندازہ ہے جلد از جلد مجھ سے دوا منگوا لو 10 دن میں انشاء اللہ اندر سے خشک ہو جائے گا۔ معلومات کے لیے جی کہانیاں کے دفتر فون کر سکتی ہو۔

□ فہد مبارک۔ U.K

○ بابا جی میں پاکستان سے آپ سے رابطے میں ہوں۔ آپ ہی کی بدولت میرا لندن پہنچا ہوں۔ آپ نے درست کہا تھا کہ زندگی یہاں بہت مشکل ہے ابھی تو بہن کے گھر پر ہوں مگر جلد ہی اپنا بندوبست کرنا ہوگا۔ جو بات آپ نے کہی تھی وہی میرے والد کہتے رہے کہ اپنے

ملک میں رہ کر محنت کرو اس وقت تو بس وطن سوار تھی چند مہینوں میں ہی اصلیت پہنچ چلی گئی اماں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ سے پوچھ لوں کہ تعویذ پہنے رہوں یا اُتار دوں میں تو چاہتا ہوں کہ پہنے رہوں مگر آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔ میری کامیابی کے لیے بھی دعا کرویں اور اگر دوسرا تعویذ ضروری ہو تو بتادیں۔ آپ کا بیٹا فہد دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ بیٹے فہد! جو چاہتے تھے وہ پالیا اب یہ مت سوچو کہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح اب فیصلے کو اپنے حق میں بہترین ثابت کرو۔ مجھ سمیت سب کے اندازے غلط ثابت کرو گے تو خوش رہو گے۔ بیٹے زندگی کہیں بھی سہل نہیں ہاں پردیس میں ذرا زیادہ سختی جھیلی پڑتی ہے مگر محنت کرنے والے ہی سرخرو ہوتے ہیں۔ تعویذ اب اُتار دو جس مقصد کے لیے دیا تھا وہ پورا ہوا۔ دوسرا تعویذ تیار کروں گا مگر ماہ صفر کے بعد منگوانا۔ انشاء اللہ سب خیر ہوگی۔

□ ناہید خانم۔ حیدرآباد

○ بابا جی! آداب! میں کافی عرصے بعد آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ بابا جی! اب سے چار سال پہلے میرے شوہر نے قرض لے کر پلاسٹک مولڈنگ کی مشین خریدی تھی ایک سال تک تو کاروبار چلا مگر اُس کے بعد سے مشین بالکل بند پڑی ہے۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ آپ کے تعویذ کی برکت سے میرے شوہر کو بینک سے لون ملا اور انہوں نے جگہ کرائے پر لے کر مشین سیٹ کر لی مگر ابھی تک کام شروع نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔ میں بہت پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ برائے مہربانی آپ استخارہ نکال کر بتائیں کہ شوہر کا یہ کام ٹھیک ہے اور کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں بہت سکون اور محبت تھی مگر دو تین سال سے پتا نہیں کیا ہو گیا؟ برائے مہربانی دبیر کے شمارے میں مجھے جواب دے دیں کہ گھر اور کاروبار میں برکت ہو اور قرض جیسی لعنت سے نجات مل جائے۔ میرے شوہر بہت پریشان ہیں۔ بچے الگ خاموش رہتے ہیں۔ میرے شوہر کے کاروبار میں برکت کے لیے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کروینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل بھی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزق حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کروئے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا ورد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

خصوصی دُعا کروائیں۔

✽ بیٹی ناہید! اللہ تمہارے مالی مسائل حل فرمائے۔
نماز کی پابندی سورۃ الواقعہ روز نماز عشاء کے بعد پڑھ کر
حاجت طلب کرے۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرے۔
اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ص م۔ ناروے۔

✽ بیٹی! میں تمہارے ہر خط کا جواب بہت پابندی
سے دے رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں ڈاک
کے نظام کی صورت حال کیا ہے۔ بہر حال دل میں کسی قسم
کا وہم بھی مست لانا۔ تم تو میری بہت اچھی بیٹی ہو۔ فون
کر کے خط کی بابت دریافت کر لیا کرو۔ تم سے کوئی بھی
ناراض نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی فون میں بھی مسئلہ ہو جاتا
ہے۔ اصل میں سارا مسئلہ فاصلوں کا ہے۔ تم محبت کرنے
والی ہو لہذا سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ بے فکر ہو کر فون
کر لیا کرو۔ خوش رہو! آباؤ اجداد!

□ سرفراز خان۔ میرپور خاص

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ
خیریت سے ہوں گے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ
پاک ہمارے سر پر بہت دیر تک رکھے۔ باباجی! میرا
مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے
کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔
پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

✽ بیٹی سرفراز!..... اللہ تمہیں کامیابی عطا
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُور و دُشرف بہت پڑھو۔
نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح زب۔ زدن علیہما
کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ چھ سات با دام ضرور کھایا
کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے
معلومات حاصل کر لو۔

□ علی مہر۔ سیہون

○ باباجی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت
سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ
میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں
بڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے
لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ "سچی کہانیاں" میں
لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا میں بھی اپنا

مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا
ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو
جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے
حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔
بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں
اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے بس
آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعا میں
دیتا رہوں گا۔

✽ بیٹی مہر!..... اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔
تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتہ لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ
میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتایا جاسکے۔ خط میں اپنا نام
مع والدہ ادریدی کا بھی مکمل نام لکھو۔
□ عرفانہ۔ نندو آدم۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں!
میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی
ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں
اُسے سمجھ نہیں سکتی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی
ہوں اور یہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا نہ ہی خود
سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں کروں تو جواب دے گا
ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیہ نہیں
دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔
میں چاہتی ہوں یہ بھی مجھ سے محبت کرے میری ہر
بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اب
میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن یہ فون
تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے بہن طعنے
دیتی ہے کہ پتا نہیں کب اپنے گھر جائے گی؟ بابا
جی! میں بہت بے زار ہوں خودشی حرام نہ ہوتی تو
اب تک کر چکی ہوتی۔ پیارے باباجی! کوئی ایسا
تعویذ دیں کہ یہ میرے بغیر رو نہ سکے اور اپنی غلطی
تسلیم کر کے مجھے لے جائے۔

✽ بیٹی عرفانہ!..... اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔
نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح سورۃ الناس
کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ شوہر سے ضرورت
کے تحت بات کر، مگر اپنے فرائض خوش آسنو بی سے
پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سُسرال چلے جانا چاہیے۔

بہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ باباجی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی آپ نے جیسے کہا ویسے ہی کیا اب بتائیے کیا کریں کہ اب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

بہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ باباجی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی آپ نے جیسے کہا ویسے ہی کیا اب بتائیے کیا کریں کہ اب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

اپنے شوہر کو بلوالو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہو گی خیال کرو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے گی۔ بیٹی.....! سمجھداری سے چلو گھر بنانا بہت مشکل ہے اور نہ میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□ علی شیر۔ سکھر

باباجی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی کا۔ اب تو دو بچے بھی ہو چکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباد کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے سمجھاتے رہے میں ویسے ہی چلتا رہا ہر ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ باباجی! اب بتائیں ان حالات میں میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کر رہا ہوں ابھی ان حالات میں بہت

طلاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام غوارش کا مکمل علاج اور وہ انہیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفاء ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C 11 ریسٹ ہاؤس، خیابان جامی کرسٹل، ریسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی، فز-7، کراچی

ہائپر پارک

مچی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

یہ شمشیر بھی ساتھ لیجیے اس کو حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے فاتحین نے کوشش کی اور ناکام رہے۔ نیولین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جو سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ ”میرے پاس اپنی تلوار موجود ہے جو دوسروں کی تلوار پر نظر رکھتے ہیں انہیں ہارنا پڑتا ہے۔“

مرسلہ: ممتاز اقبال اعوان۔ لاہور

کوشماتی صفات والا انسان

کم پیک (Kim Peck) غیر معمولی دماغی صلاحیتوں کا حامل معذور شخص ہے پیدائش کے وقت اس کا سر عام بچوں کی نسبت ٹھن گنا بڑا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ وہ ایک ایسی بیماری کا شکار ہے جس میں وہ اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتا مگر قدرت نے اسے حیرت انگیز یادداشت دی ہے۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں اس نے انسائیکلو پیڈیا کی آٹھ کتابیں زبانی یاد کر لی تھیں۔ وہ ایک لفظ چند سیکنڈ دیکھتا اور پھر بھی نہ بھولتا یوں اب تک نو ہزار کتابیں اس کے دماغ کے ”کمپیوٹر“ میں فیڈ ہو چکی ہیں۔ وہ اپنی دونوں آنکھوں سے بیک وقت دو مختلف تحریریں پڑھ سکتا ہے اسے اس وقت پندرہ مختلف موضوعات پر عبور حاصل ہے۔

دنیا میں کوئی بھی شخص اتنی حیرت انگیز دماغی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے۔

مرسلہ: مختار بانو۔ کراچی

عدل

عباسی خلیفہ منصور دوسری شادی کا ارادہ رکھتا تھا اس کی پہلی بیوی نے اس سے کہا کہ ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں۔ خلیفہ نے اس کی تسلی کے لیے امام ابوحنیفہ کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا۔ ”مسلمان کے لئے کتنی بیویاں جائز ہیں۔“

امام نے کہا۔ ”چار۔“

خلیفہ کی پہلی بیوی پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ خلیفہ نے اس کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔ ”حضرت ابوحنیفہ کی رائے سن لی؟“

امام ابوحنیفہ بولے۔ ”مگر خلیفہ منصور کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں۔“

خلیفہ نے دریافت کیا۔ ”یا امام کیوں؟“

امام نے کہا۔ ”تم نے جس انداز سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور جس لہجے میں گفتگو کی ہے اس سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کرتے۔ لہذا ہمارا یہ حکم ہے اور تم اسی پر قیامت کرو۔“

مرسلہ: فرح عالم۔ اسلام آباد

جیتنے کا گر

نیولین جب مشہور جرمن قانع فریڈرک کے مزار پر گیا تو اس نے مزار کے سربانے فریڈرک کی شہرہ آفاق تلوار آویزاں دیکھی۔ جب نیولین واپس جانے لگا تو اس کے افسر نے کہا جناب عالی!

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمق

ایک سیاسی لیڈر نے ایک رسالے کے ایڈیٹر سے فون پر کہا۔

”مجھے کسی نے کہا ہے کہ آپ نے اپنے رسالے میں مجھے احمق اور جاہل لکھا ہے۔“

”نہیں جناب!“ ایڈیٹر متانت سے بولا۔ ”کسی اور رسالے میں لکھا ہوگا۔ میں اپنے رسالے میں ایسی باتیں شائع نہیں کرتا جو قارئین پہلے سے جانتے ہوں۔“

مرسلہ: ڈاکٹر شہباز۔ حیدر آباد

بونس

”اچھا تو گویا تم نے محبت کی اور دھوکا کھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ نقصان بھی اٹھایا؟“

”نہیں میں نے محبت تو کی لیکن میرے خیال میں نہ تو میں نے دھوکا کھایا اور نہ ہی میں نقصان میں رہا۔“

”وہ کیسے؟“

”رضیہ نے میری مٹکائی کی انگوٹھی اور میرے دیے ہوئے تحفے واپس کے تو غلطی سے ان میں دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل کر دیے۔“

مرسلہ: صبیحہ امتیاز۔ سیالکوٹ

محبت

شیکسپیر نے ”ہیلنٹ“ میں لکھا ہے کہ محبت انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ محبت دماغ کا ایک خلل ہے کہ اگر کوئی انسان اس خلل میں مبتلا ہو جائے تو اس کا علاج مشکل ہے۔

سارے خواب سارے چہرے سارے مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک چہرہ آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ ”محبوب کا چہرہ“

مرسلہ: نانکے غففر۔ کراچی

مونالیزا کی مسکراہٹ کا راز

مونالیزا دنیا کی مشہور ترین بیننگ ہے جس کی مسکراہٹ پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

حال ہی میں مونالیزا کے سائنسی مشاہدے کے بعد سائنسدانوں کا خیال ہے کہ مونالیزا نے جب تصویر بنوائی تھی اس وقت حال ہی میں اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اس لیے اس کے ہونٹوں پر کھلنے والا تبسم دراصل ایک نئی نویلی ماں کی تھکاوٹ اور سرشاری کے ملے جلے جذبات تھے۔ مونالیزا کے اسرار سے پردہ ہٹانے کے لئے کینیڈا کے ادارے نے جدید ترین آرٹ استعمال کر کے تصویر کی سخت مصوری کی تکنیک، عمر رسیدگی اور رنگوں اور وارنش کا بغور جائزہ لیا اس سے پتا چلا کہ اس نے ایک قسم کی ٹوپی بھی پہنی ہوئی ہے جسے اس زمانے میں نئی ماں بننے والی خواتین پہنا کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شفاف ٹوپی کے رنگ معدوم ہوتے چلے گئے اور اب یہ نظر نہیں آتی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مونالیزا نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا۔

مرسلہ: احسن شہزاد۔ لاہور

کارنامہ

ایک شخص نے چار ڈاکوؤں کو پستول دکھا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد اس شخص نے ڈاکوؤں سے کہا۔ ”اچھا ہوا کہ آپ میں سے کسی نے پستول کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ بھری ہوئی ہے یا خالی ہے؟“

ایک ڈاکو حیرت سے بولا۔ ”تو کیا پستول خالی تھی؟“

”نہیں! پستول تو بھری ہوئی تھی مگر کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ پستول اصلی ہے یا غلطی؟“

دوسرے ڈاکو نے تعجب سے پوچھا۔ ”تو کیا پستول نقلی تھی؟“

اس شخص نے کہا۔ ”ہاں! وہ نقلی تھی۔“

تیسرے ڈاکو نے کہا۔ ”مگر تم نے کہا تھا کہ پستول بھری ہوئی تھی۔“

”ہاں! پستول تو بھری ہوئی تھی..... مگر پانی سے۔“

اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

بج جاؤں گا

ایک بے تحاشا سونا آدی تین منزلہ عمارت سے نیچے گر گیا۔ تین گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر سے کہنے لگا۔

”ڈاکٹر صاحب! کیا میں بچ جاؤں گا؟“ تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”جی ہاں! آپ تو بچ گئے ہیں مگر آپ کے نیچے آکر تین آدی مر گئے ہیں۔“

مرسلہ: حنیفہ بیگم۔ کراچی

سنہری باتیں

☆ ناں سے بات شروع ہو تو دامن ہی نہیں دل بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر نہ دل میں جگہ ملتی ہے نہ دامن میں۔

☆ نقصان وہ نہیں جو آپ کو ذاتی دکھ سے بٹھا دے۔ نقصان وہ ہے جو آپ کو کسی کی نظر سے گرا دے۔

☆ شارٹ کٹ کتنا بھی صاف کیوں ہو اس کا میلہ پن آنکھوں اور دل سے کبھی نہیں جاتا۔

☆ مکاری اور عیاری سے کسی کو راستہ دکھایا جائے تو اس کے نشان اپنے ہی گھر تک ضرور آ جاتے ہیں اور ڈھیر سارے آنسوؤں اور دکھوں کو ساتھ لاتے ہیں۔

☆ رویوں میں اندھیرا آئے تو صرف اس کو کوئے مت بیٹھ جائے ممکن ہے آپ کے ایک چراغ جلانے سے کسی کے اندر کی کچھ تاریکی کم ہو جائے۔

☆ قسمت کے کھلنے کا انتظار نہ کریں بلکہ آگے بڑھ کر دستک دیں۔

مرسلہ: شائستہ انور۔ اسلام آباد

بم ہونے، تم ہونے کا.....

ایک بستی کے سب باشندے بھنگ کے عادی ہو گئے امام مسجد نے یہ خرابی دور کرنے کے لیے سوچا کہ جمعہ کے دن اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ بھنگ کے نقصانات کیا ہیں۔ انہوں نے خطبے سے پہلے بھنگ کی خرابی اور نقصانات بتائے۔ ساتھ ہی اللہ کے عذاب سے بھی ڈرایا۔

نمازی جو بھنگ کے عادی تھے۔ خاموشی سے سنتے

رہے۔ امام صاحب جب خاموش ہوئے تو ایک شخص نے سوال کیا۔ ”کیوں جناب! کیا بھنگ اسی بوٹی کا نام ہے جسے خرگوش بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔“ یہ سوال سن کر امام صاحب نے اپنی پگڑی سے ایک پڑیا نکالی اور اس شخص کی طرف پھینکتے ہوئے بولے۔

”بے وقوف! اس بوٹی کا نام بھنگ نہیں ہے جسے خرگوش بڑے شوق سے کھاتے ہیں بلکہ اس بوٹی کو بھنگ کہتے ہیں جو اس پڑیا میں ہے۔“

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن دہاڑی

آخری چراغ

اس بستی کے سارے چراغ ایک جیسے ہیں

تم اپنے دل کا آتش کدہ بجھنے نہ دینا

کہ یہ مقدس مٹی کا آخری چراغ ہے

شاعر: رسا چغتائی

ایسا بھی ہوتا ہے

☆ بھی بھی خود بخود کا ہوا مسافر دوسروں کو راستہ دکھانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل وہ خود اپنے راستے کی درست سمت کا کھونچ لگانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔

☆ میرے دوست نے مجھے وہ بات بتائی جو میں نے کہیں اکیلے میں خود کلائی کے انداز میں کہہ ڈالی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی میں نے بات سے پوچھا کہ وہ میرے دوست تک پہنچی کیسے بات بولی! تمہاری طرف سے ملنے والی آزادی کے ذریعے۔

☆ جب خوف کی پرچھائیاں گہری ہو جائیں تو ہم دلیری کی دھوپ اپنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لیے حوصلہ کے سورج کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

☆ کبھی کبھی ہم فاصلوں سے لڑ پڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہمیں آگے بڑھنے کی ترغیب بھی دے رہے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: محمد اسامہ۔ کراچی

وقت

اس کے پاؤں کی آہٹ سنی نہیں جاسکتی۔
ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔

ایسی شے نہیں جو قوت اور دولت سے خریدی جاسکے۔
اسے ضائع کرتے وقت یہ یاد رکھو کہ وہ بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔

زندگی کی قیمتی دولت ہے جس نے اسے کھویا اس نے ساری دنیا کھو دی۔

اس کا غلام بن جانا بہترین دانتی ہے۔
مرسلہ: نگہت منیر۔ ادکاڑہ

سید جمال الدین افغانی

سید جمال افغانی انیسویں صدی میں اسلامی دنیا کی ایک اہم شخصیت تھے۔ آپ افغانستان کے ایک گاؤں سعد آباد میں 1838ء میں پیدا ہوئے۔ سید جمال الدین افغانی نے مصر میں مسلمانوں کے اتحاد کے لیے ”پان اسلام ازم“ کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔ سید جمال الدین افغانی آخری عمر میں سلطان ترکی کی دعوت پر قسطنطنیہ گئے وہیں آپ نے 1897ء میں سرطان کے مرض کی وجہ سے انتقال فرمایا۔ آپ کو ترکی کے شہر استنبول میں امام بن کینا گیا۔ 1939ء میں افغانستان کے بادشاہ نے ترکی کی حکومت سے درخواست کی کہ سید جمال الدین افغانی کی میت کو افغانستان بھیج دے۔ لہذا ان کی میت کو کابل بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ کا ایک برا خوب صورت مقبرہ ہے۔

مرسلہ: عامر بشیر۔ سعودی عرب

حیرت کدہ

جاپان میں ایک ایسا قہرمان بنایا گیا ہے جسے جسم کا درجہ حرارت ناپنے کے لیے منہ میں نہیں رکھنا پڑتا بلکہ یہ مریضوں کے جسم سے تیس تیس میٹر کے فاصلے سے چار سیکنڈ میں درجہ حرارت بتانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے ”ریڈیو قہرمان“ کا نام دیا گیا ہے اور یہ انسانی جسم یا کسی دوسری چیز سے نکلنے والی انفراریڈ یعنی ہلالے بنفش شعاعوں کی توانائی ناپ کر درجہ حرارت بتاتا ہے۔

مرسلہ: غیاث الدین۔ پشاور

گلوبل ویلج

دنیا اتنی چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے
امریکہ میں ہوتے ایکشن
براہ راست اپنی دیوار سے دیکھ رہا ہوں
شاعر: خضر حیات۔ روڈ ہٹل۔ خوشاب

صحت کا اثر

پاگل خانے کا ڈاکٹر حیران ہو کر نرس سے وجہ پوچھنے لگا کہ ”یہ پاگل چھت سے کیوں لنگ رہا ہے؟“
نرس نے بتایا۔ ”یہ اپنے آپ کو بلب سمجھ رہا ہے۔“
”لیکن اس طرح تو یہ پاگل نیچے گر جائے گا۔“
انتار دوا ہے۔

”مگر ڈاکٹر۔“ نرس نے احتجاج کیا۔

”اس کے اترنے سے تو کمرے میں اندھیرا آد جائے گا۔“

مرسلہ: محمد اسماعیل بروہی۔ نواب شاہ

کھلاڑی

فٹ بال کے دو کھلاڑی آپس میں پاتیں کر رہے تھے۔
پہلا: ”میں نے ایک بار اتنی اونچی فٹ بال پھینکی کہ پورے چار گھنٹے بعد واپس آئی۔“
دوسرا: ”یہ تو خیر کوئی بات نہیں! میں نے ایک دفعہ اتنی اونچی فٹ بال پھینکی کہ پورے تین دن بعد واپس آئی اور اس فٹ بال کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی جس پر لکھا تھا۔“ یہ فٹ بال آئندہ چاند پر نہ آئے۔“
مرسلہ: مور شاہد حسین۔ قمبر شہدادپور

نظم

کسی آن دینی خواہش کو

مری جاں

جب سے ہم نے دل میں پالا ہے

اُسی دن سے

کسی حسرت زدہ لمحے نے

ہم کو مار ڈالا ہے

شاعر: مقصود وفا



قارئین

اپنی سخن فنی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

ایو ہریہ بلوچ..... پورے والا
آئے نہ یارو ہم کو بھی آداب رخصتی
وہ جاچکا تو بعد میں ہم چشمِ نم ہوئے
جواد انور..... اسلام آباد
دن ہوں مصلحت کے بوجھ تلے
حوصلہ مجھ میں ہے پشانون کا
بور یوں میں اناج بھرنے سے
پیٹ بھرتا نہیں کسانوں کا
محمد قاسم بلوچ..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
رحمت بھی تو رفتہ رفتہ رحمت ہو ہی جاتی ہے
خلسلِ غم سے غم سہنے کی عادت ہو ہی جاتی ہے
سیٹھا ہو اگر تم سا ضرورت کیا ہے مرہم کی
کہ کانٹوں سے بھی زخموں کی جراحت ہو ہی جاتی ہے
سعادت علی خان..... لیہ
طلسم خواب زلیخا و دام بروہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں
حنا اشتیاق..... کراچی
تمہیں خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبوبوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے
محمد وسیم..... روڈہ بھل خوشاب
جان دینے کی اجازت بھی نہیں دیتے ہو
ورنہ مر جائیں ابھی مر کے منالیں تم کو
سید عبادت کاظمی..... رحیم یار خان
ہجر کے ساحل پہ کس کے منتظر بیٹھے ہو تم
اس سمندر سے بھلا کب لوثی ہیں کشتیاں

متصو وا حمد بلوچ..... حیدر آباد
میں اپنے ہاتھ سے بھی کھو نہ جاؤں
تمہاری سکھوچ جنگل ہو گئی ہے
تمہارے بعد کچھ بدلا نہیں ہے
سنا ہے شام پاگل ہو گئی ہے
رضوانہ کوثر..... لاہور
جانے کس نیند میں سوئے ہیں مرے شہر کے
لوگ
دن نکلنے پہ بھی بیدار نہیں ہے کوئی
غشی محمد عزیز مئے..... لڈن ڈھاڑی
ظلم ہو تیغ ہو تیشہ کہ ڈھال مت چھینو
کبھی کسی سے کسی کا کمال مت چھینو
ابھی بھھاؤ نہ کینڈل نہ سیک کاٹو ابھی
کچھ اور دیر میرا پچھلا سال مت چھینو
خضر حیاتہ..... روڈہ بھل خوشاب
آئنے ایسے تجھے ہیں سب کے چہرے چمن گئے
اب کسی سے بھی کسی کی کچھ شناسائی نہیں
اس فراوانی سے توبہ الاماں اس قحط سے
روشنی ہی روشنی ہے اور بینائی نہیں
ریاض حسین بلسم چوہان..... فیصل آباد
تجھے تم سے محبت ہو گئی ہے
یا شاید مجھ کو ایسا لگ رہا ہے
ڈاکٹر شہباز..... حیدر آباد
میں کسے پھرتا بھلا حوصلہ جوان لیے
کہ زندگی نے بہت مجھ سے امتحان لیے

اندھیرا بڑھ رہا ہے سانپ بن کر
سفر نامہ مغیر ہونے لگا ہے
افعال حسین بابر.....کراچی

ڈوبتے ہم نہ محبت کے بھنور میں ہرگز
گر پتا ہوتا ہمیں درد کی گہرائی کا
شیم شفیق.....اسلام آباد

مرے خدا تو مرا اضطراب جانتا ہے
گزر رہے ہیں جو جاں پر عذاب جانتا ہے
تمام عمر جو سوچا تجھے خبر اس کی
تمام عمر جو دیکھے وہ خواب جانتا ہے
یاسمین عمران.....وزیر آباد

چلا ہے مجھ میں جہاں تک مجھے ضرورت تھی
قدم اٹھاتا ہوا شخص میرے پاؤں کے ساتھ
عاصم خان نیازی.....سوات

میرا دشمن بھی مرے دل میں اتر سکتا ہے
اپنے اندر کوئی دیوار اٹھاتا نہیں میں
یہ بلندی تو مجھے عشق نے دی ہے ورنہ
اپنے سر پر کوئی کہسار اٹھاتا نہیں میں
صفیہ سلطانہ.....جیکب آباد

کسے منظر سے ہٹائے گی مجھے یہ دنیا
میں کہیں ذہن کہیں دل پہ رقم ہوتا ہوں
کوثر سعید.....لاہور

آدی تھا خدا بنا دیا ہے
عشق نے کیا سے کیا بنا دیا ہے
کوئی سچ پر چلے چلے نہ چلے
ہم نے تو راستہ بنا دیا ہے

ایک معین.....کراچی

تم ہی نے ہم کو سنایا نہ اپنا دکھ ورنہ
دعا وہ کرتے کہ ہم آسماں ہلا دیتے
تجہیں بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں!
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے؟
شاہانہ احمد.....حیدر آباد

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
ایم افضل آزاد.....ساہیوال

عجب رنگ محبت کر رہا ہے
وہ میرے دل سے ہجرت کر رہا ہے
تمہارے پیار کا زخمی سپاہی
محبت کی حفاظت کر رہا ہے
زاہد کولہچی.....نواب شاہ

سچ کہو کیا دیا محبت نے
تم کو بے چیدیاں ملال مجھے
سنان عمرانی.....سجاد

چاند ہے رات ہی کی دنیا تک
خواب ہے ذات ہی کی دنیا تک
وہ محبت جو روح میں اُتری
تجھی خیالات ہی کی دنیا تک
علی رضا عمرانی.....پنجاب

لے دے کے محبت کی جگہ درد نے لے لی
اب ٹوٹ کے رویا ہوں تو آرام بہت ہے
تنویر قاطمہ.....کراچی

محبت کا اثر ہونے لگا ہے
ترا چہرہ قمر ہونے لگا ہے

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے

کوہن برائے

تیرنیم
کش

جنوری 2017ء

نام:

پتہ:



پندرہویں سیر کی مختصر سی کہانی

لکڑی کی ملکہ



جاوید راہی

فراعنہ کی سرزمین سے اُس گم شدہ ملکہ کی داستان جسے حاسدین نے لکڑی کا بنا دیا تھا

ساحر کہنے لگا۔ ”کھانا کھاؤ گے، جاؤ دوسری میز پر بیٹھو، کھانا دہیں آجائے گا۔“

”میں کھانا کھا چکا ہوں۔ صرف تھوڑا سا وقت لوں گا تم سے۔“ اس نے کہا۔ ساحر اس سے بات کر رہا تھا لیکن میری زبان بند ہو گئی۔ اس کی وجہ اس کے ہاتھوں میں پڑی انگوٹھیاں تھیں۔ ہیروں اور قیمتی پتھروں کے بارے میں، میں اتنا کیسے جانتا ہوں یہ بعد میں بتاؤں گا اس وقت اتنا کہہ سکتا تھا کہ وہ انگوٹھیاں سب ملا کر کوئی ایک ڈیڑھ کروڑ کی مالیت کی تھیں اور اس میں ذرہ برابر کوئی شک کی بات نہیں تھی۔ مجھے جب یقین ہو گیا کہ انگوٹھیوں کی مالیت کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے تو میں نے غور سے اس شخص کا چہرہ دیکھا اس کے لباس نے بے شک ہمیں عجیب سے احساس کا شکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے اس کے چہرے پر غور کیا تو وہ مجھے ایک سنجیدہ اور بارعب سی شخصیت کا مالک نظر آیا۔

ساحر کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا ”تشریف رکھئے۔“

”شکریہ“ وہ بیٹھ گیا۔

ستارہ ہوٹل کوئی بہت معیاری ہوٹل نہیں تھا لیکن یہاں کے کھانے لا جواب ہوتے تھے خاص طور سے صاحب ذوق حضرات کے لیے کچھ چیزیں تو کمال کی ہوتی تھیں اور میں اور مرزا ساحر اکثر یہاں آ جاتے تھے۔ پہلے یہ ہوٹل اتنا صاف ستھرا اور کشادہ نہیں تھا لیکن جوں جوں اس کے کھانوں کی شہرت ہوتی ہوٹل کے مالکان نے بھی اس کا معیار بڑھانا شروع کر دیا۔ آس پاس کی جگہیں خریدی گئیں اور انہیں بہت عمدگی سے بنایا گیا۔ یہاں تک کہ ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ ہو گیا۔ اس وقت بھی باہر دھوپ ہو رہی تھی اور اندر کا ماحول خنک تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ شخص ہم پر نازلی ہو گیا۔ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال عمر ہو گی۔ غربی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھا جو میاں پھیلا اور کسی حد تک بوسیدہ تھا۔ گھٹے میں ایک موبلی سی مالا پڑی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بھٹکا۔

”بہت غیر معیاری حرکت کر رہا ہوں لیکن اگر آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دو تو خوشی ہوگی۔“

ہم دونوں ہی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”آپ شاید عین اطرین اتفاق الحہ کے مصنف ہیں۔“ مرزا ساحر سے نہ رہا گیا اور نووارد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔
”میں سمجھا نہیں۔“

”جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ ہم بھی نہیں سمجھے۔ آپ اتنے مشکل الفاظ بول رہے ہیں۔“
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن وہ

”آپ تکلف نہ کریں۔ اگر کھانا نہ کھایا ہو تو میں منگواؤں؟“ میں نے کہا۔
”دوبارہ شکریہ ادا کروں گا۔ کھانا کھا چکا ہوں۔ اصل میں اگر کسی کے پاس کوئی فن ہو اور اتفاق سے اسے کچھ ایسے کام کے لوگ نظر آجائیں جو اس کے لیے ایک تعمیر مستقبل ہوں اور وہ ان کے لیے سونے کی کان ہو تو پھر ہر تکلف بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔“



WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بالکل سنجیدہ تھا۔ اس دوران ہم کھانا ختم کر چکے تھے۔ اس نے کہا۔

”میں نے ایک علم کی بات کہی تھی آپ نے دوبارہ اس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔“
”اوہو۔ آپ اپنے کسی علم کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ کیا آپ آہن خور ہیں، کیلیس، بلیڈ اور لوہے کی دوسری چیزیں کھاتے ہیں۔“ مرزا نے پھر اس کا مذاق اڑایا۔

”نہیں۔ میرے پاس ایک انوکھا فن ہے۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔“
”بتائیے۔“

”میں چہرہ شناس ہوں۔ انسان کی پیشانی دیکھ کر اس کی پوری زندگی میں جھانک لیتا ہوں۔ میں کھانا کھا رہا تھا کہ اتفاق سے آپ پر نگاہ پڑ گئی اور آپ کے بارے میں جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔“
”کیا جانا آپ نے ہمارے بارے میں“ مرزا نے پھر کوئی مزاحیہ جملہ کہنا چاہا تھا کہ اس سے پہلے میں بول پڑا۔

”یہ صاحب۔“ اس نے مرزا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”بچپن میں ماں باپ سے محروم ہو گئے۔ ان کے والد ایک اچھے خاصے تاجر اور کھاتے بیٹے آدمی تھے لیکن وہ اور ان کی بیگم ایک حادثے میں چل بسے۔ ان کے والد کا کاروبار ان کے چچا سنبھالتے تھے۔ ان کی چچی ایک لاپٹی خاتون تھیں۔ انہوں نے ان کی دولت پر قبضہ کرنے کیلئے انہیں زہر دے دیا، ان کی زندگی تو بچ گئی لیکن یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ ہسپتال میں تھے کہ نکل بھاگے اور پھر مارے مارے پھرتے رہے۔ دنیا کے کئی ملکوں میں گئے اور ان کا ذہنی توازن ٹھیک ہو گیا۔ اس دوران ان کے چچا ان کی ساری دولت ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے انہیں معاف کر دیا اور پھر ایک سمندری جہاز پر نوکری کر کے ملک سے نکل گئے۔ آپ سے ان کی ملاقات ایک دوسرے ملک میں ہوئی جہاں یہ ایک معصیت میں پھنس گئے تھے وہاں سے آپ لوگوں کی دوستی ہو گئی اور آپ دونوں مشترک زندگی گزارنے لگے اور

اب آپ کے بارے میں۔“
اس نے میرا ماضی دہرائنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں سیکتے کے عالم میں اسے سن رہے تھے اور ہماری عقل ضبط تھی۔ مجھ سے زیادہ مرزا ساحر متاثر تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ پھر خود ہی بولا۔

”اپنی زندگی کے کسی اہم لمحے کے خاص واقعے کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو۔۔۔۔۔“
”میں اپنی بیوی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر کہاں گئی۔“ مرزا نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”اور میرے دونوں بچے اب کہاں ہیں؟“

وہ مرزا کو دیکھنے لگا اور پھر بولا ”آپ کی کبھی شادی نہیں ہوئی۔“

”اور بچے۔۔۔۔۔؟“ مرزا بولا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“ میں نے کہا۔
”اغران غربی۔“

”سبحان اللہ۔“ مرزا نے خیالی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

”آپ لوگ سنجیدہ ہونا پسند کریں گے۔“ اس بار اس نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

”آپ ہمیں ہمارے مستقبل کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ دو ٹوک بولا۔ ”مستقبل کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے راز کوئی نہیں جان سکتا۔“

”اور یہ جو نجوی حضرات، بلکہ حشرات ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کے تمام مسئلے چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟“

”پیٹ کی تکلیف کا شکار ہیں بے چارے۔ پیٹ روٹی مانگتا ہے اور جو کچھ کرتے ہیں پیٹ بھرنے کے لیے کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔“

”گڈ۔۔۔ آپ کا نام عجیب ہے۔ اگران غربی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟“ مرزا ساحر ہی اس طرح کے سوالات کر سکتا تھا۔ اس نے اس سوال کا

جواب نہیں دیا۔ مرزا نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر بولا۔

”ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔“

”مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں ایک اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں جس کا میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ حیران مت ہونا بالکل اتفاق سے مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ تم میرا کام کر سکتے ہو اور ان دنوں تم مالی پریشانیوں کا شکار بھی ہو۔ اگر میرا کام کرنا پسند کرو تو آج شام یا زیادہ سے زیادہ کل تک مجھ سے اس سچے پرل لو۔ اگر تم کل تک میرے پاس نہ آئے تو میں سمجھوں گا کہ تم میرے ساتھ کام کرنے پر تیار نہیں ہو۔ پھر میں کسی دوسرے شخص کو تلاش کروں گا۔“

”واہ۔ چاہا کیا ہے؟“ مرزا ساحر نے کہا اور اس نے اپنے لباس سے ایک سادہ سا کارڈ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ایک شاندار علاقے کا پتا لکھا ہوا تھا۔

”اگر آج آنا چاہیں تو کس وقت؟“

”شام کی چائے میرے ساتھ پی لینا۔ تقریباً چھ بجے۔“

”ہم آئیں گے۔“ میں نے کہا اور وہ فوراً اٹھ گیا پھر رکی سلام دعا کیے بغیر واپس جڑا اور ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔

”یہ سارے ڈرامے ہماری تقدیر میں ہی لکھے ہیں؟ کیا شے تھی یار یہ؟“ مرزا نے کہا۔

”جو کچھ بھی تھی معمولی شے نہیں تھی۔ جو کچھ اس نے ہمارے بارے میں بتایا اسے تم معمولی کہہ سکتے ہو؟“

”ہاں۔ بات تو چکرا دینے والی ہے لیکن اس دور میں بڑے بڑے شعبہ جات جنم لے رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو تم اس کے بارے میں۔“

”یار میں تو بہت متاثر ہوا ہوں۔“

”اس کا حلیہ تو بتاتا ہے کہ وہ درگاہ پر مجاوری کرتا ہوگا۔“

”بیوقوف آدمی۔ درگاہ کی مجاوری معمولی بات

نہیں ہوتی۔ تم نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں پر غور نہیں کیا تھا؟“

”کیا تھا ان انگلیوں میں؟“

”تم جانتے ہو مجھے اعلیٰ پتھروں اور ہیروں کی کافی شناخت ہے۔ اس نے بلا مبالغہ کوئی دو کروڑ روپے کی قیمت کی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔“ مرزا کو زور کا پھندا لگ گیا۔ پانی کے کئی گھونٹ پینے کے بعد اس نے کہا۔

”یار کچھ کم کر دو۔“

”یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور مرزا ساحر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

”خیر۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“

☆.....☆

جس کوشی کا اس نے پتا دیا تھا وہ اپنی شان آپ تھی۔ ہم ڈرتے ڈرتے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ خوبصورت لان پر میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں اور وہ اس فقیرانہ حلیے میں یہاں موجود تھا۔ اس نے ہمارا خیر مقدم کیا بیٹھنے کی پیشکش کی پر بولا۔ ”ہم چائے کے بعد باتیں کریں گے۔“

چائے بھی بے حد پر کلف تھی کم از کم میں اس پر بڑا اثر مندہ ہوا۔ ریسٹوران میں ہم نے سوچا تھا کہ یہ شخص شاید ہم سے کھانے کے بارے میں درخواست کرے لیکن اس وقت صرف چائے کے سلسلے میں میز لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

چائے کے بعد وہ بولا ”تھوڑے سے علم سیکھے ہیں میں نے، جن کا مظاہرہ میں نے تمہارا ماضی بتا کر کیا تھا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ مجھے تمہاری تلاش ہے۔ میرے علم نے نشاندہی کی تھی کہ تم دونوں ہی میرے کام آ سکتے ہو اور میں نے آخر تمہیں تلاش کر لیا۔“

”آپ کا نام عجیب ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ شاید مگر میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا۔ تم نے دنیا کے بہت سے ممالک دیکھے ہیں۔“

”ہاں۔ ہم دونوں آوارہ گرد ہیں۔“

نے کہا۔
"ویسے آپ مئی کس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" ویسے اتنا میں تمہیں بتا ہی دوں کہ وہ مئی کسی مرد کی نہیں بلکہ ایک عورت کی ہے۔
"اچھا۔" مرزا ساحر نے حیرانی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"مرزا تھوڑا سا سنجیدگی کا موڈ طاری کر لو۔" میں نے ذرا برہمی سے کہا اور مرزا خاموش ہو گیا تھا۔ اعران غربی نے پھر کہا۔

"اگر آپ دونوں کام کے لیے تیار ہو جائے ہیں تو پھر مجھے آپ کے پاسپورٹ درکار ہوں گے۔"
"ایک منٹ، ایک منٹ ہر کام کا کوئی نہ کوئی معاوضہ ہوتا ہے۔" ساحر نے کہا۔

"منہ مانگا معاوضہ ملے گا۔" اعران غربی بولا اور ہم دونوں کچھ دیر کے لیے گنگ ہو گئے۔ زندگی میں بڑے خواب تھے، بڑے کام کرنے تھے اور اب شاید ان کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کے مرزا کچھ بولے میں نے ایک بڑی رقم بولی لیکن جواب ہم دونوں کی توقع کے برخلاف تھا۔

"تم لوگ اطمینان رکھو میرا کام پورا ہونے کی صورت میں تمہیں اس سے تین گنا رقم کی ادائیگی ہو جائے گی۔" ہم دونوں ہی حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے۔ پھر مرزا ساحر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"کس طرح؟"

"کیا تمہارا کوئی بینک اکاؤنٹ ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، تم دونوں اپنے اپنے بینک اکاؤنٹ کھلو، ایک تمہاری رقم کام پورا ہونے سے پہلے تمہارے اکاؤنٹ میں برابر بھیج دیا جائے گی اور پھر جیسے ہی کام پورا ہوگا بقیہ رقم بھی تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی۔"

"یہ بھی مناسب ہے۔" مرزا نے کہا۔

"مصر جتنے ہو کبھی۔"

"ہاں جا چکے ہیں۔"

"گویا وہاں کے ماحول سے واقفیت رکھتے ہو۔"

"کسی حد تک۔"

"کبھی کسی مقبرے میں خزانے کی تلاش میں گئے۔"

"نہیں۔"

"حالا تکہ تم دولت پرست ہو۔"

"وہ کون نہیں ہوتا۔"

"مصر کے مقبروں میں تو بہت کچھ ملتا ہے۔"

"زندگی نہیں ملتی۔"

"مطلب۔"

"ہمارا مقصد ہے کہ دولت کے حصول کی کوشش ضرور کرو، لیکن زندگی کی قیمت پر نہیں۔ پہلے زندگی بعد میں اور کچھ اور یعنی دولت وغیرہ۔"

"وغیرہ سے کیا مراد ہے؟"

"عشق، عورت۔" ساحر بہت منہ پھٹ تھا۔

اعران غربی مسکرا دیا۔

"خیر، وہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ میں تمہیں اپنے کام کی نوعیت بتا دوں۔ مصر کے فرعون

مقبرے سے مجھے ایک مٹی درکار ہے۔ اصل میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے پراسرار علوم سے دلچسپی ہے اور میں اس پر بہت سے تجربات کر چکا ہوں۔

میں نے دنیا بھر کے آثار قدیمہ کی سیر کی ہے اور وہاں سے بہت سا علم حاصل کیا ہے۔ ان دنوں بھی میں کچھ تجربات کر رہا ہوں اس مقصد کے لیے مجھے بس ایک مٹی درکار ہے۔"

"گویا ایک حنوط شدہ لاش۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس کو مٹی کہتے ہیں۔"

"اس کام کے لیے تو مصر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" ساحر بولا

"کیوں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"مٹی بنانا کون سا مشکل کام ہے، آج کل۔"

"بڑی لچھے واریاتیں کر رہے ہو تم۔" اعران

”ٹھیک ہے۔“ ساحر نے کہا اور ہم اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

چند ضروری کاروائیوں کے بعد اکاؤنٹ کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ اعلان غربی کا فون بھی موصول ہوا تھا۔

”دوستو! ہمارا کام ہو گیا ہے، تم لوگوں کے ویزے لگ گئے ہیں اور تمام تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں اور سنو تم دونوں اپنے اکاؤنٹ بیلنس چیک کر سکتے ہو حسب وعدہ طے شدہ رقم کا ایک تہائی معاوضہ تمہارے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کر دیا گیا ہے۔“

ہم دونوں حیران رہ گئے تھے، ابھی تو بینک منیجر نے فون کر کے اکاؤنٹ نمبر بتائے تھے اور ابھی رقم بھی ٹرانسفر ہو گئی، بہر حال دوسری طرف سے پھر کہا گیا: ”اپنے معاملات سے فارغ ہو کر آپ لوگ کل شام تک میری کوٹھی پہنچ جائیں۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں تاکہ سفر کی کچھ معلومات آپ کو سمجھائی جاسکیں، اس کے بعد آپ لوگ سفر کا آغاز کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ساحر نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد ساحر نے بینک منیجر کو فون کر کے بیلنس چیک کیا تھا اور اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ ہم دونوں نے ضروری سامان نیک کیا اور وقت مقررہ پر اعلان غربی کی کوٹھی پہنچ گئے۔ اعلان غربی نے ہمارا شاندار استقبال کیا تھا۔ چند ضروری باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”اہرام مصر کے علاقوں سے آپ تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ایک مخصوص علاقے تک پہنچنے کے بعد آپ اونٹوں کے ذریعے چھس کی پہاڑیوں کی جانب سفر کریں گے۔ ان کے آس پاس ہی ہماری منزل ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ ساحر نے کہا وہ اب بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔

اعلان کافی دیر تک ہم دونوں کو مختلف باتیں سمجھاتا رہا تھا۔ پھر ایک پر تکلف ڈنر کیا گیا اور ہم دونوں کو آرام کے لیے ایک کمرہ مہیا کر دیا گیا جہاں

”اور اب میں تمہارا آخری جواب سنتے کا شدت سے منتظر ہوں۔“ یہ کہہ کر اعلان غربی خاموش ہو گیا تھا۔ ساحر بھی اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا، ہم دونوں ہی اپنے طور پر سوچ رہے تھے پھر تھوڑی دیر کے بعد ساحر نے کہا۔

”تمہاری اس پرکشش آفر کے بدلے میں ہم زندگی واؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیں۔“ ساحر نے میری طرف دیکھے بغیر ہی یہ الفاظ کہے تھے چنانچہ اعلان غربی نے میری طرف دیکھ کر میری بھی رضامندی جانتا چاہی اور میں نے بھی ساحر کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں اعلان غربی تمہاری اس پیشکش کو قبول کرتے ہیں۔ اب ہمیں آگے کا پروگرام بتاؤ۔“

”آگے کا پروگرام یہ ہے دوستو کہ تم آج ہی اپنے پاسپورٹ میرے حوالے کرو گے ساتھ ہی ساتھ اپنے اکاؤنٹ کھولنے کی کارروائی پوری کر لو، ہمیں جلد از جلد یہ کام مکمل کر لینے ہیں۔ سفر کا سامان اور باقی تمام تیاری میرے ذمے، بس آپ سے جو کام کہا گیا ہے اسے پورا کر لیں اور میرا خیال ہے اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔“ ہم دونوں نے اُٹھتے ہوئے کہا اس کے بعد اعلان غربی سے اجازت لے کر اس کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھتے ہوئے ساحر نے کہا۔

”یار قسمت سے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی اعلان کے سامنے رضامندی دے دی۔“

”نہیں۔ نہیں، تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ میں تم سے پوری طرح متفق ہوں۔“ میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم دونوں اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ میں نے اپنے سامان سے پاسپورٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”تم ایسا کرو کہ اپنا اور میرا پاسپورٹ لے کر اعلان کے پاس چلے جاؤ، میں بینک جا کر فارم وغیرہ لے آتا ہوں۔“

خوبصورت بستر لگے ہوئے تھے پھر مقررہ وقت پر
اگران غربی ہمارے پاس پہنچ گیا۔
”آپ لوگ تیار ہو جائیں، بس روانگی کا وقت
آن پہنچا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم پانچ منٹ میں باہر آ جاتے
ہیں۔“

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہم کوٹھی کے بیرونی
گیٹ پر اپنے سامان کے ساتھ موجود تھے۔ ہمارا
سامان ایک شاندار گاڑی میں رکھا گیا اور ہم گاڑی
میں بیٹھ کر ایئر پورٹ روانہ ہو گئے۔

پھر جہاز سے مقررہ مقام تک کا سفر طے ہوا اس
کے بعد زمینی سفر طے کر کے ہم اس علاقے میں پہنچ
گئے جہاں سے ٹھیس کی پہاڑیوں کا سفر کرنا تھا۔
یہاں ہمیں مطلوبہ سامان اور دوسرا سامان حاصل کرنا
تھا جو مشکل ثابت نہ ہوا۔ پھر اس وقت صبح کے چار
تک کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی مگر جب سورج
چڑھا اور دھوپ کی تمازت بڑھی تو جسم سے
چنگاریاں نکلتی محسوس ہونے لگیں، ایسی قیامت کی
گری می کہ خدا کی پناہ، بادِ سموم کے جھوٹے بدن کو
جھلسائے دے رہے تھے۔ ہر طرف ریت کا سمندر
موجزن تھا اور تاحد نگاہ کوئی جھاڑی یا درخت دکھائی
نہیں دیتا تھا جس کے سائے میں پناہ گزین ہو کر کچھ
دیر آرام کر لیا جاتا، ٹھہر کر دم لینے کی کوشش کرتے تو
حالت اور خراب ہو جاتی اور یوں لگتا گویا آسمان سے
آگ کی بارش اور تیز ہو گئی ہو، خدا خدا کر کے شام
ہوئی اور سورج کا غیض و غضب ماند پڑ گیا۔ سورج کی
حکمرانی ختم ہوتے ہی ہماری جان میں جان آئی،
صحرا میں غروب آفتاب کا منظر بڑا دلکش تھا لیکن اس
خستہ حالی میں قدرت کے حسین مناظر سے لطف
اندوز ہونے کی فرصت کے تھی۔ ہم تو کسی مناسب
جگہ پڑاؤ ڈالنے کا سوچ رہے تھے لیکن ریگستان میں
مناسب جگہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چاروں
جانب ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جہاں
تھے وہیں رک گئے، ساربانوں نے اونٹوں سے
سامان اتارا اور خیمے نصب کر دیے گئے۔

ریگستان کا دن جتنا قیامت خیز اور ازیت ناک
ہوتا ہے رات اتنی ہی فرحت بخش اور سحر انگیز ہوتی
ہے۔ اگران غربی اپنے خیمے میں تھا، میں اور ساحر
رات گئے تک باہر میں کرتے رہے۔ بڑا رومان پرور
ماحول تھا، بھرپور چاندنی میں تاحد نگاہ تک پھیلی ہوئی
ریت عجیب منظر پیش کر رہی تھی، بارہ بجے ایک
ساربان نے ہمارے لیے قہوہ بنوا کر بھجوا دیا تھا، قہوہ
پینے کے بعد ہم اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

☆.....☆

ایک ہفتے تک وہ جاں گسل سفر جاری رہا اور
آٹھویں دن ہزار وقتوں اور پریشانیوں کے آخر کار
ہم ٹھیس کی چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ اونچی نیچی
پہاڑیوں کا سلسلہ ہمیں دور ہی سے نظر آ گیا۔ وہ سہ
پہر کا وقت تھا، میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اگر ہم تیزی سے سفر کریں تو
سورج غروب ہونے سے پہلے وہاں تک پہنچ سکتے
ہیں۔“

”نہیں مالک! بظاہر یہ پہاڑیاں بہت قریب
محسوس ہو رہی ہیں لیکن یہ کم از کم ایک دن کی مسافت
پر ہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہا صحرا میں دور کی چیز بھی قریب
دکھائی دیتی ہے، بہتر ہے کہ ہم یہیں پڑاؤ ڈالیں اور
علیٰ الصبح سفر کا آغاز کر کے چٹانوں تک پہنچ
جائیں۔“ ساحر نے کہا۔

ساربانوں نے اونٹ روک کر خیمے لگائے اور
ہم لوگ کھانا وغیرہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔
رات آرام سے گزری، صبح تازہ دم ہو کر اٹھے اور
حسب معمول طلوع آفتاب سے قبل سفر کا آغاز کر
دیا۔ اگران نے فاصلے کے بارے میں درست کہا
تھایوں لگتا تھا جیسے جیسے ہم بڑھ رہے ہیں ٹھیس کی
پہاڑیاں پیچھے کی طرف ہٹتی جا رہی ہیں۔ آخر دو پہر
ڈھلنے کے بعد مختصر قافلہ پہاڑی سلسلے کے نزدیک پہنچ
گیا۔ ہم پڑاؤ ڈالنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا
انتخاب کرنے لگے، اچانک کچھ فاصلے پر ایک غار نظر
آئی جس کا دیوار تاحد نگاہ تھا کہ تین گھڑ سوار برابر چلتے

”اس لیے کہ اگر بالفرض محالہ کوئی سرنگ اہرام کے دروازے پر نکلتی ہے تو سرنگ کھودنے والوں نے ہمارے لیے وہاں کچھ نہ چھوڑا ہوگا۔“ مرزا خاموش ہی گیا ہم ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ معاً ہماری نظر ایک ایسے گڑھے پر پڑی جو بہت گہرا اور خاصا چوڑا تھا اور تازہ کھدا ہوا تھا، مرزا تجسس نظروں سے گڑھے کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

”یہ گڑھا حال ہی میں کھودا گیا ہے، میرے خیال میں اندر اتر کر دیکھا جائے شاید کوئی مطلب کی بات معلوم ہو جائے۔“

”ہم باری باری گڑھے میں اتر گئے۔ نیچے پہنچے تو ایک جانب زمین کے اندر کی طرف سیڑھیاں جاتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم حیرت سے اس زمین دوزرینے کو دیکھنے لگے۔ جس کی سیڑھیاں زمین کھود کر ترتیب دی گئی تھیں۔ ساحر کا اصرار تھا کہ اندر داخل ہو اجائے، میرے ذہن میں بھی تجسس سر اُبھار رہا تھا چنانچہ ہم سیڑھیاں عبور کرنے لگے۔ زینہ طویل نہیں تھا کچھ دیر بعد ہم ایک لمبی اور تاریک سرنگ میں پہنچ گئے، سرنگ کافی کشادہ تھی۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے سرنگ تاریک ہوتی جا رہی تھی اور دم گھٹ رہا تھا، میں نے مرزا سے کہا۔

”واپس چلو پارنٹر! بغیر روشنی کے آگے بڑھنا ہلک ثابت ہو سکتا ہے۔“

مرزا ذرا ضدی قسم کا آدمی تھا مگر اس وقت شاید وہ بھی واپسی کی سوچ رہا تھا اس لیے فوراً آمادہ ہو گیا اور ہم لوگ باہر نکل آئے۔

پڑاؤ پر پہنچے تو ملازموں نے انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ جگہ صاف کر کے بستر لگا دیئے گئے تھے کھانا وغیرہ بھی تیار ہو چکا تھا ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور جلد ہی بستر پر دراز ہو گئے کیونکہ علی الصبح کام کا آغاز کرنا تھا۔

میں نے اور مرزا نے مل کر طے کیا تھا ہم دونوں میں سے ایک ایک رات کی ڈیوٹی دے گا، چنانچہ میں غار سے باہر آ گیا تھا۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی

ہوئے اس کے اندر داخل ہو سکیں۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ بہترین مسکن ثابت ہوا، غار زیادہ طویل نہیں تھا۔ اندر سے پندرہ فٹ لمبا ہو گا اور اس طرح وہ کھوکھلی پہاڑی ایک کمرے کی سی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ہم نے تمام سامان اندر پہنچایا اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے غار کے دہانے پر ایک قنات تان دی پھر اندر کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ کچھ لوگ پہلے بھی اسی جگہ قیام پذیر ہوتے رہے ہیں کیونکہ سگریٹ کے پکٹ، خوارک کے خالی ڈبے اور اس قسم کی دوسری ناکارہ چیزیں ادھر بکھری ہوئی تھیں میں نے سوچا کہ کیوں نہ باہر کا جائزہ لیا جائے چونکہ سورج غروب ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا چنانچہ ہم نے سارے بانوں سے کہا۔

”ہم آس پاس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ تم لوگ سامان وغیرہ لگاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہر طرف غار اور گڑھے کھدے ہوئے نظر آ رہے تھے اور یقیناً ماہرین آثار قدیمہ اور ہم جوڈن کی کوششوں کا نتیجہ جو جگہ جگہ کھدائی کر کے ناکام ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ ساحر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”ان گڑھوں اور غاروں سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے۔“

”مجھے امید نہیں کیونکہ بیشتر گڑھے ایسے ہیں جنہیں معمولی گہرائی تک کھود کر ناکائی کی صورت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔“

”میں پارنٹر ایسی سرنگیں بھی نظر آ رہی ہیں جو پہاڑیوں کے اندر کافی گہرائی تک چلی گئی ہیں اور ہو سکتا ہے ان ہی میں سے کوئی سرنگ کسی مقبرے کے دروازے تک پہنچتی ہو۔“

”اور اس مقبرے میں ایک غار ہمارا مختصر ہو جس میں کسی مصری شہزادی کی حنوط شدہ مٹی بھی ہو جسے ہم افران غری کی خدمت میں پیش کر سکیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کیوں۔ تمہیں اس امر پر تعجب کیوں ہے؟“

دونوں ایک بار پھر باہر نکل آئے۔ باہر کے ماحول پر سکوت، سناٹا چھایا ہوا تھا، میں نے کہا۔
 ”اس وقت تم نے کہا تھا کہ تمہاری رائے محفوظ ہے کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ یہ سب کیا تھا؟“
 ”کچھ نہیں، ایک صوفی دھوکہ۔“
 ”کیا مطلب؟“

”بھئی آج کل سائنس کا دور ہے، ہر طرف بے شمار ایجادات ہو رہی ہیں، کہیں مصنوعی سیارے بنائے جا رہے ہیں، کہیں کمپیوٹر، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی مصنوعی سیارے کی آواز تھی جو کسی فنی خرابی کے باعث ادھر آگئی۔“
 ”ہو بھی سکتا ہے۔“

”ماحول کی پراسراریت تمہارے اوپر بھی اثر انداز ہو رہی ہے میرے دوست، بہر حال میں نے تمہیں اپنی رائے بتادی ہے۔“
 ”اچھا میرے سائنسدان، چل تیری بات مانے لیتے ہیں۔“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی ایک بار پھر شور کی آوازیں کے ساتھ ہی ایک جگہ سے شعلے بلند ہونے لگے، عجیب و غریب انداز تھا ان شعلوں کا، ہم لوگ خاصے متاثر ہو گئے تھے۔ پھر ایک اور عجیب منظر دیکھا، ان شعلوں کے درمیان فٹ بال کے برابر کوئی گولی چیز فضا میں معلق ہے، دوری کے سبب اس کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکتا تاہم یہ ضرور دیکھ رہا تھا کہ شعلے درحقیقت اس گولی سے شے میں سے نکل رہے تھے۔ گولی چیز بار بار فضا میں بلند ہوتی اور واپس زمین تک جا پہنچتی۔ ساحر نے کہا۔

”پارٹنر میں اب بھی اپنے پہلے نظریے پر اٹل ہوں۔ میرے خیال میں یہ ابتدائی مراحل کا کوئی تجرباتی سیارہ ہے اور مصر جوہری توانائی کے استعمال میں ابھی نوآموز ہے، چنانچہ انٹری پن کے سبب کل پرزوں میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔“

”ممکن ہے تمہارا قیاس درست ہو۔“ میں نے بدستور شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر یہ مصنوعی سیارہ ہے اور خراب ہو گیا ہے تو ذرا سی دیر

گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے کہ یکایک ایسی ہولناک چیخ اور لرزہ خیز چیخ فضا میں گونجی کہ چٹانیں تک لرز اٹھیں، ایسی ہولناک آوازیں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ اسے کسی صورت میں انسانی آواز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ چیخ کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دو فلک شکاف چیخیں اور ابھریں، وہ بے شک انسانی آوازیں تھیں۔ دراصل دونوں ملازم اس چیخ کی آواز سن کر خود بھی چیخ پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں مارے خوف کے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں اور وہ پتے کی طرح لرز رہے تھے۔ مرزا بھی حیران اور قدرے خوفزدہ تھا، ہرچند کہ وہ دلیر آدمی تھا لیکن چیخ اتنی بھیانک تھی کہ اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جائے، مرزا تیزی سے میرے قریب آیا اور بولا۔

”کیا ہوا کیسی ہولناک چیخ تھی یہ؟“
 ”میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آیا کہ یہ کیسی چیخ تھی اور اس کا مخرج کہاں ہوگا۔“

”یقیناً یہ بدروحوں کی چیخ تھی، ہم نے سن رکھا ہے کہ ان پہاڑوں میں ایسی ہی بدروحیں گھومتی پھرتی ہیں۔“ ایک ملازم نے کہا۔

”تم لوگ فکر مت کرو، ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، تم لوگ آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔“ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا پھر میں مرزا کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔
 ”کیا کہتے ہو تم کیسی چیخ تھی یہ؟“

”میں اس پر اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں اور بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔“ میں خاموش ہو گیا تھا۔ ملازمین مقامی ہی تھے، خوف سے وہ ایک جگہ دبکے رہے تھے۔ بہر حال ماحول پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ہم لوگ اندر آ گئے تھے۔ پھر میں اور ساحر جاگتے ہی رہے تھے جبکہ دونوں ساربان اپنی اپنی جگہ لیٹ گئے تھے لیکن ان کی بے چینی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں بے حد خوفزدہ ہیں اور ان کو بھی اس خوف کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔ مرزا نے کہا۔

”چلو پھر باہر چلتے ہیں۔“ مرزا نے کہا اور ہم

کھوپڑی راکٹ کی طرح فضا میں پرواز کرتی پھرے اور اس سے آگ کے شعلے نکلیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سیارے کی شکل انسانی کھوپڑی جیسی طرز کی بنائی ہو۔

میری بات کا یقین کر دو وہ سو فیصد کھوپڑی تھی، اس کے دانت، ناک اور آنکھوں کے سوراخ میں نے واضح طور پر دیکھے ہیں۔ مرزا کسی سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا

یقین نہیں آتا یہ سائنس کا دور ہے جو بھی تمہاری بات سنے گا ہنسے گا۔

دیکھو مرزا، سائنس ابھی کائنات کے ایک ہزارویں حصے کا بھی احاطہ نہیں کر پائی ہے، یہ کائنات ریت میں ڈوبی ہوئی ہے، ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ یہاں کیا ممکن ہے اور کیا نہیں، آج بھی بے شمار اسرار و رموز ایسے ہیں جن کی سائنس کے پاس کوئی توجیہ نہیں ہے، سائنس دان وہاں بے بس نظر آتے ہیں اور ان کا علم ناکافی ہے۔

مرزا ساحر قائل سا ہو کر خاموش ہو گیا، گو ہم گفتگو میں مصروف تھے لیکن ہمارے کان اس آواز پر لگے ہوئے تھے، مگر اس کے بعد وہ آواز سنائی نہیں دی تھی اور بقیہ رات خیر و خوبی سے گزر گئی تھی۔ حتیٰ کہ دن نکل آیا، ساربان ساری رات خوف سے بیٹھے کانپتے رہے تھے۔ آخر کار صبح ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ اس خوفناک مقام پر ایک لمحہ بھی رکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ ایسے دہشت زدہ تھے کہ انہیں میری کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ میں نے انہیں لالچ بھی دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے انہیں لالچ بھی کوئی ترغیب نہ دے سکا۔ دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر جب میں نے بہت اصرار کیا، بھاری لالچ دیا اور تحفظ کا یقین دلایا تو ان کا ارادہ کچھ متزلزل ہوا، وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے پھر معمر ساربان بولا۔

مالک! ہم اس ہولناک مقام پر قیام نہیں کر سکتے، خواہ آپ ہمیں کتنا ہی بڑا لالچ دیں، ہمیں آپ

میں نہیں کہیں مگر کرنا ہوا جائے گا اور اس کی تباہی کے بعد جو تباہ کاری اثرات پھیلیں گے ان سے ہماری زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

ابھی مرزا کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ دفعتاً وہ شعلہ فشاں گولی چیز بالکل راکٹ کی طرح پرواز کر کے ہماری طرف بڑھی، ہمارا اور میانی فاصلہ کافی تھا لیکن لمحے بھر میں شعلے ہمارے قریب پہنچ گئے، ہم پوری طرح شعلوں کی زد میں تھے اور اس گولی چیز کا انداز ایسا تھا گویا ہم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تیزی سے ساحر کو ایک جانب دھکا دیا اور خود دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ شعلوں میں لپٹی ہوئی وہ چیز ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر دور تک چلی گئی تھی۔ اگر وہ لمحہ ضائع ہو جاتا تو ہم جل کر اڑھ ہو گئے ہوتے۔

بھاگو.....! مرزا نے کہا اور ہم اُنھ کر اپنی کمین گاہ کی طرف بھاگے۔

میں نے ایسا عجیب منظر آج تک نہیں دیکھا۔

مرزا سائنس بحال کرتے ہوئے بولا۔

عجیب تر کہو اور اب تمہارا نظریہ غلط ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چھوٹا سا تجرباتی مصنوعی سیارہ ہے۔

پھر کیا ہے؟

تم نے نہیں دیکھا کہ وہ کیا شے تھی؟

نہیں یا تم نے اتنی زور سے دھکا دیا تھا کہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا، بہر حال بتاؤ وہ کیا چیز تھی؟

وہ ایک کھوپڑی تھی۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

کھوپڑی۔۔۔؟

ہاں انسانی کھوپڑی۔

تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ مرزا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ انسانی کھوپڑی تھی اور آگ کے شعلے اسی سے بلند ہو رہے تھے۔

تمہیں مغالطہ ہوا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ

گئے ہوں گے۔
 "تمہارا مطلب ہے ہمیں اپنے طور پر کھدائی
 کرنی چاہیے۔" میں نے پوچھا۔
 "یقیناً۔"

"لیکن اس کام کے لیے بہت سے مزدوروں کی
 ضرورت ہوگی، ہم دو آدمی سینکڑوں فٹ کی گہرائی
 کیسے کر سکتے ہیں اور پھر اس بات کا تعین کون کرے گا
 کہ ہمیں کس مقام پر کھدائی کرنا چاہیے جہاں سے کوئی
 مقبرہ برآمد ہو جبکہ اس کا امکان بھی ہے کہ سینکڑوں
 فٹ کھدائی کے بعد بھی نتیجے میں کچھ حاصل نہ ہو۔"

"پھر کیا ہونا چاہیے؟" ساحر نے پوچھا۔
 "سوچ سمجھ کر کام لیا جائے، پہلے جامع منصوبہ
 بنے گا اس کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔" میں
 نے کہا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اس گڑھے
 کے نزدیک پہنچ گئے جہاں دو روز قبل داخل ہوئے
 تھے اور جس کے اندر ایک کشادہ سرنگ نظر آتی تھی،
 اچانک مجھے خیال آیا کہ گزشتہ شب پر اسرار شعلوں کا
 مرکز بھی مقام تھا، ساحر نے بھی میرے نظریے سے
 اتفاق کیا اور ہم تیزی سے گڑھے کی طرف بڑھنے
 لگے۔ گڑھ حانیوب دہلی کی طرح وسیع تھا مگر زیادہ گہرا
 نہیں تھا، میں نے گڑھے کے اندر نظر ڈالی اور چونک
 پڑا۔ سرنگ کے دہانے کے قریب کہنی سے کٹا ہوا
 ہاتھ بڑا تھا جو نہایت بد وضع اور کریہہ نظر تھا۔ اس
 کی انگلیاں تکی اور مڑی تھری اور کسی حد تک استخوانی
 تھیں جن کے ناخن لمبے اور بہت تیز دکھائی دیتے
 تھے، کلائی پر سسڑی مکنی بد وضع کھال موجود تھی، لیکن وہ
 ہاتھ صدیوں پرانا معلوم ہوتا تھا، میں نے ساحر کی
 طرف دیکھا وہ بھی متحیر نظروں سے اس مکروہ ہاتھ کو
 دیکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔

"یار اس روز یہ ہاتھ اس گڑھے میں موجود نہیں
 تھا۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس دن یہ
 ہاتھ یہاں نہیں تھا، بہتر یہ ہے کہ اس گڑھے میں اتر
 کر ہاتھ کی ماہیت و اصلیت معلوم کی جائے۔ ہو سکتا
 ہے یہ سوکھا ہوا ہاتھ ہماری کامیابی کی راہ میں محاذ

کی پریشانی کا احساس ہے، چنانچہ اس سلسلے میں یہ ہو
 سکتا ہے کہ یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک
 بستی ہے، آپ یہاں سے منتقل ہو کر اس بستی کے
 قریب پڑاؤ ڈالیں اور وہیں سے اپنی مہم جاری
 رکھیں، اس صورت میں ہم آپ کا ساتھ دے سکتے
 ہیں ورنہ ہمیں رخصت کی اجازت دی جائے۔"

میں نے ساحر سے مشورہ کیا اور ساربانوں کی
 بات تسلیم کر لی مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔
 ہمارے لیے تکلیف وہ امر یہی تھا کہ اصل مقام سے
 کافی دور چلے جائیں گے۔ ساربان ہماری رضا
 مندی سے خوش ہو گئے انہوں نے جلدی جلدی
 سامان سمیٹا اور ہم لوگ قریبی بستی کی طرف روانہ ہو
 گئے۔ ساربانوں کے بیان کے مطابق ہمیں ڈیڑھ
 میل کے سفر کے بعد بستی کی مسجد کے مینار نظر آنے
 لگے تھے، ہم نے بستی سے کچھ فاصلے پر ایک پوشیدہ سی
 جگہ ڈیرے ڈال دیئے۔ ضروری امور سے منت کر ہم
 ساربانوں کی معیت میں بستی پہنچے تھے۔ شورک نای
 بستی ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل ایک صاف ستھری بستی
 تھی۔ لوگ طنسار اور مہمان نواز تھے۔ بستی کے قلب
 میں چند دکانوں اور ایک قہوہ خانے پر مشتمل بازار
 تھا۔

ہم نے قہوہ پیا اور بستی کا چکر لگانے کے بعد اپنے
 ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ اس دن ہم نے آرام کیا اور
 اگلے روز علی الصبح ضروری سامان کے ساتھ پہاڑیوں
 کی جانب روانہ ہو گئے۔ گزشتہ روز ہم نے سرسری
 طور پر جائزہ لیا تھا لیکن آج ایک ایک جگہ کو بغور
 دیکھا، تاہم کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی، سوائے اس
 کے کہ ہر طرف گڑھے اور سرنگوں کے دہانے دکھائے
 دے رہے تھے۔ جو یقیناً فراہمین کے مقبروں کی
 تلاش میں کھودے گئے تھے، ساحران پر تبصرہ کرتے
 ہوئے کہنے لگا۔

"ان گڑھوں اور سرنگوں میں داخل ہونا بے سود
 ہوگا کیونکہ بقول تمہارے جن لوگوں نے کھدائی کی
 ہوگی وہ یا تو ناکام و نامراد واپس لوٹے ہوں گے یا
 کامیابی کی صورت میں ایک ایک جگہ سمیٹ کر لے

ثابت ہو۔“
 مرزا نے گردن ہلائی اور ہم گڑھے میں اتر گئے،
 میں نے ریت پر پڑا ہوا ہاتھ اٹھایا، جیب سے رومال
 نکال کر اس کی گرد جھاڑی اور بغور جائزہ لینے لگا،
 مرزا کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں، اس نے
 ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاتھ سو فیصد انسانی ہے لیکن اس کی انگلیاں
 اور ناخن کتنے خوفناک ہیں۔“
 ”ہو سکتا ہے اس دن یہ کسی ریت میں دبا ہوا ہو،
 ہوا کے تھپڑوں کی وجہ سے یہ ریت اس کے اوپر سے
 بہت گئی ہو۔“ میں نے کہا، مرزا کی آنکھیں چمکنے لگیں
 اس نے کہا۔
 ”میں اس ہاتھ کی حیثیت جان گیا ہوں
 دوست، یقیناً کسی مہم کا ہاتھ ہے۔“
 ”لیکن یہ کیسے ممکن ہے، فراعین تو اپنے مردوں
 کی حفاظت کے لیے انہیں مسالا لگا کر رکھتے تھے تاکہ
 وہ خراب نہ ہوں۔“
 ”لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سرنگ میں ایک
 سے زیادہ میاں موجود ہوں اور کوئی جانور اس ہاتھ کو
 منہ میں دبا کر یہاں تک لے آیا ہو۔“
 میں اس نکتے پر غور کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مرزا
 نے بڑے پتے کی بات کہی تھی اور ایسا ہونا عین ممکن
 تھا، میں نے پوچھا۔
 ”تمہارا ارادہ سرنگ میں داخل ہو کر می کو تلاش
 کرنے کا ہے۔“
 ”بالکل میرا نظریہ بالکل درست ہے اور اگر
 اس وقت ہم نے اس پر عمل کرنے میں پس و پیش سے
 کام لیا تو یہ نہ ہو کہ ہماری ساری عمر پہاڑیوں کی
 خاک چھانتے ہوئے گزر جائے اور کچھ حاصل نہ
 ہو۔“
 ”مجھے سرنگ کے اندر داخل ہونے میں کوئی
 اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے تھیلوں میں خشک خوراک
 اور پانی سمیت ضرورت کا ہر سامان موجود ہے،
 کامیابی نصیب ہوئی تو قسمت در نہ واپس آجائیں
 گے۔“

ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہم سرنگ میں داخل
 ہو گئے۔ انسانی ہاتھ میں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا
 تھا لیکن جیب چونکہ اس کی نسبت چھوٹی تھی اس لیے
 اس کا خوفناک پنچہ باہر آ رہا تھا۔ سرنگ خوب کشادہ
 تھی اور ہم کسی دشواری کے بغیر آگے بڑھ رہے تھے
 مگر کچھ دیر بعد سورج کی روشنی نہ رہی اور سرنگ میں
 تاریکی پھیل گئی اور ہمیں نارنجی روشن کرنا پڑی، کچھ
 اور آگے بڑھے تو دم گھٹنے لگا لیکن کچھ لمحوں بعد یہ
 کیفیت زائل ہو گئی۔ شاید کسی طرف سے ہوا کی
 معقول آمد کا انتظام تھا۔ کچھ دور چل کر اچانک مجھے
 کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے نارنجی کی روشنی
 ادھر ادھر چمکنی تو معلوم ہوا کہ تازہ کھدی ہوئی سرنگ
 ختم ہو گئی ہے اور ہم ایسے جھے میں چل رہے ہیں جو
 پہاڑوں کو کھوکھلا کر کے بنایا گیا ہے۔ یہ امر ہمارے
 لیے باعث اطمینان تھا کیونکہ قدیم سرنگ کی دریافت
 سے کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے تھے اور ہم کسی
 بھی وقت اہرام مصر کے دروازے پر پہنچ سکتے تھے۔
 قدیم سرنگ شیطان کی آنت ثابت ہوئی، ہم بہت دیر
 چلتے رہے مگر منزل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، یوں
 لگتا تھا جیسے طویل ترین سرنگ بھی ختم نہیں ہوگی اور
 زندگی ختم ہو جائے گی۔ یکا یک ہم دونوں چونک
 پڑے اور دونوں کے منہ سے حیرت بھری چیخ نکلی۔
 ساحر اس کامیابی پر خوشی سے رقص کرنے لگا، سرنگ
 دراصل ختم ہو گئی تھی اور سامنے کسی فرعون کے مقبرے
 کا بلند دبالا بھانک نظر آ رہا تھا جس کے دیوہیکل
 کواڑوں پر دلکش نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بھانک
 کے دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے لیکن کوئی کنڈایا
 قفل نظر نہیں آ رہا تھا۔

”بھانک کھولنے اور بند کرنے کا کوئی خفیہ سسٹم
 ہوگا۔“ ساحر نے خیال کیا۔
 ”ہو سکتا ہے دونوں پٹ محض بھڑے ہوئے
 ہوں، لیکن یہ بات طے ہے کہ ہم نصف کامیابی
 حاصل کر چکے ہیں۔“
 ”سو فیصد کہو، سو فیصد۔“ وہ اکڑ کر بولا۔“ اور
 سرنگ میں داخل ہونے کی تجویز میری ہی تو تھی۔“ یہ

”مجھے سرنگ کے اندر داخل ہونے میں کوئی
 اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے تھیلوں میں خشک خوراک
 اور پانی سمیت ضرورت کا ہر سامان موجود ہے،
 کامیابی نصیب ہوئی تو قسمت در نہ واپس آجائیں
 گے۔“

کہہ کر وہ پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن نزدیک پہنچتے ہی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا، میں نے نارنج کی روشنی میں آگے بڑھ کر دیکھا، پھاٹک کی دہلیز پر ایک عجیب انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا، عجیب اس لیے کہ اس کے جسم پر جدید طرز کا لباس تھا، بس ہاتھوں اور چہرے سے اس کے پنجر ہونے کا پتا چلتا تھا، مرزا حیرانی سے بولا۔

"عجیب معاملہ ہے یہاں ڈھانچے بھی لباس پہنتے ہیں۔"

"یہ ہماری طرح کسی مقبرے کی تلاش میں یہاں آیا ہوگا اور کسی حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ میرے خیال میں اسے فوت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزر رہی وجہ ہے کہ جسم گل سرخ ختم ہو گیا اور لباس چونکہ مصنوعی ریشے کا ہے اس لیے لباس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پچھلے غریب نے کن حالات میں دم توڑا ہوگا۔" میں نے ڈھانچے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"دوست یہاں ہم ڈھانچوں پر تحقیق کرنے کے لیے آئے ہیں کیا؟"

"نہیں تو بالکل نہیں۔"

"تو پھر کیا خیال ہے آگے بڑھیں۔"

"بالکل آگے چلتے رہو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر پھاٹک کے پاس پہنچ گیا، پھاٹک کو زور سے دھکا دیا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ واقعی اس کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ یہ پٹ کھلتے چلتے گئے اور ہم اندر داخل ہو گئے تھے۔

اب ہمارے سامنے ایک وسیع ہال تھا جس کی چھت اور دیواریں پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں اور اس میں جگہ جگہ ستون نظر آ رہے تھے لیکن اس وسیع ہال میں کہیں بھی کوئی چیز رکھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا اور ویرانی تھی، گوریج فرسا ویرانی نے ہم پر کسی قدر وحشت طاری کر دی تھی، بہر کیف ہم اندر داخل ہو گئے اور نارنج کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ ہال کی بلند بالائی دیواریں میں چاروں

طرف محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی دوسری طرف کشادہ اور طویل راہداریاں تھیں، ہم محراب سے گزر کر ایک راہداری میں آگے بڑھے جس کے دونوں جانب بے شمار حجرے بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازے بند تھے لیکن حسب سابق کوئی قفل وغیرہ نظر نہیں آتا تھا۔

"ایک دروازے کو کھول کر دیکھنا چاہیے۔" ساحر نے مشورہ دیا۔ "ہو سکتا ہے کوئی تابوت یا اس دور کی کوئی اور شے دستیاب ہو جائے۔"

میں نے ایک دروازے پر ہاتھ رکھا اور وہ با آسانی کھل گیا۔ اندر بھیانک تاریکی کا راج تھا۔ میں نے نارنج کی روشنی ڈالی، خالی کمرہ بھائی بھائی میں کر رہا تھا۔ دوسرے حجرے بھی اسی طرح خالی تھے جیسے کسی نے جھاڑو دے کر خوب اچھی طرح صفائی کی ہو، ہاں اگر کچھ تھا تو وہ وحشت ناک سناٹا اور ویرانی تھی جو روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"شاید وہ لوگ سب کچھ نکال کر لے گئے۔"

"کون لوگ؟" ساحر نے چونک کر پوچھا۔

"وہی جو کھدائی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہوں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کیا واپس چلیں؟"

"جب یہاں تک آئے ہیں تو کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔"

ہم آگے چل دیے اور بہت دیر تک چلتے رہے، سرنگ بار ایدری زمین کے اندر ہی اندر نجانے کہاں تک چلی گئی تھی اور سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے تھی۔ مرزا کہنے لگا۔

"قدیم مصر کے معماروں اور فن تعمیر کے ماہروں کے فن کی داد دینا پڑتی ہے کہ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان کس مہارت سے یہ راہداریاں اور مقبرے وغیرہ تعمیر کیے گئے ہیں۔"

میں نے مرزا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ چلتے چلتے ٹائلیں بدل ہو گئی تھیں اور منزل کا کوئی تعین

کہ واپسی کیسے اور کس راستے سے ہو، پتا ہی نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں اور واپسی کے لیے کس طرف کا رخ اختیار کرنا چاہیے۔ ہر مقام شناسا اور ہر جگہ جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی، سب کچھ ہی ایک جیسا لگ رہا تھا، پھر اچانک ایک روشنی سی نظر آئی جیسے کوئی شمع روشن ہو اور ایک آواز ابھری۔
”دوستو!“

”ارے یہ کیا، یہ تو اعران غریبی کی آواز ہے۔“
”ٹھیک پہچانا تم نے، اس روشنی کے پیچھے پیچھے چلتے رہو، ہمیں تمہاری منزل ضرور ملے گی۔“

میں اور ساحر اس آواز کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے، ہم نے روشنی کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے ہم کافی دور نکل آئے تھے، اس کے بعد اعران غریبی کی کوئی آواز نہیں ابھری تھی۔ بہر حال ہم چلتے رہے، پھر اچانک ہی ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی۔ اچانک ہی ایک آواز سنائی دی یہ ہو بہو وہی آواز تھی جو ہمیں چٹانوں کے درمیان سنائی دی تھی اور پھر ایک کھوپڑی جو شعلوں میں گھری ہوئی تھی اور جس نے ہم پر حملہ بھی کیا تھا، وہی کھوپڑی اس وقت ہمارے آگے پیچھے گھوم رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہو، اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے کوٹ میں رکھا ہوا ہاتھ متحرک ہوا ہوا اور پھر اس ہاتھ نے ایک زوردار تھپڑ کھوپڑی پر رسید کیا تھا۔ وہ کھوپڑی دور جا گری تھی، پھر ادبھی ہوئی اور ہمارے آگے ایک جگہ گم ہو گئی۔ ہم اور تیز چلنے لگے اور جلد ہی یہ راستہ دوسری جانب گھوم گیا، لیکن جوں ہی ہم مڑے ایک خوفناک اور حیرت انگیز منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا، ہم ایک پھانک نما دروازہ دیکھ رہے تھے جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے دوسری جانب ایک وسیع حجرہ تھا اور حجرے کے وسط میں ایک سیاہ تابوت رکھا تھا، کھوپڑی بھی اندر موجود تھی اور انتہائی غیض و غضب کے عالم میں معلوم ہوتی تھی، وہ فضا میں پرواز کرتی ہوئی تابوت کے چکر کاٹ رہی تھی اور اس کے قریب پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی جبکہ کئی ہاتھ اسے

نہیں تھا۔ دفعتاً ایک موڑ پر راہداری ختم ہو گئی اور اب ہماری نظروں کے سامنے ایک منقش دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں اور مرزا اندر داخل ہو گئے۔ دراصل کئی گھنٹے اس اجاڑ اور ویران مقام پر گھومتے رہنے کی وجہ سے خوف و دہشت کے اثرات زائل ہوتے جا رہے تھے یہ جگہ پہلے سے مختلف تھی اور جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ہم اصل مقبرے میں پہنچ گئے ہیں اور منزل زیادہ دور نہیں ہے ہم چلتے رہے چلتے رہے اور بے شمار ایوانوں اور غلام گروہوں سے گزرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی ہمیں سرنگ میں داخل ہوئے پورے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے اور بلاشبہ اس دوران ہم نے میلوں کا سفر طے کر لیا تھا، ہاتھ پیر جواب دے گئے تھے اور تھکن کا شدید احساس ہو رہا تھا، کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ اہرام زمین کے اندر کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم خوف زدہ تو نہیں تھے لیکن یہ دیکھ کر جسم میں سنسنی دوڑ جاتی تھی کہ جگہ جگہ انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے ان کے سامان سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہماری طرح مقبروں اور قدیم نادر اشیاء کی تلاش میں یہاں تک پہنچے اور کئی ناگہانی آفت کا شکار ہو گئے۔

ہمیں فکر میں مبتلا کر دینے والی یہ بات تھی کہ ان کی موت کا کیا سبب رہا ہوگا کہ اتنی آسانی سے خود کو اجل کے حوالے کر دیا اور مقبرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دو ڈھانچے تو تازہ معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی ہڈیوں پر کئی جگہ گوشت چپکا ہوا تھا اور ان سے لعفن بھی پھوٹ رہا تھا۔ مقبرے کے اندر بھٹکتے ہوئے مزید دو گھنٹے گزر گئے۔ اب ہم میں چلنے کی سکت نہیں رہی تھی مگر جیسے تیسے آگے بڑھ رہے تھے، اچانک ہمیں ایک خوفناک حقیقت کا علم ہوا اور زمین گویا پیروں تلے ہلکتی ہوئی محسوس ہونے لگی، واقعہ یہ تھا کہ ہم گھوم پھر کر اسی مقام پر واپس آ پہنچے تھے جہاں سے چلے تھے، بہر حال مایوس ہو کر بیٹھ گئے، دونوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کی آخری سانس تک حوصلہ نہیں ہاریں گے اور جدوجہد جاری رکھیں گے مگر سوال یہ تھا

چل کر دیکھتے ہیں۔“

مفتش دروازے سے گزر کر ہم لوگ حجرے میں داخل ہو گئے، جہاں تابوت کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں تھی، تابوت بالکل سیاہ اور بہت لمبا تھا اور اس کے کندھے میں ایک وزنی اور مضبوط قفل لٹک رہا تھا میں کئی سنت تک تابوت کا جائزہ لیتا رہا میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مرزا بول پڑا۔

”دوست ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں بلاشبہ یہ تابوت اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اور تم دیکھو کتنی عجیب بات ہے جب ہم تنگ کر مایوس ہو گئے تھے تو ہماری رہنمائی کی گئی اور اب ہم اس کے پاس موجود ہیں۔“

”مگر سوال یہ ہے کہ ہم اس تابوت کو باہر کیسے لے جائیں گے۔؟“

”تم تو میری ہمت بڑھا رہے تھے اب خود مایوس ہو گئے ہو۔“

اچانک میں چونک پڑا اور حقیقت حال کچھ واضح ہونے لگی، ہم سے کچھ قدم کے فاصلے پر وہی شمع روشن ہو گئی تھی جو اس ہنگامے میں کہیں گم ہو گئی تھی، اس شمع کو دیکھ کر ہم دونوں کی ہمت بندھی اور پھر اچانک ہی ایک آواز ابھری۔

”دوستو! آپ بالکل صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں۔ فکر نہ کریں یہ شمع اور پراسرار ہاتھ آپ کی بھرپور مدد کریں گے۔“

ہم دونوں بڑی طرح چونک پڑے تھے، میں نے مرزا سے کہا۔

”مرزا میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہمیں ہمت کرنی چاہیے۔“ اور پھر ہم نے اس تابوت کو اٹھانے کی کوشش کی، خاصا وزنی تابوت تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کہیں سے اچانک ہی کچھ ہاتھ نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے تابوت اٹھانے میں ہماری بھرپور مدد شروع کر دی۔ اس سارے ہنگامے میں کافی وقت صرف ہو چکا تھا۔ بہر حال ہم تابوت اٹھائے چلنے لگے، شمع ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ پھر اس وقت ہماری مسرت کی

تابوت تک پہنچے سے روک رہے تھے۔ یہ عجیب و غریب پراسرار ہاتھ کہیں تک تھے اور مڑی مڑی انگلیوں کے نوکیلے ناخنوں سے کھوپڑی کو نوچ رہے تھے۔ حیران کن امر یہ تھا کہ آگ کے شعلے پراسرار ہاتھوں پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے جبکہ ہم خاصی دور ہوتے ہوئے بھی شعلوں کی تپش محسوس کر رہے تھے۔

کھوپڑی بہت دیر تک تابوت کے گرد چکراتی رہی لیکن اس کے قریب پہنچے میں کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ وہ تمام ہاتھ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے، کھوپڑی ناکام سی ہو کر باہر نکل آئی، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ دیکھ سکتی تھی یا نہیں لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے خوفناک سوراخ ہم پر مرکوز تھے۔ کھوپڑی نے ایک بار پھر ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت کئی ہاتھ آگے بڑھے اور انہوں نے کھوپڑی اور ہماری درمیان ایک دیواری جالی۔ کھوپڑی بہت مشتعل نظر آرہی تھی پھر اس نے بے بس ہو کر راہ فرار اختیار کر لی اور جس طرف سے آئی تھی اسی جانب چلتی چنگھاڑتی ہوئی چلی گئی، ہاتھ اب بھی اس کے تعاقب میں تھے۔

کھوپڑی کے جاتے ہی مقبرے میں ہولناک تاریکی پھیل گئی، ہماری ٹمٹماتی ہوئی نارنج کی روشنی بالکل ماند پڑ گئی تھی اور وہی قبر کا سناٹا چھا گیا تھا میں اور مرزا حیران و ششدر کھڑے تھے مرزا کی پر تحیر آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ خواب تھا کہ فریب نظر؟“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس ظلم خانے میں جو نہ پیش آئے وہ کم ہے۔“ یہ کہہ کر نارنج کی مدہم روشنی کا رخ میں نے حجرے کی جانب کر دیا وہاں تابوت اسی جگہ اور اسی حالت میں موجود تھا، مرزا کہنے لگا۔

”دوست..... میرے نظریے کے مطابق اس تابوت میں کوئی کمی موجود ہے ہزاروں برس قدیم کسی فرعون کی کمی۔“

”شاید.....“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا، بہر طور قریب

”اے ہم ہزاروں برس قدیم ایک مقبرے سے نکال کر لائے ہیں، جیسا کہ کچھ دیر قبل تمہیں بتایا ہے خیر تم جلدی سے بڑا ہتھوڑا لے کر آ جاؤ، اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔“

ساربان ہتھوڑا لے آیا، مرزا بہت بے صبری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور جلد از جلد تابوت کو کھول لینا چاہتا تھا، اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پوری قوت سے تابوت کے قفل پر ہتھوڑا برسانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں مرزا اپنے سے شراپور ہو گیا اور ہانپنے لگا لیکن قدیم وضع کا قفل کس سے مس نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے ہتھوڑا سنبھالا اور قفل پر ضربیں لگانے لگا لیکن میں بھی تھک کر چور ہو گیا دونوں ساربان باری باری زور آزمائی کر چکے مگر قفل جوں کا توں تھا۔ مرزا کہنے لگا۔

”کیوں نہ اس تالے کو بارودی مواد سے ٹورا جائے۔“ میں نے اس تجویز کو پسند کیا تھا اور پھر یہی کیا گیا، بارودی مواد سے قفل ٹوٹنے لگا۔ جبکہ اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ تابوت کو کوئی نقصان نہ پہنچے چنانچہ تابوت جب توقع صحیح سلامت رہا۔ مرزا میں اب تاب کہاں تھی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ تابوت کھلتے ہی یوں لگا جیسے اندر سے چاند طلوع ہو رہا ہو، تابوت کے اندر ایک نہایت خوبصورت ممی موجود تھی جس سے مخصوص ادویات کی عجیب خوشبو نکل رہی تھی۔ مرزا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، وہ پر مسرت لہجے میں بولا۔

”دوست خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم اعران غربی کے لیے ممی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“ میں نے مرزا کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، میں تو ممی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، میں نے بیسویں صدی کی عورت کو اتنا خوب صورت نہیں پایا تھا وہ بلا کی حسین تھی اور شاید اسے دور کی خوبصورت ترین عورت رہی ہوگی، مجھے ایسا لگ رہا تھا گویا وہ مرد نہیں ہے بلکہ محو خواب ہے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولے گی اور قیامت خیر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوگی۔

انتہائے رسی جب صرف آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم مقبرے کے بڑے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ وہی پھانک تھا جہاں سے بھول بھلیوں کا آغاز ہوا تھا، پھانک سے نکل کر ہم سرنگ میں داخل ہوئے اور کچھ دیر بعد باہر سے آتی ہوئی سورج کی روشنی دکھائی دی، خوشی سے ہم دونوں کی چیخیں نکل گئیں اس منحوس مقبرے سے ہم بخیر و خوبی نہ صرف باہر نکل آئے تھے بلکہ کامیاب و کامران لوٹے تھے، ہمارے پاس تابوت تھا جس میں مطلوبہ ممی موجود تھی۔

کافی وقت کے بعد تازہ ہوا میسر آئی تھی، تابوت رکھ کر ہم زمین پر لمبے لمبے لیٹ گئے اور پیچھڑوں میں تازہ ہوا بھرنے لگے اور جب خوب سستا لیے تو تابوت اٹھایا اور پڑاؤ کی طرف چل پڑے، مرزانے کہا۔

”ارے یہ کیا، وہ ہاتھ کہاں گئے؟“ میں بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن ہاتھوں کا کبھی نام و نشان تک نہ تھا، بہر حال تابوت لے کر ہم پڑاؤ تک پہنچ گئے، ساربان بڑی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہماری طرف لپکے اور ان میں سے ایک کہنے لگا۔

”آقا! ہم آپ کے لیے پریشان ہو گئے تھے آپ کو گمے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا۔“ ہم نے انہیں مختصر واقعات بتائے اور پوچھا ”تم نے کسی کو خبر تو نہیں کی کہ ہم لوگ غائب ہیں۔“

”نہیں ابھی تک تو نہیں کی۔“

”ٹھیک ہے، ہمارے غسل کا بندوبست ہو سکتا ہے۔“

”جی ابھی لیجئے۔“ ساربانوں نے غسل کا بندوبست کر دیا، ہم دونوں خوب نہائے، صاف ستھرا لباس پہنا اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر تابوت کی جانب متوجہ ہوئے۔ ساربان غور سے بار بار تابوت کی طرف دیکھ رہے تھے اور بے چین نظر آ رہے تھے آخر جب نہ رہا گیا تو معمر ساربان نے پوچھا۔

”آقا، یہ تابوت کیسا ہے؟“

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

مئی کا پورا جسم پیوں سے بندھا ہوا تھا بس چہرہ اور گردن کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا، میں نے اپنی انگلی اس کے رخسار پر رکھ دی اور ذرا سا دبایا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا اس کا جسم گوشت پوست کا نہیں تھا بلکہ وہ تو لکڑی کا کوئی مجسمہ معلوم ہو رہی تھی میں متعجب نگاہوں سے تابوت میں رکھی ہوئی مئی کو گھورنے لگا، مرزا حیرانی سے میری جانب دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا بھی، تم اس قدر حیرت زدہ کیوں ہو؟“

”وہی تو ہر بات ہی پر اسرار ہے لیکن تم اسے ہاتھ لگا کر دیکھو، یہ تو لکڑی کا کوئی مجسمہ لگتی ہے۔“

”لکڑی کا مجسمہ؟“

”ہاں۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ بڑی مہمل سی بات ہے کہ ایک لکڑی کی مئی کو حنوط کر کے تابوت میں رکھ کر مقبرے میں دفن کیا جائے۔“

”مجھے تفصیلات کا علم نہیں، لیکن ایک کام کیا جاسکتا ہے کہ کسی مصریات کے ماہر سے اس کا راز معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔“

”آپ کا خیال درست ہے آقا، محمود داؤدی اس سلسلے میں سب کچھ جانتے ہوں گے۔ آپ کو ان سے ملاقات کرنی چاہیے۔“

”محمود داؤدی؟“

”وہ بہت عالم فاضل انسان ہیں، ان کی عمر ایک سو بیس برس کے ٹک بھگ ہے، دنیا کے بیشتر علوم پر دسترس رکھتے ہیں اور قدیم مصر پر ان کا تجربہ اور معلومات بہت وسیع ہیں اور وہ قدیم مصر کے ایک ایک لمحے کا حال جانتے ہیں۔“

مرزا نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ”تم انہیں جانتے ہو؟“

”انہیں کون نہیں جانتا، وہ مشہور ہستی ہیں اور اس ہستی میں ہی رہتے ہیں۔“

”تو ہمیں ابھی اور اسی وقت ان سے ملنا ہے، تم ہمیں ان کے پاس لے چلو اور تمہارا ایک ساتھی

یہاں اس تابوت کے پاس رہے گا اور یہ اس کی حفاظت کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ساربان فوراً تیار ہو گیا، ہم نے دوسرے ساربان کو تابوت کے قریب ٹھہرنے کی ہدایت کی اور تابوت کا ڈھکن بند کر کے ساربان کی معیت میں ہستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

محمود داؤدی کا مکان آبادی کے وسط میں تھا اور خاصا خوش نما نظر آتا تھا، اطلاع سننے پر ہمیں فوراً بلالیا گیا۔ محمود داؤدی اس وقت کتب خانے میں تھے اور مطالعے میں غرق تھے ہم نے دیکھا کہ سر اور داڑھی کے بالوں کے ساتھ ساتھ بھنوں اور پلکوں کے بال بھی سفید تھے اور بلاشبہ سو سو برس کے نظر آتے تھے مگر مضبوط اور صحت مند جسم کے مالک تھے ہمیں دیکھتے ہی وہ حیرانی کے لیے اٹھے اور حلیم و شیریں لہجے میں کہنے لگے۔

”میں اجنبی مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

انہوں نے ہم سے معافہ کیا پھر عزت و احترام سے بٹھایا اور ملازم کو قہوہ لانے کی ہدایت کی، میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”حضرت آپ کی بہت تعریف سنی ہے، اس لیے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور ہم قدم بوی کے لیے حاضر ہو گئے۔“

”میں کیا اور میری تعریف کیا، میں تو پیارے نبی کا ادنیٰ غلام ہوں، تمام دلچسپیاں ختم کرویں، اب تو ذات مقدسہ کی تعلیم و تشریح پر حقیر خدمات انجام دے رہا ہوں، بہر کیف آپ حضرات اپنی آمد کا مقصد بیان کیجئے۔“

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ قدیم مصری تاریخ پر کھل عبور رکھتے ہیں اور دور فرامین کے ایک ایک لمحے سے واقف ہیں۔“

”زیادہ مبالغے سے کام نہ لو، ہاں اس ضمن میں تھوڑا بہت علم رکھتا ہوں، میرے پاس مصریات پر تقریباً ڈیڑھ سو قدیم و جدید کتابیں موجود ہیں جو مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں اس کے علاوہ جوانی کے زمانے

پچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

▶..... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے جس کا گزشتہ بیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

▶..... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

▶..... اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

▶..... پوری دنیا میں پھیلے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

▶..... اس لیے کہ پچی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

▶..... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

▶..... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔

▶..... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔

▶..... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں

اضافہ کرتی ہے۔ شعبہ اشتہارات: پچی کہانیاں

II 88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7 کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں گاجیڈ کے فرائض بھی انجام دیتا رہا ہوں۔“

محمود داؤدی کی گفتگو حوصلہ افزا تھی، چنانچہ میں نے شروع سے آخر تک تمام واقعات ان کے گوش گزار کروئے، میں نے دیکھا کہ محمود داؤدی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں انہوں نے پر اشتیاق اور پر تجسس لہجے میں کہا۔

”اوہ۔۔۔ تو گویا تم وہ لکڑی کی مٹی دریافت کر چکے ہو؟“

”ہم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ تابوت حاصل کیا ہے اور اب اس سلسلے میں کچھ جاننے کیلئے بے چین ہیں۔“

محمود داؤدی کہنے لگے ”اگر تم مقبرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھ سے ملاقات کر لیتے تو مصیبتوں میں گرفتار نہ ہوتے، مقبرے تک پہنچنا بہت آسان ہے۔ میں تمہارے بیان کردہ مقبرے اور مٹی کا ذکر پرانی کتابوں میں پڑھ چکا ہوں، تم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ لفظ بہ لفظ درست معلوم ہوتا ہے۔ تم نے وہاں بے شمار ستون دیکھے ہوں گے وہ ستون رہبری کا کام کرتے ہیں منزل تک پہنچنے کے لیے ان ستونوں کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔“

”ہیں افسوس ہے کہ اس سے قبل آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔“ میں نے تاسف کا اظہار کیا ”بہر طور ابھی آپ نے فرمایا کہ قدیم کتابوں میں اس مقبرے اور مٹی کی تفصیل پڑھ چکے ہیں، چنانچہ اگر ہمیں بھی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں تو بے حد شکر گزار ہوں گے۔“

بزرگ کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں پھر وہ کہنے لگے۔ ”وہ ملکہ شریس کی مٹی ہے اب سے تین ہزار قبل مسیح قبل فرمانروائے وقت فرعون مانیس نے اپنے سحر کے ذریعے اسے لکڑی کا بنا دیا تھا بلکہ شریس چونکہ رعایا میں مقبول تھی چنانچہ فوری رد عمل سے بچنے کے لیے اس نے ملکہ کی موت کی خبر مشہور کر دی اور رسوم کے مطابق حنوط کر کے اسے مقبرے میں رکھ دیا۔“ میں اور مرزا حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، محمود داؤدی پھر گویا ہوئے۔

”فرعون مانیس ایک جملون مزاج حکمران تھا،

تاریخ میں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں جب وہ کسی پر سخت ناراض ہوا اور پھر اس کو انعام و اکرام سے نواز دیا۔ یا کسی پر بہت زیادہ مہربان ہو گیا لیکن کسی روز اچانک اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ بادشاہ کی اس فطرت کے باعث وزراء، امرا خوفزدہ ہی رہا کرتے تھے کہ نامعلوم کس وقت کیا کر بیٹھے۔ مانیس کو دور فرامین کا عیاش اور رنگین مزاج حکمران تسلیم کیا گیا ہے۔ جنس کے معاملے میں وہ نہایت کمزور کردار کا مالک تھا۔ قدیم مصری حکمرانوں کی تاریخ میں اسے دیوانہ کہا گیا ہے اس نے کافی عمر تک شادی نہیں کی اس کا وطیرہ تھا کہ جو خوبصورت عورت دیکھتا یا اپنے مصاحبین سے جس لڑکی کی تعریف سنتا ہی رات اسے اپنے عیش کدے میں اٹھوا لیتا اور شب بھر خوشہ چینی کے بعد انعام و اکرام سے نواز کر اسے واپس گھر بھیج دیتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے ایک عورت کی دوسری بار کبھی خواہش نہیں کی۔ اس کے شبستان میں ہر رات ایک نئی جوانی جلوہ گر ہوتی۔ رعایا اپنے حکمران کی اس بد عادت سے بہت خوفزدہ تھی مگر کسی کولب کشائی کی جرأت نہ تھی، اس کا دستور تھا کہ روزانہ شام کے وقت اپنے شاہی رتھ میں شہر کے گشت کو نکلتا، مصاحبین اور جی حضور قسم کے لوگ ساتھ ہوتے اور فرعون کو جو عورت پسند آتی اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہوتا اور اسی رات وہ فرعون کی آرام گاہ میں پہنچا دی جاتی۔

ایک روز بادشاہ حسب معمول مصاحبین کے جلو میں شہر کے گشت کو نکلا تو مقابل سے ایک بے حد خوبصورت بھی آتی نظر آئی، ہمیں میں اعلیٰ نسل کے سولہ گھوڑے جتے ہوئے تھے جن کی راسیں کسی باوروی کو چوان کے ہاتھ نہیں تھیں بلکہ ایک حسین و جمیل اور نازک اندام عورت گھوڑوں کو ہانک رہی تھی وہ حسن و شباب کا بے مثال امتزاج تھی، اس کے بالوں کی سیاہ نشیں پیشانی اور رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ بڑی تمکنت سے اپنی جگہ بیٹھی تھی اور پر وقار انداز میں مسکرا کر ادھر ادھر دیکھتی جا رہی تھی۔

بادشاہ کی سواری قریب پہنچی تو حسینہ نے دلنریب
تقسیم کے ساتھ فرعون کی طرف دیکھا اور مودبانہ لیکن
غرور آمیز انداز میں نازک کلائی اٹھا کر سلام کیا۔
فرعون ایک تجربہ کار شکاری تھا اس نے حسن و شاب
کے اس مرقع کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور دل د
جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے فوراً ایک
مصاحب سے پوچھا۔

”یہ حسینہ کون ہے؟“
”یہ شہزادی شریس ہے، عالی مرتبت۔“
”شہزادی۔ کہاں کی شہزادی؟“
”وہ بہت بڑی ساحرہ ہے خداوند عالم اور خود کو
شہزادی کہلاتی ہے۔“

”کیا وہ علم سحر سے واقف ہے؟“
”وہ اس فن میں طاق ہے ذات اقدس۔“
مصاحب نے جواب دیا ”وہ مشہور کاہن کی بیٹی ہے“

”مگر وہ مرچکا ہے؟“
”بجا ارشاد فرمایا۔ یہ اپنے باپ کی جگہ گدی
نشین ہوئی ہے۔“

فرعون سوچ میں ڈوب گیا پھر ایک دوسرے
مصاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”یہ حسینہ ہمارے محل کی زینت بننے کی بھرپور
صلاحیت رکھتی ہے۔“
”حکم کی تعمیل ہوگی شہنشاہ معظم۔“ نائب نے
جواب دیا۔

فرعون شریس کی نظر کا ایسا گھائل ہوا تھا کہ فوراً
واپسی کا حکم دیا اور شریس کا انتظار کرنے لگا۔ رات
کے بارہ بج رہے تھے، فرعون بے چینی سے اپنی
خوابگاہ میں بھل رہا تھا، شریس اس کے دل و دماغ پر
بڑی طرح مسلط ہو گئی تھی، اس پر ہی جمال نے باوشاہ
کا سکون غارت کر دیا تھا۔ اسے اپنے مصاحب پر
غصہ آ رہا تھا جو ابھی تک شریس کو لے کر نہیں پہنچا تھا۔
اس نے اپنے مشیر خاص کو طلب کیا اور حکم دیا کہ فوراً
معلوم کیا جائے کہ اس کا کیا نماندہ کہاں ہے اور اس
نے ابھی تک ہمارے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی۔

نصف شب کے بعد اس کے مشیر نے باریابی کی
اجازت چاہی، فرعون نے اسے اندر بلا لیا، مشیر گھبرایا
ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بولا۔

”حضور میں بد نصیب اس خبر کو لانے کا باعث
بن رہا ہوں کہ آپ کے قاصد کو قتل کر دیا گیا ہے اور
اس کے ایک سو کھڑے شہر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر
پڑے ہیں۔“

”کیا؟“ فرعون غیض و غضب کے عالم میں چیخ
پڑا۔ ”اسے کس نے قتل کیا؟“
”کچھ پتا نہیں چلتا عالم پناہ۔“

”کیا بکتا ہے؟“ فرعون غصے سے شیر کی طرح
دھاڑا۔ ”ہماری سلطنت میں ایسا کون ہے جو ہم سے بر
تر ہو اور ناقابل شکست سمجھا جائے۔ اگر یہ اس شریس
کی حرکت ہے تو ہم اسے سزا دیں گے۔ تم اسی دقت
ایک فوجی دستہ تیار کرو اور شریس کی قیام گاہ تک جاؤ،
اس کے محل میں آگ لگا دو اسے سہا کر دو اور شریس کو
پابہ زنجیر کر کے ہمارے حضور میں پیش کرو۔“

”جو حکم خداوند عالم، لیکن۔۔۔۔۔“
”حکم کی فوری تعمیل کی جائے۔“ فرعون اور
غضبناک ہو گیا، ”تم ساحرہ سے خوفزدہ ہو کیا؟“
”نہیں شہنشاہ معظم۔“ مشیر نے کہا اور اٹھ
قدموں واپس جانے لگا۔

”نخبرہ! بادشاہ نے نرم لہجہ میں کہا وہ خود چند
قدم چل کر مشیر کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر
ہاتھ رکھ کر بولا۔

”ہم اپنا سابقہ حکم واپس لیتے ہیں۔ ہم نہیں
چاہتے کہ حسین شریس ہمارے خلوت کدے میں
داخل ہو تو ملول اور سنجیدہ نظر آئے۔ ہم خود اس کے
پاس چل رہے ہیں۔ فوراً شاہی سواری تیار کرائی
جائے۔“

مشیر بادشاہ کی متلون مزاجی سے واقف تھا، اس
نے اسی دقت شاہی رتھ بڑا دیا اور فرعون شریس کی
رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شریس اس وقت محو
خواب تھی، خدام نے باوشاہ کی آمد کی اطلاع دی تو
اس کے ہونٹوں پر سحر انگیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس

نے حکم دیا کہ بادشاہ کو عزت و احترام کے ساتھ یہیں پہنچا دیا جائے۔ فرعون خوابگاہ میں داخل ہوا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی اپنی آرام گاہ بھی اتنی نہیں اور آراستہ نہیں تھی بادشاہ کو دیکھ کر شریس نے ایک قیامت خیز انگڑائی لی، وہ ادائے ناز کے ساتھ چھپر کھٹ سے اٹھی اور بادشاہ کی پذیرائی کیلئے باوقار انداز میں آگے بڑھی، دوسرے ہی لمحے اس کی شیریں اور نغمہ نوا آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

”خوش آمدید شہنشاہ، جناب نے کیوں آنے زحمت گوارا فرمائی، انا چیز کو یا دفرمایا۔“

”ہم آپ کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے اس لیے خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔“

”زہے نصیب، تشریف رکھے۔“

بادشاہ ایک مرصع کرسی پر دراز ہو گیا، شریس نے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے آراستہ چھپر کھٹ پر آگئی اور فرعون کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ انداز ایسا تھا کہ فرعون کے دل پر بجلیاں گر رہی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک گوشہ نظروں کے سامنے دا تھا، فرعون سوچنے لگا ہم نے اب تک کچھ نہیں پایا اور جو چیز لائق حصول تھی وہ اب تک کیوں نہ حاصل کی گئی۔ اسی وقت شریس نے ملازمہ کو طلب کیا اور ان کیلئے مشروب مہیا کروایا۔ شریس کہنے لگی۔

”یہ میری خوش بختی ہے کہ شہنشاہ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا، میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کیونکر مزید خدمت کی سعادت نصیب ہو سکتی ہے۔“

فرعون نے ایک ہی سانس میں مشروب کا گلاس خالی کر دیا، اس نے آگے بڑھ کر شریس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

”آپ نے ہمارے دل کا سکون لوٹ لیا ہے شہزادی، آپ بلاشبہ شہزادی ہیں، آپ اتنی حسین ہیں کہ آپ کی تعریف کے لیے ابھی الفاظ ایجاد نہیں ہوئے، گلوں، ستاروں اور مہتاب وغیرہ سے تشبیہ دینا آپ کے بے مثال حسن کی تذلیل ہے، ہم آپ کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔“

شریس معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی ”ایک

رہبت کی محبت۔“

”ہم آپ کی ہر خواہش پوری کریں گے، آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تعمیل ہوگی۔“ شریس کچھ نہیں بولی بس مسکراہٹ کے ساتھ بادشاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ فرعون اس مسکراہٹ کو رضامندی سمجھا اور سرک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے چھونے کی کوشش کی تو شریس سمٹ کر بیٹھ گئی، فرعون کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے لیکن جلد ہی زائل ہو گئے اور وہ بانہیں پھیلا کر بولا۔

”شریاد مت، جان مائیں اور خود کو ہماری آغوش میں بکھیر دو، ہم تمہیں نہال کر دیں گے۔“

”عالی مرتبت، میں معذرت خواہ ہوں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”کیا؟ جانتی ہو ہمارے حکم سے سرتابی تمہیں مشکلات میں مبتلا کر سکتی ہے۔“

”میں اپنے اصولوں کے مقابلے میں کسی سزا کی پروا نہیں کرتی۔“ شریس نے محل کے ساتھ شیریں گہجے میں کہا۔ ”میں ایک پاکدامن عورت ہوں اور اپنے تقدس کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“

فرعون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ لیکن اپنی فطرت کے مطابق جلد ہی اس کی کیفیت بدل گئی۔ وہ سابقہ حالت میں آگیا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

”کوئی خیال نہ کرنا شہزادی شریس، ہم ذرا جذباتی ہو گئے تھے۔ دراصل ہم نے سیکھا ہی نہیں کہ ہماری زبان سے کوئی لفظ نکلے اور کوئی اسے مسترد کر دے۔ آپ پہلی خاتون ہیں جس کی سرکشی برداشت کرنے میں ہم لطف محسوس کرتے ہیں تاہم یہ ضرور معلوم کرنا چاہیں گے کہ آپ کے اصول کیا ہیں اور آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”میں عرض کر چکی ہوں کہ میں ایک حیادار اور باعصمت عورت ہوں، اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور میرے لیے بے قرار ہیں تو اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے شادی۔“

”اوہ..... شاوی۔“ فرعون مضطرب نظر آنے لگا، ”دراصل ہم نے کبھی شاوی کے بارے میں نہیں سوچا۔“

”اب غور فرمائیں، شہنشاہ معظم، میری رائے میں آپ کو کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شریس نے جواب دیا۔

”ہاں..... ہمیں سوچنے دیجئے۔“ فرعون اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

شریس بادشاہ کی کیفیت دیکھ رہی تھی وہ اس کی اندرونی کشمکش سے واقف تھی ادھر فرعون نے جلد فیصلہ کر لیا اور شریس کی کلائی تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

”ہم نے محسوس کیا ہے کہ واقعی آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ ہم آپ کو اپنی ملکہ بنانے کے لیے تیار ہیں اور کل ہی شادی کی رسوم انجام پائیں گی۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے۔“ یہ کہہ کر فرعون نے اس کے ہاتھ کی پشت پر ہوسہ دیا اور رخصت ہو گیا۔

اتنا کہہ کر محمود داد دی رکے تھے اور ہم دونوں محویت سے سب کچھ من رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

”یہ کہانی گوئی کا انداز بھی خوب ہے، لگتا ہے ہم وہیں کہیں ان کرداروں کے درمیان موجود تھے۔ بہر حال دوسرے دن ان دونوں کی شادی کی رسومات ادا کی گئیں اور شریس باضابطہ طور پر فرعون کی دلہن بن گئی پھر اس کے بعد عیاش فرعون کی داستان یوں ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد فرعون کا دل ملکہ سے بھر گیا اور وہ کسی نئی عورت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اس کے مصاحبین نے اس کو بہترین راہ دکھائی۔ اس نے محل کے خفیہ حصے میں مصاحبین سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے شہنشاہ کو نو خیز کلیاں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے ان کے انعام و اکرام کا سلسلہ جو ملکہ سے شادی کے بعد ختم ہو گیا تھا ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔ ملکہ ساحرہ تھی اور یوں بھی تمام امور پر نظر رکھتی تھی۔ چنانچہ اسے بادشاہ کی رنگینوں کا علم ہو گیا۔ اس نے فرعون سے شکایت کی جس کے جواب میں فرعون نے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ

دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون کا ہاتھ لکڑی کا ہو گیا، جب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا غلطی کر دی ہے تو فرعون نے اس سے معافی مانگی اور اس کا ہاتھ واپس گوشت پوست کا ہو گیا۔ لیکن فرعون نے اس سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ فرعون نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔ جنہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خود جادو سیکھ لے۔ فرعون نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور جادو سیکھنا شروع کر دیا۔ اب وہ بہترین جادو سیکھتا جا رہا تھا۔ ادھر ملکہ نے فرعون سے بدلہ لینے کی خاطر ایک سیاہی سے تعلقات بڑھانا شروع کر دیئے اور وہ اس کے بہت قریب آ گیا۔ ملکہ نے اسے اپنی جانب راغب کرنا شروع کر دیا کہ وہ بادشاہ بننے کے قابل ہے لیکن فرعون نے مکمل علم سیکھ لیا تھا اور پھر ایک دن فرعون نے موقع پا کر دھوکے سے ملکہ کو لکڑی کا بنا دیا۔ ملکہ کی موت کا مشہور کر کے بادشاہ نے اسے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دفنایا۔ پورے ملک پر بادشاہ کی حکومت تھی۔ لیکن ملکہ کا وقار سیاہی ان سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بادشاہ کے خلاف لوگوں کو جمع کیا اور وقت کے کاہن اعظم کے پاس پہنچا وہ کاہن بھی بادشاہ کے خلاف تھا، کاہن نے اس سیاہی کو بتایا کہ بادشاہ کی موت صرف ایک تلواریں سے ممکن ہے وہ تلواریں ایک خاص جگہ سے مل سکتی ہے، بڑے جتن کیے گئے اور وہ تلوار حاصل کر لی گئی۔ پھر سیاہی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ پر شب خون مارا اور تلوار کی مدد سے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ بس اس کے بعد سے بادشاہ کی روح اب بھی ملکہ کے پیچھے ہے اور اس سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اب تم لوگوں نے اس ملکہ کی لاش کو حاصل کر لیا ہے تو اس کی بھرپور حفاظت کرنا ہو گی۔ تم وہاں اس لاش کے پاس مناسب حفاظت کا بندوبست کر کے آئے ہونا۔“

اچانک ہی ہمیں خیال آیا کہ وہاں تو صرف ایک ساربان موجود تھا، ہم داد دی سے اجازت لے کر جلدی سے اس جگہ پہنچے جہاں وہ ساربان اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اور

لاش غائب تھی میں نے ساربان سے کہا۔

”کیا ہوا۔ لاش کہاں ہے؟“

”وہ..... وہ طوفان آیا تھا، وہ شدید رینٹ کا طوفان تھا لیکن کیا آپ لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔“

”نہیں، ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”لیکن میں سمجھ رہا ہوں، باوشاہ نے لاش حاصل کر لی ہے اور اب وہ اسے کہاں لے گیا ہوگا۔“

”شاید اسی جگہ جہاں سے ہم نے اسے حاصل کیا تھا۔“

”ہاں میرے بچو، وہ لاش کو اسی جگہ لے گیا ہے اور میں تمہیں بتاؤں کہ اسی جگہ وہ تلوار اور تمام چیزیں مل سکتی ہیں کیا تم میرے ساتھ اس جگہ چلو گے؟“

سب کے منہ حیرت سے کھلے کھلے رہ گئے تھے، محمود داؤدی سامنے موجود تھا، اس نے سب کو حیران کروا دیا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

”جی ہم تیار ہیں۔“

”تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“ محمود داؤدی نے کہا اور ہم سب ان کے ساتھ چل پڑے۔ راستوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ لمحوں میں وہ فاصلے طے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اندر پہنچ گئے اور پھر اس جگہ تک جہاں ایک بڑے سے ہال میں ایک چبوترے پر ملکہ کی لاش رکھی ہوئی تھی اور ایک کھوپڑی اس کے گرد چکرا رہی تھی۔ وہ کھوپڑی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ محمود داؤدی نے کہا۔

”اس ہال کے ایک دہریے میں وہ تلوار موجود ہے۔ تلاش کرو اچھی طرح تلاش کرو۔“

میں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں وہ تلوار تلاش کرنے لگے، پھر ایک دہریے میں مجھے ایک بکس رکھا ہوا نظر آیا اور میں نے لپک کر بکس کھولا تو اس میں تلوار موجود تھی، میں نے تلوار نکال لی عین اسی وقت اس کھوپڑی نے مجھ پر حملہ کر دیا اور نتیجے میں تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ عین اسی وقت محمود داؤدی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے کھوپڑی پر ایک ہاتھ مارا اور وہ اڑتی ہوئی دور

جا گری، پھر انھی اور ہوا میں لہرانے لگی۔ محمود صاحب نے تلوار اٹھائی اور اس کھوپڑی کے عین درمیان کھینچ ماری، تلوار کھوپڑی کے پتھوں بیچ ترازو ہو گئی تھی اور اب کھوپڑی میں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کھوپڑی میں آگ لگ گئی تھی اور وہ دھڑا دھڑا جل رہی تھی۔ تلوار میں ایسی ہی کوئی طلسمی طاقت تھی جس کی وجہ سے کھوپڑی تباہ و برباد ہو گئی تھی پھر وہ ایک راکھ کا ڈھیر رہ گئی۔ عین اسی وقت ایک اور تماشا ہوا۔ لکڑی کی ملکہ نے اپنی جگہ سے جنبش کی تھی اور اس کا جسم پوری طرح اپنی اصل حالت میں آ گیا تھا۔ اچانک ہی اس کی آواز ابھری۔ زبان نہ سمجھ میں آنے والی تھی لیکن محمود داؤدی نے اس کا ترجمہ بتایا۔

”میرے محسنو! تم نے میری لاش کو تلاش کر لیا اور میرا مقصد پورا کر دیا۔ تم سے کیا گیا وعدہ پورا کیا جائے گا بس ایک کام اور کرو میری لاش کو پرانے اہرام میں رکھوا دو۔ یہ شخص جانتا ہے کہ میں کس پرانے اہرام کی بات کر رہی ہوں۔“ ملکہ نے داؤدی کی طرف اشارہ کیا اور داؤدی نے سر ہلا دیا۔

”بس میری زندگی تمام ہوئی۔“ یہ کہنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ہم نے اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو اس جگہ رکھوا دیا تھا۔ ظاہر ہے اب یہاں رکنا بیجا تھا۔

دو دن بعد ہم اپنے ملک واپس جا رہے تھے، اپنے گھر پہنچ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مرزا نے کہا۔

”لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔“

”بدھو کیوں؟“ میں نے مرزا سے کہا ”مجھے یقین ہے کہ بقیارم بھی آگئی ہوگی۔ ذرا بینک سے کنفرم تو کرو۔“

مرزا نے بینک فون کر کے رقم کا پتا کیا اور بینک منیجر نے خوشخبری دی کہ دو دن پہلے دونوں کے اکاؤنٹ میں رقم آئی ہے۔ ہم حیران رہ گئے تھے، پھر ہم نے اپنے بڑے کاموں سے توبہ کر لی اور رقم سے ایک اچھے کاروبار کرنے کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

☆☆☆



درگاہ کا مجذوب

احمد سجاد پابر

پڑا سرادھ کے لیے ایک بہت اچھوتی یادگار داستان جو یقیناً آپ بہلانے پائیں گے



لق و دوق، انگارہ بنے صحرا میں وہ شخص زندگی بچانے کے لئے دوڑ رہا تھا، عربی چغے میں ملبوس ہانپتا ہوا وہ دوڑے چلا جا رہا تھا، سانس تھا کہ دھوئی کی طرح چل رہا تھا اور قدم تھکان کے مارے دھیسے پڑ رہے تھے، وہ زخمی بھی تھا مگر وہ رک نہیں سکتا



Downloaded From
Paksociety.com

تھا، اس وقت رکے گا دوسرا مطلب سوائے موت کے اور کچھ نہیں تھا، صحرا کی ریت پر سانپوں کے گزرنے کے نشانات ثبت تھے اور ہر طرف ان کی زہریلی پھلکاؤں کا رنگ رہی تھی، مگر اس وقت اس کے دوزخے کا سبب وہ کتوں کا غول تھا جو جانے سب سے اس کے پیچھے تھا۔۔۔ صحرائی کتوں کا وہ غول خون کی مہک پا کر اس کے پیچھے تھا، شوں کی مجنونانہ غرائیں لحد بالحد قریب آ رہی تھیں، سامنے ایک شتہ کھنڈر کی دیواریں نظر آنے لگیں تھیں، زخمی کی کوشش تھی کی کسی طرح اس کھنڈر تک پہنچ سکے، کتے قریب پہنچ چکے تھے، کھنڈر اب چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا جب اسے اپنے کندھے پر خون آشام دانت محسوس ہوئے، درو کی تیز لہر اپنے کندھے سے نکل کر پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی، اس کے گھٹنے آپس میں کمرائے اور وہ ہتی ریت پر گر پڑا، اس کا چہرہ ریت میں دھنس گیا، کتوں کا پورا غول اس پر نوٹ پڑا۔۔۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلتی چلی گئی۔۔۔ کتوں کی غراہنوں میں ایک باگل پن اور وحشت آمیز خوشی تھی۔۔۔ سن پسند کھا جانے کی خوشی۔۔۔!!

☆ ☆ ☆

جواں سالہ نوروز خان کا حلق خشک ہو رہا تھا، پورے جسم سے پسینے کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں، اسے کئی راتوں سے وہ خواب دکھائی دے رہا تھا، اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ رات کا جانے وہ کونسا پہر تھا، بجلی کے جھمکے اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ بتا رہی تھی کہ باہر تیز بارش ہو رہی ہے، چاروں طرف گھنٹا اندھیرا تھا۔ سوات کے شہر منگوردہ میں اس وقت وہ اپنے چھوٹے گھر میں موجود تھا جو ایک پہاڑی رالگ تھلگ بنا ہوا تھا، گھر میں اس کی بوڑھی ماں گل بانو کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہ تھا، اس کا باپ تو اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی لینڈ سلائڈنگ کی زد میں آ کر وفات پا چکا تھا، گھریلو حالات کی وجہ سے وہ میزک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا، اس نے لڑکپن سے ہی سیاحوں کے لئے گائیڈ کا کام شروع کر دیا، سوات بھید بھری سرزمین تھی، یہ گندھارا تہذیب کا مرکز و مسکن رہی تھی، بدھ مت کے نایاب و کمیاب آثار قدیمہ پر مشتمل میوزیم منگوردہ کی پہچان تھا، جس کی وجہ سے یہاں پورا سال سیاح دنیا بھر سے آتے تھے، نوروز خان کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی کیونکہ وہ ایک مختاری اور ماہر گائیڈ تھا، اسے اپنے علاقے کے چنے چنے کا علم تھا، اکثر سیاح بار بار یہاں آتے تھے اور نوروز خان سے ہی رابطہ

کرتے تھے، وہ جانے کے بعد اپنے دوستوں کو بھی اس کا نمبر دیتے، غرض کہ اس کے معاشی حالات بہت بہتر ہو چکے تھے۔ موسم کی وجہ سے لائٹ حسب معمول چھٹی پر جا چکی تھی۔ اس وقت نوروز خان کا اضطراب نہ تو اندھیرے کی وجہ سے تھا اور نہ ہی چھٹی چٹکھارتی ہواؤں کی وجہ سے۔۔۔ وہ خواب اسے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا، جانے کیسا اشارہ تھا جسے وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی ماں شاید تبہ کے لئے اٹھ چکی تھی کیونکہ وہ ساتھ والی چارپائی پر نہیں تھی۔

”لگتا ہے آج کی رات جاگ کر گزرے گی“

وہ بڑبڑایا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو، سائینڈ ٹیبل سے پانی کا جب اٹھا کر منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں اس نے جگ آدھا کر دیا، پانی اس کی بانجھوں سے بہہ رہا تھا اور اسے بھگور رہا تھا مگر اس وقت اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس نے چار جنگ لائٹ آن کی۔ سامنے ہی میز پر وہ مجسمہ رکھا تھا جو اسے ایک قدیم سنو پا (بدھ مت کی عبادت گاہ) سے ملا تھا، وہ سنو پا سوات کے ایک پہاڑ کی غار نما سرنگ کے آخر میں چھپا تھا، یہ غار نوروز خان نے اتفاقاً دریافت کی تھی، اس کی عادت تھی کہ وہ فارغ دنوں میں ان راستوں اور جنگلات میں گھومتا پھرتا رہتا تھا جہاں وہ پہلے کبھی نہیں گیا تھا، یہ اس کے پیشے کے لئے ضروری تھا اس کا اکثر اسے فائدہ ہوتا رہتا تھا، وہ سنو پا ایک غار نما گیمبا میں چھپا ہوا تھا، بارش سے بچنے کے لئے نوروز خان اس گیمبا تک پہنچتا تھا، سنو پا میں صرف یہ مجسمہ موجود تھا، یہ عجیب و غریب مجسمہ جس کا نچلا دھڑ کسی سانپ کا تھا اور اوپر کا حصہ کسی خوشوار کتے کی شکل کا تھا، کتے کی زبان باہر لپک رہی تھی اور دانتوں سے لہو نپک رہا تھا، اس کی آنکھوں میں آگ دکھ رہی تھی، جیسے آنکھوں کی جگہ کسی نے انگارے رکھ دیے ہوں، نوروز خان کو مجسمے پر منتر نما کچھ الفاظ بھی لکھے نظر آئے، اپنے تجربے کی بنا پر اسے معلوم تھا کہ اس مجسمے کا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے مگر یہ بدھا کی سرزمین پر کیا کر رہا تھا؟ یہاں کیسے پہنچا اور سنو پا میں اس کی موجودگی کا کیا جواز تھا، وہ سوچوں میں گم تھا۔ اچانک اسے ایسے لگا کہ کمرے میں سانپ کی پھٹکار ہو گئی ہے، وہ خوف سے اچھل پڑا، چاروں طرف بھید بھرے انداز میں اس نے دیکھا مگر ہر طرف سکوت تھا۔۔۔ گہرا موت جیسا سناٹا۔۔۔!!

☆ ☆ ☆

ساتھ نظر پیشی ریت ہی ریت تھی جس پر وحشی ہواؤں نے لہرے ڈالے ہوئے تھے، نہ کوئی ذی روح نظر آ رہا تھا اور نہ ہی زندگی کے آثار، صحرائی پودے بھی یہاں ناپید تھے، ایسے میں ٹیلے کی اوٹ سے نمودار ہونے والا وہ شتر بان اپنے اونٹ کو دوڑاتا اور سے کسی ڈانسو سارس پر سوار جنگجو محسوس ہوتا تھا جس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اس کے ماتھے پر قشہ کشیا ہوا تھا، کانوں میں بالیاں تھیں اور جسم پر محض گیدڑے رنگ کا لبادہ لپٹا تھا۔۔۔ اونٹ لمبی زقند بھرتا ہوا سے باتیں کر رہا تھا، ریت کے گولے وقفے وقفے سے اٹھ رہے تھے مگر شتر بان کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی، قوی ہیکل اونٹ کسی خاص نسل کا محسوس ہوتا تھا کیونکہ اس کا رنگ محل بھورا نہیں تھا بلکہ سفیدی مائل تھا، اس کا ڈیل ذول بھی عام اونٹوں سے زیادہ تھا۔ اس کی گرون پر بالوں کو اس انداز سے تراشا گیا تھا کہ کوئی اجنبی تحریر ابھرا آتی تھی۔ وور ایک اونٹ کی کوہان کی شکل کا ٹیلہ نظر آ رہا تھا، شتر بان نے اپنے اونٹ کو اس ٹیلے کے پاس جا کر روک دیا اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا، ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ شتر بان نیچے اترتے ہی سجدے میں گر گیا۔

”خونو، اے مقدس خونو۔۔۔ اے ریت کے دیوتا، اے صحراؤں کے مالک، مجھے اپنے چرنوں تک آنے کا راستہ دو“ شتر بان مسلسل سجدے میں پڑا گڑا گڑا رہا تھا، اس کی گریہ وزاری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اچانک وہ کھڑا ہوا اور چشم زدن میں اپنے جغے سے ایک خنجر نکالا جس کی دھار سورج کی روشنی میں چمک کر آنکھیں چندھیا رہی تھی، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر خنجر سے ایک کٹ لگایا، خون کی دھار ریت پر ٹپکنے لگی، جب کافی سارا خون ریت پی چکی تو ایک زور وار گڑا گڑا بٹ سنائی دی اور اونٹ کی کوہان وائے ٹیلے میں ایک شکاف پیدا ہوتا محسوس ہوا، تھوڑی دیر میں ہرمیان میں ایک راستہ نظر آنے لگا۔ اس وحشی شتر بان نے ایک فلک شکاف چیخ ماری اور اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اس نئے پیدا ہونے والے راستے کی طرف ووڑ پڑا، اس کے پیچھے ریت برابر ہو چکی تھی، یہ ایک سرنگ نما راستہ تھا، اونٹ سبک رفتاری سے اس سرنگ میں ووڑ رہا تھا، ہوا اور روشنی کسی ان ویکھے روزن سے سرنگ میں آرہی تھی۔ سرنگ کا اختتام ایک کھنڈر نما ہال پر ہوا، ہر طرف وحشت ناچ رہی تھی، دیواروں پر جالے تھے جن سے مٹی کے ساز کی پکڑیاں اس اجنبی کو گھور

رہی تھی، چمکاؤروں کے غول اس کے آنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کھنڈر میں چکرانے لگے مگر اس شتر بان کو کسی بات کی پروا نہیں تھی، سامنے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کوئی گھڑی، کوئی دروازہ نہیں تھا، صرف دیوار پر جلتی ایک مشعل سے کمرے کی نشاندہی ہو رہی تھی، اچانک مشعل کے ساتھ سے سٹی دیوار نے ایک طرف کھسکا شروع کر دیا اور وہاں دروازہ نمودار ہو گیا، شتر بان سجدے میں گر گیا۔

”اندر جاؤ، اندر جاؤ، دیر مت کرو، دیوتا تمہارا انتظار کر رہے ہیں“

ایک کونے میں لگے جالے سے سرخ آنکھوں والی مکڑی چیخی۔

شتر بان ایک جھٹکے سے اٹھا اور چھوٹے کمرے کی طرف دوزا، کمرے کے باہر وہ ادب سے جھکا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا، کمرے میں مختلف خوشبو میں بسی ہوئی ٹھیں، سامنے ایک چبوترے پر ایک تابوت رکھا تھا، اس نیچی چھت والے کمرے میں جگہ جگہ جواہرات بکھرے تھے، چبوترے پر بھی زرد جواہر کا ڈھیر پڑا ہوا تھا، ہیرے جگہ رہے تھے، وہ ادب سے چبوترے کے سامنے کھڑا ہو گیا، رکوع میں جھکا اور انتظار کرنے لگا، چوبی صندوق کا ڈھکن جہراٹ کے ساتھ اوپر کواٹھا اور کوئی آدھا صندوق سے باہر آ گیا۔ یہ ایک کریہہ شکل مخلوق تھی جسے انسان نہیں کہہ سکتے تھے، اس کا تپلا دھڑ سانپ کا اور چہرہ ایک خونخوار کتے کا تھا، اس کے کاندھے پر ایک کالا سیاہ سانپ کندلی مارے بیٹھا تھا۔ شتر بان ذنودت کرنے لگا، اس کا ہاتھ زمین پر لگا ہوا تھا۔

”شاریکا حاضر ہے، نیل کی مقدس سرزمین کے مقدس دیوتا“ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا، اس کے انداز میں گہرا خوف تھا۔

”ہم نے تمہیں بلایا تھا شاریکا، ضرورت پڑ گئی تھی تمہاری، ہمیں معلوم ہے کہ تم اس دھرتی کے نہیں ہو بلکہ تم ہمالیہ کی ترائی میں کالی گھپاؤں میں چھ ماہ کی نیند میں پڑے ہو، وہ گھپائیں جہاں اندھیرے پلتے ہیں اور بڑا شیطان آرام کرتا ہے، مگر ہمیں تمہیں جگانا پڑا، وہ علاقہ تمہارے دیوتاؤں کی دھرتی ہے، ہمیں تمہارے بڑے دیوتا سے بیتی کر کے تمہیں بلانا پڑا ہے“

سانپ کے منہ سے ایک چیختی ہوئی غیر انسانی آواز سنائی

”نحوسٹ، کالے سائے، اندھیرے، آسمانی، بلائیں
مرے بچے۔۔۔ سنبھل کے، دیکھ بھال کے“

یہ رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے بنی گدڑی پہنے، ننگے
پاؤں، ننگے میں کڑی کے منٹوں کی مالا، ہاتھ میں گھنگھڑاؤں
نماد تھا۔ ایک مجبوظ الحواس دکھائی دینے والا شخص تھا جو
بھاری بھر کمپوسل کوزمین پر مار کر بار بار گول گول گھومتا اور اسی
ایک جملے کی تکرار کے جا رہا تھا۔ جانے وہ کون تھا، کہاں سے آیا
تھا، نوروز خان نے اسے پہلی بار یہاں دیکھا تھا۔

”باباجی، کیا فرما رہے ہیں آپ“
نوروز ایسے لوگوں کا ہمیشہ ادب کرتا تھا۔

”اندھیرے، سائے۔۔۔ اندھا کنواں، آگ ہی آگ“
ملنگ نما باباجی ایک ہی تکرار کرتے گھوم رہے تھے۔

”باباجی، میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔ اچھا چلیں آپ کو
چائے پلاتا ہوں، دیکھیں تو کتنی سڑوی ہے، نئے جوتے بھی
ڈلاؤں گا“

اس نے لجاجت سے ملنگ کا ہاتھ تھما۔
”جا بیری کی گود میں جا بیٹھ، واپس چلا جا، باہر مت آنا،
جلدی کر، وہ آ رہے ہیں، وہ آ رہے ہیں“

اس بار ملنگ سے سرخ آنکھیں کھول کر اسے گھورا اور
موسل کوزور سے زمین پر مارا۔

”تارے نوٹیں گے، آگ برے گی، خلقت ترے
گی۔۔۔ سائے، اندھیرے، بھاگ جا، دفع ہو جا یہاں سے
نوروز، بھاگ جا“

ملنگ یہ کہتا ہوا منہ سے بنو ہو کی کوک لگاتا ایک طرف کو
بھاگ گیا اور نوروز خان اس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران سا
کھڑا رہ گیا۔ جانے کیا ماجرا تھا، جانے کون تھا یہ دور میں شخص!!

سہ پہر کو رابرٹ نامی سیاح کو سارا دن گھما کر نوروز نے
اس سے اجازت طلب کی اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے گھر
کی راہ لی۔۔۔ بادل پل میں آتے اور پل میں جاتے

تھے، سبہ پہر کو ہی رات کا سماں ہو رہا تھا، گھر کے باہر ابھی اس
نے کڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسے ایسا لگا کوئی سایہ سا

دروازے سے نکلا ہے، ایک تکلیف بھری غیابٹ کی آواز
پھیل، وہ اچھل کر ایک طرف بھاگا، اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ

شعلوں میں لپٹا ایک قد آدم سا ہی ماں بندر کی نسل کا کوئی
جانور تھا جو چپخس مارتا مڑتا رہا تھا کوئی جائے فرار سے میسر

نہیں۔۔۔

وی۔ اس کی زبان مسلسل لپٹا رہی تھی۔
”سیوک کو تھم ویتھے، سیوک جیون دان کروے گا آپ
کے لئے“

شاریکا نے ہاتھ زمین پر رگڑا۔ ”بدب آ کی کالی گھپا میں
چھپنا ہوا، ہمارا شیر کسی نے چڑا لیا ہے، ہم ادھورے ہیں
شاریکا، اسی جیسے میں ہماری شکتی ہے، اسی میں ان صحراؤں اور
نیل کے راز چھپے ہیں، اسی طاقت سے ہمارے دیوتاؤں نے
اہرام کھڑے کیے تھے، جب ہوائیں ننوں وزنی پتھر کا ندھوں
پر اٹھائے پھرتی تھیں، یہ راز محل گیا تو دیوتاؤں کا غضب ہم پر
نازل ہوگا، اسی کی مدد سے ہم نے ناگ جاتی پر حکومت کرنی
ہے، جاؤ۔۔۔ اندھیرے کی شکلیوں کو لے جاؤ اور مجسمہ
واپس لے کر آؤ“

سانب کے منہ سے دوبارہ پھر سرسراہٹ کی آواز
نکل۔ اس کے ساتھ ہی وہ بدہیت حقوق دوبارہ چوٹی صندوق
میں غائب ہو گئی اور شاریکا سجدے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف
پھنکاریں مچ رہی تھیں!!

☆ ☆ ☆
نوروز اذان کی آواز پر گھر سے نکلا، گھبناؤ اس سے پہلے
ہی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ بابا چراغ شاہ کی خانقاہ کے پاس بنی
مسجد کی طرف چل پڑا، بابا چراغ شاہ دنیا کے بکھیروں سے دور
اپنے حجرے تک محدود رہتے تھے، خانقاہ پر ملک کے طول و
عرض سے ان کے پروانوں کا جھوم رہتا تھا، یہاں ہر وقت لنگر
چلتا، مسافر قیام کرتے، مسائل کا شکار لوگ یہاں آ کر اللہ کا
ذکر ادا کرتے اور سکون پاتے، نوروزی نور اور سکون کی دبیز تہہ
تھی جو اس فضا میں سرایت کئے رکھتی تھی، بابا چراغ شاہ بہت
ہی مجبور ہو کر درگاہ سے باہر آتے تھے ورنہ وہ یہیں بیٹھ کر
خلقت کے مسائل حل کرتے تھے۔۔۔ مسجد میں آتے ہی
نوروز خان کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا، تمام پریشانیاں اور بے سکونی
تھخیل ہو گئیں۔ اس نے سکون سے نماز پڑھی، اللہ کے حضور
ہاتھ پھیلا کر اور گڑا کر دعا مانگی، فارغ ہو کر پر سکون سا مسجد
سے باہر آ گیا، جولائی کا مہینہ تھا مگر منگورہ میں دسمبر کا سا
ماحول تھا، پہاڑوں پر دھند کے بادل تیر رہے تھے، موسم کی
مناسبت سے نوروز خان نے گرم شال لی ہوئی تھی۔ وہ سوچوں
میں گم گھر کی طرف روانہ ہوا جب ایک دم سے اسے زوردار
گھنگھروؤں کی چھٹک سنائی دی، وہ اچھل پڑا۔

www.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

نہ تھی، اسی وقت اسی طرح کے بندروں کا پورا غول درختوں سے چھٹا نہیں مڑتا اڑتا ہوا آیا اور انہوں نے کھلید رواڑہ کو عبور کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی قطب کی طرح واپس ملے جیسے کسی غیر مرنی طاقت نے ان کو اچھال دیا ہو، حیرت انگیز طور پر وہ نوروز خان کی طرف نہیں آرہے تھے، تھوڑی دیر بعد وہ سب شعلوں میں گھرے وہاں تڑپ رہے تھے اور وہ چشم حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا!!

☆☆☆

یہ ایک تنگ سی غارتھی جو سرنگ کی طرح لمبی تھی، اس کا منہ جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا، غار کے آخر میں ایک دم توڑتی چربی سے جلی مشعل اندھیرے سے لڑ رہی تھی، چار سو تنگ سی روشنی پھیلی تھی، کوئلوں کے دہکتے الاؤ کے گرد شاریکا آلتی پالتی مارے بیٹھا، منہ ہی منہ میں بدبواہی تھا، اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا، تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں جو انگارے کی طرح دھک رہی تھیں، الاؤ سے ایک دھکتا کوئلہ اٹھا کر اس نے سامنے کی دیوار پر دے مارا، اس کے ساتھ ہی ایک کریہہ چیخ کے ساتھ غار کی چھت پھٹی اور ایک دیو ہیکل لنگور چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا، وہ دانت نکوتں رہا تھا۔

”افریقہ کی مہمان شکتی ساٹکا، مجھے بتاؤ کہ تمہارے چیلے جس کام پر گئے تھے اس کا کیا بنا، وقت بھاگتا جا رہا ہے، مجھے خوف دیوتا نے اتنی مہلت نہیں دی“

شاریکا نے ڈانٹتے ہوئے اس لنگور کو گھورا۔

”میں شناچاہتا ہوں مہاراج، میں نے جیمیری کوشش کی پر تو کچھ نہیں بن سکا، پلید آتما میں پر لوک سدھار گئیں ہیں، ان سے بڑی مہمان شکتی ان سے آن نکرائی جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں اور انہیں جیون بلیدان دینا پڑا“

ساٹکا نے سر جھکا کر کہا۔

”کیا اول فول بکے جا رہے ہو موروکھ، کالی ہکتیوں سے بڑی بھی کوئی شکتی ہے، آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا“

شاریکا اس کی بات سن کر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”مہاراج، ہم اس منش کی شکتی کا اندازہ نہیں کر سکے، کوئی روشنی کی شکتی ہے اس کے پاس، اس کے لئے کچھ اور پائے کرنا پڑے گا“

ساٹکا نے خرخراتے ہوئے جسم کھجایا۔

”روشنی کی شکتی کہاں سے آگئی اس کے پاس، وہ تو کیوں

غام سامنش ہے“

شاریکا نے حیرت سے کہا۔

”مہاراج ہماری آتما میں تو اس کے گھر میں داخل ہی نہیں ہو پائیں، کوئی سیما کھینچی ہے گھر کے باہر جو جسم کر دیتی ہے ہر آتما کو، کوئی منڈپ ہے“

ساٹکا نے چھلانگ لگا کر اپنی جگہ بدلی۔

”میں دیوی دیوتاؤں کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ جس نے ہماری ہڈیوں کا اہمان کیا ہے انہیں نرک پہنچا کر عی دم لوں گا۔۔۔ اب میں شروپ دیوتا کے دربار کی خاص پجاری کنڈولی کو بھیجتا ہوں اس کی طرف، وہ اندھیروں کی جانی نہیں ہے، مجھے دشا ہے کہ وہ سارا حال بدلے کر آئے گی، ہمیں جلد اس سے مجسمہ لینا ہے“

شاریکا کی آنکھیں کسی آدم خور جانور کی طرح دھک رہی تھیں۔ اس نے کچھ پڑھ کر زمین کی طرف ہاتھ جھکا تو سامنے سے زمین پھٹی اور ایک کریہہ صورت بڑھیا زمین سے باہر نکل آئی۔

”کنڈولی حاضر ہے مہاراج، مجھے بتائیں کسے شروپ دینا ہے، میرے پاس سے تھوڑا ہے۔۔۔ کس نے مہاراج کا اہمان کیا ہے“

کنڈولی نے چیختی ہوئی پارک ایک آواز میں کہا۔

”کنڈولی دھیرج سے کام لو، مسئلہ یہ ہے کہ نل کی مقدس سرزمین پر قدیم اہرام کے مہاراج دیوتا، خوفناک دیوتا سے آخری یدہ کے لئے کشت کاٹ رہے ہیں، اس کے بعد وہ ناگ جاتی کے بھی دیوتا ہو جائیں گے، اس کے لئے مہا دیوتا نے شرط رکھی کہ خوف مہاراج اپنی ساری شکتی کسی مجسمے میں رکھ کر پھر جاں کریں اور یدہ لڑیں، خوف مہاراج نے اپنی ہکتیاں اپنے مجسمے میں قید کر کے سوات کی ایک کالی گھپا میں رکھ دیا، وہاں کسی منش کا گزر نہیں ہوتا مگر جانے کسے ایک عام سامنش وہاں پہنچ بھی گیا اور مجسمہ بھی اٹھا لایا جس کی وجہ سے خوف مہاراج کا جاں ادھور رہنے کا خطرہ ہے۔۔۔ پورن ماٹی کی رات سے پہلے پہلے اس مجسمے کو اس کے گھر سے اٹھا کے لانا ہے مگر اس منش کے گھر کے چاروں اوڑ کوئی منڈپ ہے، ساٹکا کی ہکتیاں مجسمہ ہو گئیں، اس لئے ہمیں بلایا ہے“

اس دوران کنڈولی کی آنکھیں کسی سرچ لائٹ کی طرح اس کے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔

”دیکھ لیا ہے، کندولی نے اس کی جہنم کندلی میں جھانک لیا ہے مہاراج، روشنی اس کے ساتھ ہے، روشنی اس کے گھر میں ہے، اسے خود بھی نہیں معلوم مگر روشنی اس کے ساتھ ساتھ ہے، مجھے کوئی اپائے کرنا پڑے گا، چنانہ کریں مہاراج، اب کندولی اپنا وار کرے گی“

کندولی نے وانت کچکچائے۔

”یہاں کیوں شکلیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ کسی منش کو ہی قابو کرنا پڑے گا“

کندولی کریمہ ہنسی ہنسی کر بولی اور شاریکا نے بھی فلک بوس قہقہہ لگا کر ساتھ دیا۔

☆ ☆ ☆

صبح سویرے پیش آنے والا واقعہ نوروز خان کے ذہن سے چپک گیا تھا، گھر آنے کے بعد بھی وہ گم مگم تھا۔ گل بانو نے اسے کافی ٹولا مگر وہ ماں کو ٹال گیا، ابھی تو اسے خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا، ہر طرف ابہام کی گہری دھند تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ معاملات کا تعلق اس پر اسرار مجسمے سے ہے، جب سے یہ مجسمہ وہ گھر لے کر آیا تھا، اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اکیلا نہیں تھا، کچھ ان دیکھی چیزیں، کوئی عجیب سی مخلوق اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے، ایک نایاب نوس کی بدبو بھی گھر سے باہر جاتے ہی اسے محسوس ہونے لگتی تھی مگر اس بدبو کا منبع اسے معلوم نہیں تھا، لیکن اطمینان اس بات کا تھا کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، اس کے علاوہ گھر کے باہر ہی یہ سب کچھ تھا۔

گھر سے باہر آ کر اس کا رخ اپنے ماموں منگل خان کے گھر کی طرف ہو گیا، اس کے ایک ہی ماموں تھے، منگل خان نے اسے بچپن سے ہی باپ کا پیار دیا تھا، اس وجہ سے اس کا ماموں کے گھر دل لگتا تھا۔ کئی دن سے وہ اس طرف چکر نہیں لگا سکا تھا، آج فراغت تھی تو اس نے سوچا کہ اس طرف ہو آئے۔ اس کے ماموں کے دو ہی بچے تھے، گل گھٹی اس کی ہی ہم عمر تھی اور اس سے چھوٹا زرغام خان دس سال کا تھا، ماموں کے گھر خاموشی کا راج تھا۔

”گھالے، کہاں ہیں بھئی سب“

نوروز خان نے اندر جا کر آواز لگائی۔

تھوڑی دیر بعد باورچی خانے سے گل گھٹی نمودار ہوئی، اس کے دونوں ہاتھ آنے سے بھرے تھے۔

”لگتا ہے روٹیاں بنانے کی تیاری ہے، ماموں

ممائی، زرغام، کہاں ہیں سب“

نوروز خان نے گل گھٹی سے پوچھا۔

گل گھٹی حسن کا شاہکار تھی۔ سرخ و سفید رنگت، شہر رنگ زلفیں، شریقی آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ، چکدار بدن اور کم سنی کی معصومی اس حسن کو دوا آتش کر دیتے تھے۔ نوروز خان کو وہ ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی، اب وہ صرف اس کے لئے ماموں کے گھر آتا تھا، ایک خاموش بندھن تھا جس کے بارے میں سب جانتے تھے مگر چپ تھے۔

”امی پڑوس میں ہیں، زرغام کو کھیل سے فرصت نہیں اور بابا ابھی وکان سے نہیں آیا، تم بیٹھو، ویسے عید تو بڑا دور ہے ابھی تم کدھر سے آگیا۔۔۔ ہم قہودہ بنا رہے ہیں ابھی اسلئے“

گل گھٹی نے ہنستے ہوئے اسے چھینرا۔

”وہ اصل میں تمہیں تو پتہ ہے گھالے، آج کل سیزن ہے نا، آج ذرا فرصت تھی تو سوچا چل آؤں“

نوروز خان محسن میں چار پائی پر بیٹھ گیا اور گل گھٹی باورچی خانے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ قہودے کا پیالہ لئے ہوئے آگئی اور اسے تمباکو پیاس ہی پرزے تخت پر بیٹھ گئی۔

”بڑی تیز سر دیا ہے تمہاری، ایک منٹ میں قہودہ بنا دیا“

نوروز خان نے گل گھٹی کو چھینرا مگر خلاف توقع اس نے جواب نہ دیا۔

اس نے قہودہ کا پیالہ منہ سے لگا پیا چاہا مگر بے اختیار اسے واپس رکھ دیا، اسے زور سے ابکاٹی آئی۔ وہی بدبو پیالے سے آئی جو کئی دن سے وہ اپنے تعاقب میں محسوس کر رہا تھا۔

”یہ کیا ہے گھالے، لگتا ہے کوئی چھپکلی گرہنی ہے قہودے میں“

اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

”قہودہ پو نوروز خان، فالٹو باتیں مت کرو“

گل گھٹی نے پیالہ اٹھا کر سخت لہجے میں کہا تو نوروز خان نے چونک کر اسے دیکھا، یہ انداز گھالے کا نہیں تھا۔ واقعی گل گھٹی کی آنکھیں بے ہوش تھیں، البتہ چہرے پر وحشت کے آثار تھے۔

”گھالے کیا ہو گیا ہے تمہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

نوروز خان نے استفسار کیا، اسے وال میں کالا نظر آ رہا تھا۔

”نوروز خان قہودہ پیو۔۔۔ پینا پڑے گا تمہیں“

گھٹی نے تخت پر پڑی چھری اٹھائی اور نوروز خان کی طرف دوڑی۔

نوروز بوکھلا کر چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا، گل گھٹی اس کے پاس آ کر اس کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگی مگر وہ اس کے قریب نہیں آ رہی تھی، اس کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر غیض و غضب طاری تھا۔ بال ہوا میں لہرا رہے تھے، یہ گل گھٹی نہیں تھی، کوئی اور تھا اس کے روپ میں، نوروز خان نے لپک کر گل گھٹی کا چھری والا ہاتھ پکڑنا چاہا تا کہ چھری تو اس سے چھین لے، جیسے ہی اس نے گل گھٹی کو چھوا، گل گھٹی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اسے زور وار جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی، نوروز خان بروقت اسے نہ تمام لیتا تو اسے خاصی چوٹ لگنی تھی۔ اس نے اسے چار پائی پر لٹایا ہی تھا کہ اس کی ممانی اندر داخل ہوئی۔

”کیا ہوا میری بچی کو، گھلا لے، گھلا لے“

وہ چار پائی کی طرف دوڑی۔

”مامی شاید چکر آ گئے ہیں“

نوروز خان نے بات بنائی۔

گل گھٹی کو کافی دیر بعد ہوش آیا، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے، بس اسے قبوہ بنانے کے لئے باورچی خانے جانا یاد تھا۔

کوئی طاقت تھی جو نوروز خان کے پیچھے تھی، مگر جانے کیوں وہ نوروز خان کے پاس آنے سے کترائی تھی!! وہ سوچوں میں گم ماموں کے گھر سے نکل آیا، سڑک کے کنارے وہ گم صم چلا جا رہا تھا۔

”تو نہیں مانتا میری بات، چوٹ کھا کر مانے گا“

کسی نے نوروز کی کمریزور دار لٹ ماری، وہ تھلا کر مڑا تو اسی مجذوب کو طیش کے عالم میں گھورتا پایا۔

”تجھے مہمسن گھیریوں میں پڑنے کا شوق ہے نا مگر تو سہا نہیں سکے گا اس کا وزن، جا چلا جا خانقاہ کی اوٹ میں، اس دن تڑکے تڑکے بھی کہا تھا تجھے مگر تیرے بھیجے میں نہیں سنائی میری بات، اب سسرالی آگئے تو منہ پھاڑ کھڑا ہے“

مجذوب سخت غصے میں تھا۔

”بابا، معاف کرو، میں بے بے کو بتا کر ابھی جاتا ہوں“

نوروز منمنایا۔

”ماں کی گٹر نہ کر، تو جاس، اب کے اب جا، وقت برباد نہ کر بنچے“

مجذوب کچھ دھیمے پڑا۔

پندرہ منٹ بعد وہ درگاہ میں بابا چراغ شاہ کے حجرے میں مودب بیٹھا تھا۔ حجرے کی نور بھری فضا نے نوروز کو بے خوف کروا دیا تھا۔

”تین ہزار سال قبل مسیح مصر میں ایک فرعون گزرا جس کا نام خوف تھا، اس نے اہرام کی تعمیر میں بھی حصہ لیا، اسے طاقت حاصل کرنے کا بہت جنون تھا، پورے مصر سے جاوے اس کے دربار میں جمع رہتے تھے، اس نے ان کے سامنے ابدی حیات کا سوال رکھا، جاوے گروں نے برسوں کی تپنیا کے بعد اسے بتایا کہ اگر وہ اپنی تمام طاقتیں ایک خاص شکل کے مجسمے میں بند کر کے مجسمے کو چھپا دے تو جب تک مجسمے تک انسانی رسائی نہیں ہوتی وہ پہلی کے چاند سے لے کر پورے چاند کی رات تک زندہ رہ سکے گا، اگلے پندرہ دن اس کو واپس لاش میں جا کر گزارنے ہوں گے، اگر کبھی اس کا مجسمہ غار سے باہر آگیا تو پورن ماشی کی رات سے پہلے وہ واپس اسی غار میں پھپھانا ضروری ہے ورنہ اسے اس دنیا سے جانا پڑے گا، مگر اس نے ناگ ویوٹا کو شکست دے دی تب وہ اس مجسمے والی شرط سے بھی آزاد ہو کر دائمی حیات پا لے گا۔ خوف مر گیا، اس کی لاش اس کے محل میں رکھ دی گئی اور اس کے گرد کالے جادو اور پلید شکتیوں، آتماؤں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ اب جب کہ وہ ناگ ویوٹا سے لڑنے کی تیاری میں مصروف تھا، تم غار سے اس کا مجسمہ نکال لائے۔۔۔۔۔ پورن ماشی کی رات میں ایک ہفتہ رہتا ہے، اس سے پہلے پہلے تمہاری زندگی خطرے میں ہے، اس کی شکلیاں مجسمہ حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر تمہارے منظر اور تمہارے گھر میں تمہاری والدہ نے معوذتین لکھ کر رکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ اکثر تم وضو سے ہوتے ہو، اسی وجہ سے وہ تمہارے گھر میں داخل نہیں ہو پارے مگر تم احتیاط کرنا، کالی کا پجاری شادریکا تمہارے پیچھے ہے، ہم نے درگاہ کا ایک خادم تمہاری حفاظت اور شادریکا کو نا کام کرنے کے لئے روانہ کر دیا ہے۔۔۔۔۔ ہم روشنی کے ساتھ ہیں اور ظلمت کے دشمن ہیں، اس وجہ سے تمہیں بچانا چاہیے ہیں، آج اگر تم وہ قبوہ پی لیتے تو تمہارے اندر نا پا کی چلی جاتی، شکلیاں تم پر براہ راست قابض ہو جاتیں، ماںہوں نے گل گھٹی کا وماغ قابو کر کے یہ سب کروانا چاہا“

بابا چراغ شاہ نے اسے تفصیل سے بتایا اور نوروز کو وہ

عجیب و غریب مجذوب یاد آگیا۔

خوبصورت ہے بیٹی، اچھا اب میں چلتی ہوں۔

بڑھیا ایک دم سے کمرے سے برآمد ہوئی۔

”بے بے چائے تو بیٹو، ناشتہ بھی بناتی ہوں“

گل بانو حیران کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”بس میں چلتی ہوں“

بڑھیا نے تیزی سے بیرونی دروازے کا رخ کیا، اس کی چال میں پھرتی عود کرائی تھی۔ اچانک گل بانو کو شک ہوا کہ بڑھیا کا ایک ہاتھ چادر کے اندر ہے، کچھ چھپایا ہوا لگ رہا تھا۔

”گھبرو، بات سنو“

گل بانو اس کی پیچھے دوڑی، مگر اس وقت تک بڑھیا دروازہ کھول چکی تھی، ایک بار وہ گھر سے نکل گئی تو ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا دروازہ عبور کر گئی۔ گل بانو پہاڑی پر بنی پگڈنڈی پر آئی تو بڑھیا اطمینان سے ہرک پار کر رہی تھی، اب اس نے چادر سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا تھا، اس کے ہاتھ میں وہی مجسمہ تھا جو کئی دن سے بڑے کمرے کی سائینڈ میل پر رکھا تھا۔ گل بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے شک وہ اس مجسمے سے چڑکھاتی تھی مگر نوروز کے لئے وہ اہم تھا، اب جانے نوروز کس رد عمل کا مظاہرہ کرے!!

اچانک زور سے گھٹنگر دھکے۔

”تارے ٹوٹیں گے، آگ برے گی، خلقت ترے گی۔۔۔“

سامنے ایک مجذوب اپنا گھٹنگر دولا موصول تھا، کھڑا کینہ تو زلفروں سے بڑھیا کو گھور رہا تھا۔۔۔!!!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”اے بڑھیا، پیٹ کی پاپی، کہاں چلی، مال دیتی جا، ایسے کون جانے دیتا ہے تجھے کالی کی راسی“

مجذوب دھاڑا اور حسب عادت دائرے میں گھومنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ موسل زمین پر زور سے مار دیتا جس سے فضا گھٹنگر دس کے ارتعاش سے کھنک اٹھتی، گل بانو بھی وہاں پہنچ کر خاموشی سے سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔

”میرا ستہ چھوڑ پاگل بدھے، مجھے جانتا نہیں تو، کالی ماما کی چھایا ہے میرے سر پر“

بڑھیا نے مجذوب کو ڈرایا۔

گل بانو نوروز کی حالت پر بہت پریشان تھی، کچھ تھا جو اندر ہی اندر چل رہا تھا مگر اس کا بیٹا اس۔۔۔ چھپا رہا تھا اور یہ سب کچھ اس مجسمے کے آنے سے ہوا تھا، اس کے بعد سے نوروز پریشان تھا۔ گل بانو صوم و صلوات کی پابند عورت تھی، شوہر کے فوت ہونے کے بعد اس نے اپنے کردار کی وجہ سے عزت پائی، تہجد گزاری اسے اپنی ماں سے دراشت میں ملی تھی، یہی وصف اس نے نوروز میں پیدا کرنا چاہا تھا۔ نوروز باہر گیا ہوا تھا، گل بانو نے جلدی جلدی گھر کی صفائی مکمل کی اور برتن دھونے لگی، برتنوں سے فارغ ہو کر اس نے شام کے لئے سبزی بنانا شروع کر دی، اچانک دروازہ بجا۔

”کون آگیا اس وقت“

گل بانو بڑبڑائی۔

”انتظار، ابھی آتی ہوں“

گل بانو نے آواز لگائی۔ دروازے میں بنی جھری سے دیکھنے پر اسے ایک پورھی عورت نظر آئی جس کے چہرے پر تھکن اور بے چارگی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا، اس نے بہت سخت زندگی گزاری تھی، اسے بھوک اور تھکن کی زبان کی پہچان تھی۔

”بے بے اندر آ جاؤ“

گل بانو نے بڑھیا کو راستہ دیا۔

بڑھیا کافی ضعیف تھی، اس نے ایک پھٹی پرانی جیکٹ اور اس پر ایک سالنور وہی شال لپیٹ رکھی تھی، لائٹ کا سہارا لئے وہ مشکل سے برآمدے تک آئی اور وہیں چار پائی پر ڈھکے گئی۔

”بیٹا، مجھے چائے پلا دو، بہت سردی لگ رہی ہے“

بڑھیا نے کپکپاتے لہجے میں کہا، اس کا جسم لرز رہا تھا۔

”بے بے ابھی لاتی ہوں“

باورچی خانے میں چائے کی دپٹی میں ایک پیالہ چائے پکی پڑی تھی، چولہا ابھی گرم ہی تھا، گل بانو نے چائے کو بالادیا اور پیالے میں لئے باہر آگئی۔ مگر بڑھیا وہاں نہیں تھی۔ گل بانو حیران رہ گئی۔

”بے بے کہاں گئی“

اس نے خود کھائی کی۔

”میں ذرا اندر سے گھر کو دیکھ رہی تھی، ماشاء اللہ“

”خیری کالی ماتا کی تو۔۔۔۔۔“

مجنوب نے گرج کر موسل کو ہرایا، بڑھیا ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹی اور مجنوب کے منہ سے ایک ٹلک شگاف قہقہہ نکلا۔
”بس اتنا ہی برتا تھا، اچھا چل نکلا لے جس کو نکلتا ہے، تیرا میرا جوڑ نہیں، ہو جانے دے آج نہ۔۔۔ یاد رکھ یہ دھ کے بغیر تو یہ مجسمہ یہاں سے نہیں جاسکتا، مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے ہمالیہ سے نیل تک ڈھنڈیا پڑی ہے، تو تو چھوٹی چیلی ہے، تیرا کام اتنا ہی تھا جتنا تم نے کر دکھایا چل بلا لے سب کو“

مجنوب کی باتوں پر بڑھیا پریشان ہو گئی۔

”لا دے دے مجھے، گدڑی میں لعل چھپائے جا رہی ہے مائی، ادھر دے مجھے“
مجنوب نے ڈپٹ کر کہا۔

اچانک ایک زوردار چھٹا کا ہوا، ہر طرف دھواں پھیل گیا، دھواں چھٹا تو شاریکا اپنی پوری آن بان کے ساتھ داہنے ہاتھ میں بلم لئے وہاں کھڑا تھا، گل بانو ڈر کر دروازے کے اندر چلی گئی۔ ہر طرف دیرانی چھائی تھی، اس تنہا راستے پر مجنوب اور شاریکا آسنے سامنے تھے۔

”وای کو کیوں دھمکاتا ہے شمس الدین، تیرا جوڑ ہم ہیں، آ جا تیرا ٹینو دا باتا ہوں، بہت رستہ کھوٹا کر لیا تم نے ہمارا مورکھ“

شاریکا نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

”بابا۔۔۔۔“

مجنوب کے منہ سے بلند آہنگ قہقہہ نکلا۔

”لے جا، لے جا شاریکا۔۔۔۔“

رام چھوڑی اجودھیا، من بھادے سولے

اب یہ میرے کام کا نہیں، میرے کام کے تو تم ہو تمہاری ضرورت تھی ہمیں تو۔۔۔ تم آگئے تو اب واپس کون جانے دیتا ہے تمہیں“

مجنوب نے موسل کو زمین پر مار کر دائرے میں گھومنا شروع کر دیا۔

”زیادہ چھٹی نہ دکھا شمس الدین، یہ ناچنا کوونا بند کر۔۔۔ سامنا کر میرا، تجھے اندازہ نہیں کہ کتنی بلوان شکلتیاں میرے ساتھ ہیں اس سے۔۔۔ میرے چرنوں میں لوٹے گا تو تھوڑی دیر بعد“

شاریکا نے بڑبڑائی۔

”بھول گئے شاریکا، بھول گئے ہماری پھیلی ملاقات۔۔۔۔۔ کیسے بھاگے تھے دم دبا کر اور شکلیوں کی بھی خوب کہی۔۔۔ ہم محض دھو بھی کر لیں تو اندھیرے کی سب شکلتیاں، تمہارے سارے جاپ بارمان لیتے ہیں، قرآن مجید کا ایک حرف لکھ کر پلو سے باندھ لیں تو تیرے سارے دیوتا دیوتوں سے ٹکریں مارتے ہیں۔۔۔ پھر بھی تو اکڑتا ہے پاگل“

شمس الدین نے شاریکا کو گھورا۔

”سے سے کی بات ہے اپرا دھی۔۔۔۔۔ بھگوان کی سوگند، تجھے وہ شراب دوں گا کہ تجھے چرن چھونے کے علاوہ کوئی ایسے نظر نہیں آئے گا، تیرے لئے شہد بھی ہے کہ تو میرا رستہ کھوٹا مت کر۔۔۔۔۔ مجھے دے مہاراج خونو کا شریر کالی کی وای“

شاریکا نے بڑھیا کو ٹھکرا۔

بڑھیا نے مجسمہ شاریکا کو دینا چاہا مگر اس سے پہلے ہی مجنوب شمس الدین نے موسل کو زور سے زمین پر مارا، تیز ہوا کا گولا اٹھا اور جسے کو لپیٹ میں لے کر گھماتا ہوا مجنوب کے پاس لا پھینکا، شمس الدین نے مجسمہ اٹھایا اور زور سے بابا چراغ شاہ کی درگاہ کی طرف پھینکا، درگاہ آدھا گلو۔ شرور تھی مگر مجسمہ میزائل کی طرح ہلک جھپکتے درگاہ کے رخ غائب ہو گیا، یہ سب ہلک جھپکتے ہو گیا، شاریکا جیسے نیند سے بیدار ہوا۔

”یہ گھور پاپ کیا ہے تم نے شمس الدین، پہلے میں تمہیں نادان بالک سمجھ کر معاف کئے جا رہا تھا مگر تمہارا کچھ کرنا پڑے گا تم نے دیوتاؤں کے سیوک سے ٹکری ہے“

شاریکا کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اس نے مجنوب کی طرف انگلیاں جھنکیں، آگ کی لپٹیں شمس الدین کی طرف لپٹیں۔ شمس الدین نے دائرے میں خود کو گھمایا اور اس کی گدڑی سے تیز ہوا کے گولے نکلے جنہوں نے شعلوں کو ایک پل میں بجھا دیا۔

”تو فریب کر لے، مگر کر لے، میں دار میں کرتا بلکہ صرف جواب دوں گا، جب تیرے شعبدے ختم ہو جائیں تو پھر بات ہوگی تجھ سے، مجسمہ تو گھیا بہت دور اب تو مجھ سے ملاقات کر شاریکا“

شمس الدین نے منکوں کی لڑیاں بجا کر شاریکا کو جڑایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



